محمد حسین آزاد — احوال و آثار

از

ڈاکٹر محمد صادق

مجلس ترقی ادب

کلب روڈ ○ لاہور

محمد حسین آزاد ـــ احوال و آثار

محمّد حسین آزاد – احوال و آثار

از

ڈاکٹر محمّد صادق

مجلسِ ترقّیِ ادب

کلب روڈ، لاہور

طبع اول : نومبر ۱۹۷۶ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی ،
ناظم مجلس ترقی ادب ، لاہور

مطبع : سویرا آرٹ پریس ، ۱۵ - سرکلر روڈ لاہور

طابع : مشتاق احمد چودھری

قیمت : ۲۴ روپے

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

کے نام

جنھوں نے آردو تنقید و تحقیق میں
ایک نئے باب کا اضافہ کیا

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

مصنف

نام :

ڈاکٹر محمد صادق ، ایم ۔ اے ، پی ایچ ۔ ڈی ،
سابق صدر شعبہ ہائے انگریزی و اردو
گورنمنٹ کالج ، لاہور

تصانیف :

۱۔ A History of Urdu Literature
(Oxford University Press London)

۲۔ Twentieth Century Urdu Literature
(Padma Publications, Bombay)

۳۔ آبِ حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین ۔

۴۔ نیرنگِ خیال ، از محمد حسین آزاد (ترتیب) ۔

فہرست

دسواں باب

گیارھواں باب

ضمیمے

پیش لفظ

اس کتاب کی تصنیف محض اتفاقیہ ہوئی - ۱۹۳۹ع میں جب اٹھارویں صدی میں انگریزی ادب کی ایک غیر معروف سی تحریک پر ہم اپنا مقالہ تیار کرنا چاہتے تھے، ہمیں معلوم ہوا کہ اس کی تیاری کے لیے متعلقہ تصانیف ہمارے ملک میں نایاب ہیں - یہ انگلستان میں دستیاب تھیں لیکن چونکہ وہ صرف ایک ہی بار شایع ہوئی تھیں اور انھیں نوادر میں شمار کیا جاتا تھا لہذا ان کتابوں تک رسائی ہماری استطاعت سے باہر تھی - اسی شش و پنج میں ہمارے ایک کرم فرما نے مشورہ دیا کہ انگریزی ادب پر لکھنے والے انگریزوں کی کوئی کمی نہیں اور اس میدان میں ان کا مقابلہ بھی مشکل ہے، اس کے برعکس اردو ادب میں تحقیق و تنقید کے وسیع امکانات ہیں، ہمیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے - چنانچہ بہت غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ جدید اردو مصنّفین میں محمد حسین آزاد ایک ایسے مصنّف ہیں جن پر کوئی مستند تصنیف نہیں ملتی، لہٰذا انھی پر لکھنا چاہیے - ایک سال کی مسلسل کاوش کے بعد یہ مقالہ تیار ہوا جسے بہت سی ترمیمات اور اہم اضافوں کے بعد انگریزی سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے -

ایک مغربی مفکّر کا قول ہے کہ کسی شخص کو تصنیف کا اس وقت تک حق نہیں پہنچتا جب تک اس تصنیف میں ایسا مواد یا اطلاعات بہم نہ پہنچائی جائیں، جن کا اس وقت تک کسی کو علم نہ ہو - اس نقطۂ نظر سے اس کتاب کے جواز میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے - جس وقت اس تصنیف کا آغاز ہوا، اس وقت آزاد کے متعلق تحقیق و تنقید کا سرمایہ نہ ہونے کے برابر تھا - انگریزی میں صرف سر عبدالقادر کا لکچر تھا جب کہ اردو میں سوائے ان تین مضامین کے، جو آزاد کی وفات پر 'مخزن'، 'نگار' اور 'ادیب' میں شایع ہوئے؛ یا ان کوائف کے جو "خمخانۂ جاوید" میں درج ہیں یا فلسفۂ الٰہیات کی تمہید میں دیے گئے ہیں، اور کوئی مواد نہ تھا - آزاد کی اپنی تصانیف ("مکاتیب آزاد"، "سیر ایران"،

"آبِ حیات" اور "دربارِ اکبری") میں چند منتشر اشارات اور بیانات کے سوا کچھ نہ تھا۔

علاوہ بریں اس ضمن میں خاندانی اور عام روایات کا پشتارہ بھی ہے۔ اس کا بہ نظرِ تحقیق مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے اکثر مبالغہ آمیز ہیں، چند ایک بے بنیاد ہیں اور تقریباً سب میں تصویر کا صرف روشن پہلو پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ کوئی باعثِ حیرت بھی نہیں، کیونکہ آزاد، خصوصاً اُن کے والد مولوی محمد باقر کا ایک ایسے دور سے تعلق تھا جب ہیجان انگیز افواہوں کی خوب گرم بازاری تھی۔ یہ مسلّمہ امر ہے کہ پُر آشوب انقلابی ادوار میں متخیّلہ کو زبردست تحریک ہوتی ہے۔ افواہیں انسانی اذہان کا سبزۂ خود رو ہوتی ہیں اور یہ سبزۂ خود رو بڑھتے بڑھتے آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ علاوہ ازیں، جیسا کہ آگے بتایا جائے گا، آزاد اپنے ذاتی یا خاندانی حالات بیان کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیتے اور بعض اوقات واقعات سے ان کی توثیق بھی نہیں ہوتی، لہٰذا ہم نے خاندانی روایات اور آزاد کے بیانات پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور حقائق کو روایات سے الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان سب مآخذ سے کہیں زیادہ دلچسپ اور کارآمد وہ نادر دستاویزات، فتووں کی نقول اور پرانے اخبارات اور مسودات ہیں جو ہمیں غیر متوقع طور پر دستیاب ہوئے۔ ان سب کا اپنی اپنی جگہ ذکر آئے گا، یہاں ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اس سلسلے میں ایک لحاظ سے مولوی خلیل الرحمٰن سرفہرست ہیں۔ انھوں نے میری درخواست پر ایک طویل عنایت نامے میں، جو بارہ چودہ صفحات پر مشتمل ہے، آزاد کی زندگی کی بہت سی گتھیاں سلجھائی ہیں اور مقامِ تشکّر ہے کہ یہ قیمتی اطلاعات ہمیں بروقت مل گئیں، کیونکہ اس کے فوراً بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اگر اطلاعات کا یہ بیش بہا خزانہ ہمیں بروقت نہ ملتا تو وہ ہمیشہ کے لیے ان کے ساتھ مدفون ہو جاتا۔

چھوٹے چھوٹے کئی ایک نکات کے علاوہ، جن سے آزاد کی زندگی، کردار اور دیگر متعلقہ امور پر روشنی پڑتی ہے، خالص تحقیق کے لحاظ سے اس کتاب کی چند دیگر قابلِ غور خصوصیات حسبِ ذیل ہیں:

(۱) آزاد کے والد، مولوی محمد باقر کے سوانحِ حیات، کردار اور

شیعہ سوسائٹی میں ان کا مقام ۔

(۲) آزاد کا سفرِ ایران ، اس کی غرض و غایت ۔

(۳) ۱۸۷۴ع کا مشاعرہ ، اس کا مقصد ، اس میں آزاد کا کردار اور معاصرانہ تنقید ۔

(۴) ''آبِ حیات'' ، ''نیرنگِ خیال'' اور ''سخن دان فارس'' کے مآخذ کی نشان دہی اور ''تدوینِ دیوان ذوق'' میں آزاد کے طرزِ عمل کے متعلق دستاویزی شہادت ۔

تنقیدی لحاظ سے ہمارا اہم ترین کام آزاد کے رنگِ طبیعت اور شخصیت کا نفسیاتی جائزہ اور ان کے مواد اور اسلوب پر اس کا اثر ہے ۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے ، یہ اطلاعات تمام تر پہلی دفعہ فراہم کی جا رہی ہیں ۔

اگرچہ ہم نے اس تمام مواد کے تفحّص میں بہت احتیاط سے کام لے کر آزاد کی سوانحِ حیات مرتب کی ہے ۔ لیکن ہم یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ آزاد کی سوانحِ حیات کی ترتیب ہمارا فرضِ اولین نہیں ۔ ہمارا مقصد ، جہاں تک ممکن ہو ، ان کوائف کو منظرِ عام پر لانا ہے جن سے ہمیں ان کی ذہنیت اور ان کی علمی اور ادبی خدمات کو سمجھنے میں مدد ملے ۔ لہٰذا ہم نے ان تمام لطائف و حکایات کو جن کا آزاد کی ذہنیت سے براہِ راست تعلق نہیں نظر انداز کر دیا ہے ۔ البتہ یہاں ان کے آخری ایام کا مرقع ایک استثنائی حیثیت رکھتا ہے ۔

اس تمام تگ و دو کے بعد جو ہم نے آزاد کے سوانحِ حیات حاصل کرنے میں کی ، یہ بیان متناقض معلوم ہوگا کہ آزاد کو حقیقی معنوں میں جاننے کے لیے ان کی رودادِ حیات کی چنداں ضرورت نہیں ۔ لیکن یہ بیان سراسر حقیقت پر مبنی ہے ، اس لیے کہ حقیقی آزاد ہمیں ان کی تحریروں میں جیتے جاگتے ، چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ۔ بعض ادیب فطرةً خاموش ہوتے ہیں اور ان کا پرتو ان کی تصانیف میں نہیں ملتا ۔ برعکس اس کے آزاد ایک شفّاف اور روشن دنیا میں گزر بسر کرتے ہیں ۔ ان کی تصانیف میں ان کا ہر تیور ، ہر حرکت ، ہر انداز ایک آئینے کی طرح ہمارے سامنے آ جاتا ہے ۔ بلا مبالغہ آزاد کی زندگی میں جو باتیں اہمیت رکھتی ہیں ، ان کی تصانیف ان کا برجستہ اشاریہ ہیں ۔ کشفِ ذات جو رومانی مصنّفین کی

ایک اہم خصوصیت ہے - ان میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور وہ ہمیشہ اپنے متعلق نہایت پتے کی باتیں بتاتے رہتے ہیں - چونکہ یہ انکشافات سراسر غیر شعوری ہیں ، اس لیے ان کی طبیعت کی بھرپور غمازی کرتے ہیں - یہ ایک طرح کی خود کلامی ہیں اور ان سے آن کے اندازِ طبیعت کا پورا پورا انکشاف ہوتا ہے -

تنقید کا مقصد کیا ہے ؟ ایک فن کار کے دل و دماغ ، اس کی شخصیت اور ذہن کی توضیح و تشریح - اس کے لیے ایک طرح کی ہمدردی ضروری ہے - ہو سکتا ہے کہ ہمیں کسی مصنّف کے خیالات و نظریات سے اتفاق نہ ہو - لیکن اگر ہم اس کے نقطۂ نظر یا پیغام کی صداقت یا حسن کو محسوس کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کا پوری طرح مزاج شناس بننا پڑے گا - اور اگر دلی ہم آہنگی نہیں تو کم از کم ذہنی ہم آہنگی ضرور پیدا کرنی ہوگی - ایک نقّاد کا ایک مصنّف سے وہی رشتہ ہے جو ہارون[۴] کو حضرت موسیٰ[۴] سے تھا - وہ مصنّف کی پوری پوری نباضی کرتا ہے اور پھر تفہیم کی غرض سے اس کی اس طرح توضیح کرتا ہے کہ قاری کی اس کے ذہن تک رسائی ہو جائے - درحقیقت تنقید اُس بصیرت کا نام ہے جو اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی دیدہ ور انسان کا ذہن کسی تخلیق سے دوچار ہوتا ہے ، خواہ وہ کوئی ادبی شاہ کار ہو یا مجسمہ یا تصویر - ہم نے آزاد کی تصانیف کو ہمدردانہ نظر سے دیکھا ہے اور اس کے نتیجے میں ان کی تصانیف کے چند ایسے پہلو بے نقاب کیے ہیں جن تک ہماری دانست میں آج تک کسی نقّاد کی رسائی نہیں ہوئی - ادب و فن کی ماہیت سمجھنے کے لیے قوت مشاہدہ کے علاوہ ، جو ظاہر سے گزر کر باطن میں سرایت کر جاتی ہے ، اور چیزیں بھی درکار ہیں ، مثلاً تبحر علمی ، جس سے نظر میں وسعت پیدا ہو - نقّاد کو لازم ہے کہ وہ اپنے دائرۂ معلومات کو زیادہ سے زیادہ وسیع بنائے اور اس سرمایۂ نظر و فکر سے استفادہ کرے جو اس کے گرد و پیش کی دنیا میں پھیلا ہوا ہے - اسی وسیع النظری کا فقدان ایک حد تک ، اوسط درجے کے شعرا و ادبا کی مبالغہ آمیز تحسین کا باعث ہوتا ہے - با ایں ہمہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ناقد کی ادیب سے ہم آہنگی تنقید کی شرطِ اولیں ہے -

آخر میں برسبیل تذکرہ ہمیں اس امر کا اظہار بھی کرنا ہے کہ ہماری اس تصنیف اور اُن مضامین سے جو ہم نے گاہ بہ گاہ آزاد پر تحریر کیے اور جو اب "آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین" کی شکل میں شایع ہو چکے ہیں ، دوسرے

لکھنے والوں نے بہ کثرت استفادہ کیا ہے اور بعض اوقات قریباً قریباً پورے کے پورے ابواب ہی نقل کر دیے ہیں - ہماری مُراد ڈاکٹر اسلم فرّخی سے ہے جن کی ضخیم تصنیف "محمد حسین آزاد" اردو تحقیق میں ایک کارآمد اضافہ ہے - علم اور معلومات کی اشاعت ایک قابلِ تعریف کام ہے اور اس میں بخل سے کام لینا تنگ نظری کے مترادف ہے - لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ رسمی آداب سے کام لیا جائے اور مستعار معلومات کا اعتراف کیا جائے - ڈاکٹر صاحب نے اس پر پوری طرح عمل نہیں کیا - انھوں نے ایسی اطلاعات کا جن کا علم یا مواد ہمارے سوا اور کسی کو نہیں ، استفادے کا اعتراف کیا ہے - لیکن بیسیوں ایسی اطلاعات کا جو ہم نے ایسی تصانیف سے انتخاب کی ہیں جو دستیاب ہیں ، ہمارا حوالہ دیے بغیر اصل تصنیف کا حوالہ دے دیا ہے - غالباً اس سے وہ ممنونیت کی اس گراں باری سے ، جو ان پر عائد ہوتی ہے ، کسی حد تک سبک دوش ہونا چاہتے ہیں -

نیز انھوں نے بارہا ہمارے مضامین یا خیالات یا آرا کو اپنی زبان میں ادا کر دیا ہے - مثال کے طور پر "تذکرۂ سنین اسلام" پر ہمارے اور ان کے تبصرے کا مقابلہ کیجیے - راقم کا تبصرہ درج ذیل ہے :

"سنینِ اسلام کے متعلق دو باتیں بڑی حد تک قطعی ہیں - اس میں آزاد کے پختہ طرزِ تحریر کی جھلک نظر آتی ہے - اس کی انشا پردازی اعلیٰ سطح پر ہے اور کتنی ہی عبارتیں ہیں جو صرف آزاد ہی کے قلم سے نکل سکتی ہیں - اس کے برعکس تاریخ یورپ سے گہری واقفیت ایسی بات ہے جسے بے لاگ قاری آزاد سے منسوب کرنے میں تامل کریں گے - اس سے بھی زیادہ یہ کہ یہ پیش کش کلیۃً معروضی ہے - مواد کو بڑی احتیاط سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس میں وہ انحراف اور سرگوشیاں قطعاً نہیں جو آزاد سے مخصوص ہیں - قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ مواد ڈاکٹر لائٹنر نے فراہم کیا اور انھی کی ہدایات کے مطابق آزاد اسے ضبطِ تحریر میں لائے -"

ڈاکٹر فرخی فرماتے ہیں :

"اگرچہ "سنین اسلام" کو تمام و کمال آزاد کی تصنیف قرار دیا گیا ہے ، لیکن اس کے بغور مطالعے سے ، اور بعض دوسرے شواہد کی

وجہ سے ، یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ اندازِ بیان آزاد کا ہے ، لیکن کتاب کا مواد ان کا مرتّب کیا ہوا نہیں ۔ ''سنین اسلام'' کا مواد نہایت محنت سے مرتّب کیا گیا ہے اور اس میں جا بجا عالمی تاریخ کے متعلق ایسے پرکار اور بلیغ اشارے ملتے ہیں جنھیں کسی صورت میں بھی آزاد سے منسوب نہیں کیا جا سکتا ۔ آزاد کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ جا بجا چھوٹے چھوٹے نوٹ لکھتے ہیں اور خود کلامی سے پڑھنے والے کو ہم نوا بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یہ خصوصیت ان کی ہر تصنیف میں نمایاں ہے ۔ لیکن ''سنین اسلام'' اس سے محروم ہے ۔ تاریخ کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ سراسر معروضی ہے ۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ ''سنین اسلام'' کا مواد لائٹنر نے مرتّب کیا اور آزاد نے اسے اپنے طرز میں لکھ کر زبان و بیان میں شوکت پیدا کر دی ۔''

آغا محمد اشرف (مرحوم) بھی اس کسب و اکتساب کے متعلق اخلاقی فرائض کے پابند نہیں ۔ آپ نے آزاد کے سفرِ ترکستان پر ہمارا مضمون پڑھا اور مسٹر اعجاز بٹالوی کے ساتھ غریب خانے پر تشریف لائے اور بہت دیر تک اس موضوع پر سوالات اور جوابات کا سلسلہ جاری رہا ۔ انھوں نے وہ سوال نامہ بھی ملاحظہ فرمایا جو آزاد کو دیا گیا تھا اور نوٹ لکھے ۔ بعد میں جب انھوں نے اپنی تصنیف "انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت" مرتّب کی تو اس امر کا اشارہ تک نہیں کیا کہ اس میدان میں ان کا ایک پیش رو بھی تھا جس نے ان سے ۲۵ سال پہلے یہ تمام کوائف تحریر کیے تھے ۔ اور آغازِ بیان میں تحریر فرمایا : "سب سے بڑی خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ مولانا آزاد کی زندگی کا یہ دور اب تک پُراسرار پردوں میں چھپا ہوا تھا اور اس کی تفصیل پر انڈیا آفس کے بستوں میں ایک سو سال سے احتیاط اور دور اندیشی کی مہریں لگی ہوئی تھیں ۔ الحمد للہ کہ مولانا آزاد کے عقیدت مندوں کے سامنے ان کی نقاب کشائی کا شرف مجھے حاصل ہو رہا ہے ۔"

اب مجھے اُن حضرات کا شکریہ ادا کرنا ہے ، جنھوں نے اس تصنیف میں میری مدد فرمائی ۔ یہاں ترتیباً سب سے پہلے آغا محمد باقر ، نبیرۂ آزاد کا نام آتا

ہے جنھوں نے میری درخواست پر اپنے خـاندان ، خصوصاً مولوی محمد بـاقر اور آزاد کی ابتدائی زندگی کی بابت چند اطلاعات بہم پہنچـائیں ، لیکن یہاں سرِ فہرست مولوی خلیل الرحمان ہیں جن کی فیاضانہ امداد کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔

آخر میں مجھے ان حضرات کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کرنـا ہے : ڈاکٹر محمد اکرام صاحب جن کے مشورے بلکہ اصرار سے مجھے اس اردو تصنیف کی ترتیب کی تحریک ہوئی ۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب ، پروفیسر محمد نذیر مہل صاحب اور احمد رضا صاحب جنھوں نے مسودے پر نظرثانی فرما کر اور پروفوں کی تصحیح کر کے میری لغزشوں اور فروگزاشتوں کی نشان دہی کی ۔

محمد صادق

لاہور - ۱۰ ستمبر ۱۹۷۲ع

پہلا باب

خاندان اور ابتدائی حالات

جب تک مسلمانوں کا برعظیم پاک و ہند میں اقتدار قائم رہا ، یہاں باہر سے علما اور کاروباری لوگوں کی آمد کا سلسلہ برابر جاری رہا - اگرچہ مغلوں کے انحطاط پر یہ عمل کچھ رک سا گیا ، پھر بھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوا - چنانچہ کئی لوگ ایران سے ترکِ وطن کرکے ہندوستان میں آباد ہوئے ، کہ یہاں ان کی خاطرخواہ قدر و منزلت ہوگی - انھی مہاجرین میں سے آزاد کے خاندان کے ایک بزرگ بنام محمد عاشورہ ، محمد شاہ کے دورِ حکومت میں واردِ کشمیر ہوئے - اور ان کی وفات پر اُن کے بیٹے ، خلیفہ محمد شکوہ ، نے شاہ عالم ثانی کے زمانے میں دہلی میں سکونت اختیار کی - کہتے ہیں اُن کے علم و فضل کی جلد ہی قدر کی گئی اور انھیں دربارِ شاہی میں وظیفہ یاب کی حیثیت سے شرفِ باریابی حاصل ہوا -

معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اونچے طبقے کے مہاجرین کی طرح آزاد کے بزرگ بھی اپنی تہذیبی روایات اور نسلی علیحدگی کو برقرار رکھنے کے خواہاں تھے - اور وہ رفتہ رفتہ اپنے نئے وطن کی فضا سے مانوس ہوئے - خلیفہ محمد شکوہ سے لے کر ان کے پوتے محمد اکبر تک خاندان ولایتی رہا - اُن کی بیویاں ایرانی النسل تھیں - خاندان کا پہلا شخص جس کی ہندوستان میں شادی ہوئی ، آزاد کے والد محمد باقر تھے ، اور ان کا رشتہ بھی ایک ایرانی خاندان میں ہوا ، جس نے ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی -

لیکن مقامی لوگوں سے یہ علیحدگی زیادہ دیر قائم نہ رہی - بے شک خاندانی زبان فارسی ہی رہی ، لیکن عوام سے اختلاط اور ضروریاتِ زندگی کی وجہ سے اُردو سے بتدریج لگاؤ بڑھتا گیا - "آب حیات" کا پہلا فقرہ اس کا ثبوت فراہم کرتا ہے -

یہ کہ "آزاد کے دادا خلیفہ محمد اکبر رُک رُک کر اُردو بولتے تھے ۔ لیکن آزاد کے والد محمد باقر تک پہنچتے پہنچتے خاندان کی زبان اُردو ہو گئی ۔"

محمد باقر کی شخصیت اپنے بزرگوں سے کہیں زیادہ وقیع تھی اور انھیں ایک واضح تاریخی اہمیت حاصل ہے ۔ انھوں نے اپنے عہد کی ادبی ، صحافتی اور سیاسی زندگی میں نمایاں کردار ادا کیا ۔ دہلی کالج میں تعلیم پائی اور معمولی سرکاری ملازمت پر مامور ہوئے ، جہاں اُنھوں نے نمایاں ترقی حاصل کی ۔ سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ نجی طور پر صحافت میں مشغول رہے ، اور کم و بیش سولہ سال کی ملازمت کے بعد مستعفی ہو کر انھوں نے اپنی تمام تر توجہات صحافت پر مرکوز کر دیں ۔

انیسویں صدی کے دوسرے رُبع کو برّصغیر میں عموماً زوال و انحطاط کا زمانہ قرار دیا جاتا ہے ۔ یہ ایک لحاظ سے درست بھی ہے ۔ اورنگ زیب کے بعد مغلِ اعظم کی حیثیت صفر بن کر رہ گئی تھی ، اور اس کی گزر اوقات کمپنی کے رحم و کرم پر تھی ۔ صد ہا سال کی عیاشیوں اور بے اعتدالیوں نے اعلیٰ طبقے کی فوجی صلاحیتوں کو گھن لگا دیا تھا ۔ وہ فنونِ لطیفہ جنھیں مرفّہ حالی نے آب و تاب دے کر بلند مقام بخشا تھا ، اب اُن کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا ۔ لیکن اس دور کو تمام تر انحطاط کا دور بھی نہیں کہا جا سکتا ، کیونکہ جُوں جُوں پرانا نظام مٹتا جا رہا تھا ، اس کی جگہ نیا نظام اُبھر رہا تھا ۔ فاتحین کی زبان فارسی تھی ۔ جب تک ان کا جاہ و جلال باقی رہا اسے عروج حاصل رہا ۔ لیکن جب اُن کی شان و شوکت ماند پڑ گئی تو اس پر بھی زوال آنے لگا ، اور اس کی جگہ قومی زبان اُردو بڑی تیزی سے آگے بڑھنے لگی ۔ امن امان قائم ہونے پر خوش حالی کا دور دورہ ہوا ۔ تجارت کی گرم بازاری ہوئی ۔ اور متوسط طبقہ ، جو تہذیبِ جدید کا ایک اہم حصّہ ہوتا ہے ، بروئے کار آنے کے لیے جد و جہد کرنے لگا ۔ عوام معاملات کو جانچنے اور سمجھنے کے خواہاں تھے ۔ ان میں تجسّس کی روح جاگ اُٹھی تھی ۔ انھیں اپنے گرد و پیش سے گہری دل چسپی تھی اور وہ جاننا چاہتے تھے کہ بیرونی دنیا کی حالت کیا ہے ۔ دہلی پر اندھیرے کا جو طلسم چھایا ہوا تھا ، وہ ٹوٹ گیا اور سُونے سُونے گلی کوچوں میں بڑی چہل پہل اور گہما گہمی دکھائی دینے لگی ۔

اس چہل پہل سے کہیں زیادہ اہم وہ ذہنی بیداری تھی جو انگریزی تعلیم کے ساتھ پیدا ہوئی ۔ ابتدا میں اس کا دائرہ ایک چھوٹی سی اقلیت تک محدود تھا ، لیکن یہ جذبہ کچھ اس قدر ہمہ گیر تھا کہ اس نے جلد ہی غیر معمولی وسعت پیدا کر لی اور رفتہ رفتہ اس نشأۃ اولیٰ کا باعث ہوا جو اس وقت شہر میں آشکار ہو رہی تھی ۔

مولوی محمد باقر اُن افراد میں سے تھے جو اس عام بیداری سے فائدہ اُٹھانے میں پیش پیش تھے ۔ انھوں نے مسٹر ٹیلر[۲] ، پرنسپل دہلی کالج ، سے وہ چھاپہ خانہ خرید لیا جو مشرقی کتابوں اور انگریزی سے اُردو میں ترجمہ شدہ کتابوں کی اشاعت کے لیے قایم کیا گیا تھا ۔

اس چھاپے خانے کی داستان دل چسپی سے خالی نہیں ۔ یہ دو مقاصد کے لیے لگایا گیا تھا ۔ ایک یہ کہ کالج میں نئی قسم کے نصابات فراہم کیے جائیں ۔ دوسرے یہ کہ مغربی سائنس اور فلسفہ کو اُردو میں تراجم کے ذریعے فروغ دیا جائے ۔ دونوں باتیں بڑی اچھی تھیں ۔ لیکن اگر پریس لگانے سے حکام یہ اُمید رکھتے تھے کہ اس کا دائرۂ عمل دہلی کے تمام ادبی حلقوں پر محیط ہوگا ، تو یہ ان کا خیالِ خام تھا ، اور وہ بہت جلد اس مقصد کے حصول سے نااُمید ہو گئے ۔ کالج سے باہر ان کتابوں کی زیادہ مانگ نہ تھی ۔ اور ان میں سے بعض کی طباعت پر اس قدر بھاری خرچ آتا تھا کہ چھاپہ خانہ بیکار کا بوجھ بن کر رہ گیا ، اور پرنسپل ، جیسے بھی بن پڑے آسے اونے پونے داموں بیچ ڈالنا چاہتے تھے ، چنانچہ مولوی محمد باقر کے ساتھ اُن کا سودا طے پا گیا ۔

چھاپہ خانہ لگنے پر ۱۸۳۶ء میں شمالی ہند میں اُردو کا سب سے پرانا اخبار ''دہلی اُردو اخبار'' جاری ہوا ۔ کم از کم شمالی ہند کی حد تک یہ اولین اردو اخبار[۳] تھا ۔ اس کا سالانہ چندہ ۲۰ روپے تھا ۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس کے نسخے بہت کم یاب ہیں ۔ یہ اخبار دہلی کے حالات و واقعات کا آئینہ دار تھا اور اس سے بعض ایسے ادبی اور معاشرتی امور پر روشنی پڑ سکتی ہے جن کے لیے ہم آج اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے پھرتے ہیں ، یا پھر سنی سنائی باتوں اور قیاس آرائیوں پر بھروسا کر لیتے ہیں ۔ جو تھوڑی بہت معلومات ہاتھ آتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخبار محض خبروں کا پلندا نہ تھا بلکہ اسے شعر و ادب

سے بھی دل چسپی تھی - اس زمانے کے معیار کے مطابق اس کی اشاعت کافی وسیع تھی - لیکن چندہ بھاری ہونے کی وجہ سے اس کی کھپت زیادہ تر اونچے طبقے تک ہی محدود تھی -

مولوی محمد باقر کے سوانح حیات کا یہ مختصر خاکہ تشنہ تکمیل رہے گا اگر ہم اس کے ساتھ ان کے اس کامیاب تجربے کا ذکر نہ کریں جس کا خیال بھی مسٹر ٹیلر ہی کا رہین منت تھا - وہ یہ کہ انھوں نے باہر سے آنے والے سوداگروں کے لیے دہلی میں ایک نیلام گھر یا سرائے تعمیر کی - یہ جگہ ولایتی مال کے لیے ایک مرکزی منڈی ثابت ہوئی - اس سے جو آمدنی ہوتی تھی اس سے خاندان کی دنیاوی حیثیت اور بلند ہو گئی -

بیان کیا جاتا ہے کہ کھجور والی مسجد مولوی محمد باقر ہی نے بنوائی تھی ، اور اس کا یہ نام اس لیے پڑگیا کہ اس کے صحن میں کبھی ایک کھجور اگی ہوئی تھی - علاوہ ازیں باقر نے ایک امام باڑہ بھی تعمیر کرا دیا تھا جو مرزا غالب کے الفاظ میں ''بنائے قدیم و رفیع'' مشہور ہے -

ان کوائف سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ آزاد کا تعلق ایک ترقی کوش خاندان سے تھا جسے علم و فضل کے ساتھ خاص مناسبت تھی - اس کی مالی حالت بہت اچھی تھی - اور اگر ہم مذکورہ بالا خاندانی روایات کو نظر انداز بھی کر دیں تب بھی اس کے مرفہ الحال ہونے کی کافی شہادت ملتی ہے - جس سرائے کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ ناپید ہو چکی ہے ، لیکن مولوی محمد باقر کی حویلی[4] جو انھوں نے ۱۸۳۰ع میں تعمیر کی تھی ، اب بھی موجود ہے - یہ خاصی بڑی اور کشادہ ہے - یہیں "دہلی اردو اخبار" کا چھاپہ خانہ بھی تھا اور کتب خانہ بھی ، جسے آزاد کے بزرگوں نے تیار کیا تھا - حویلی کے قریب ہی لنگر خانہ تھا جو ازمنہ[5] وسطیٰ میں کھاتے پیتے گھرانوں کے گھر بار کا لازمی جزو سمجھا جاتا تھا اور جہاں غریب محتاج لوگوں کو معمولی کھانا اور رات بسر کرنے کے لیے ٹھکانا مل جاتا تھا - اس سے ظاہر ہے کہ آزاد کے آبا و اجداد کو سوسائٹی میں کافی بلند رتبہ حاصل تھا -

آزاد ۱۰ جون ۱۸۳۰ع کو[6] جمعرات کے دن پیدا ہوئے - چار برس کی عمر میں والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ان کی پرورش کا بار مولوی محمد باقر اور

اُن کی ہمشیرہ پر آ پڑا جو ۱۸۵۷ع کی جنگ آزادی کے بعد خاندان کے ہمراہ لاہور چلی آئیں اور فروری ۱۸۷۷ع میں خاصی بڑی عمر میں فوت ہوئیں - آزاد کو ان سے بڑی محبت تھی - چنانچہ انھوں نے ان کی وفات پر اپنے ایک شاگرد ، لالہ دُنی چند کو جو خط لکھا اُس میں گہری محبت اور احترام پوری طرح نمایاں ہے :

"ہمیں ان دنوں صدمۂ عظیم ہوا ، وہ یہ کہ میری پھوپھی صاحبہ جنھوں نے مجھے پالا تھا اور جو ہمیشہ سے گھر کی مالک تھیں ، اُن کا انتقال ہو گیا - وہ نہایت نیک نہاد اور خوش اوقات تھیں اور ان کے سبب سے دل بڑا قوی رہتا تھا - گھر میں اندھیر نظر آتا ہے اور وحشت ہوتی ہے[6] -"

خاندانی روایات کے مطابق مولوی محمد باقر کا ارادہ تھا کہ آزاد مولوی بنیں اور انھوں نے گھر پر دینیات میں تعلیم بھی پائی ، لیکن بعد میں جب دہلی کالج[7] کی مخالفت کم ہو گئی تو ان کا یہ ارادہ بدل گیا اور طے پایا کہ آزاد جدید تعلیم حاصل کریں -

اس طرح ۱۸۴۷ع یا اس کے لگ بھگ ۱۷ برس کی عمر میں آزاد تلامذہ اور اساتذہ کے اُس حلقۂ خاص میں شامل ہوئے ، جو اس وقت شمالی ہند میں بہترین خیال کیا جاتا تھا - یہ زمانہ کالج کے انتہائی عروج کا تھا جب کہ طلبا جوق در جوق چلے آ رہے تھے - پرانی مخالفت ختم ہو چکی تھی اور کالج کے افسرانِ بالا تعلیم و تعلّم میں دل چسپی رکھنے کے علاوہ ہمدرد بھی تھے - آج اساتذہ اور تلامذہ میں جو کاروباری اور روکھا پھیکا تعلق ہے اس میں اور اُس زمانے کے والہانہ ذوق و شوق میں بہت فرق ہے - نئی نسل اُس وقت مستقبل کے شان دار امکانات کے سہانے خواب دیکھنے کے لیے بے تاب تھی - آج ہم ایک ایسے سنجیدہ اور حقیقت پسند دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں جو مثالی دنیاؤں اور منتہائے کمال تک بیک جست پہنچنے کے سادہ اور سہل طریقوں سے بدگمان ہے - ممکن ہے ہم اصلیت کے زیادہ قریب ہوں - لیکن ہر انقلاب جو نئی امنگوں اور دریافتوں کا احساس اور انسان کی بے پناہ قوت کا شعور اپنے ساتھ لاتا ہے اور جو ہمیں یقین ہے اُس وقت دہلی کی نئی نسل میں شدت سے کارفرما تھا ، آسے بھی

ارتقائے تمدن میں ایک خاص مقام حاصل ہے - اس سلسلے میں سی - ایف - اینڈریوز نے اپنی تصنیف "ذکاء اللہ آف دہلی" میں کالج کے طلبا پر نئی تعلیم کے اثر کا جو نقشہ کھینچا ہے ، وہ قابلِ غور ہے :

''منشی ذکاء اللہ جب اپنے بڑھاپے کے زمانے میں مجھے یہ بات بتایا کرتے تھے ، تو ان کی آنکھیں چمک اٹھتی تھیں کہ سائنس کے ان لکچروں کو کس قدر اشتیاق سے سنا جاتا تھا ، اور کس طرح ہر لکچر کے بعد نوٹوں کو بار بار غور سے پڑھا جاتا تھا - ... ایسے لگتا تھا جیسے ذہنِ انسانی کسی بالکل ان جانے ان دیکھے کمرے میں داخل ہو گیا ہو - نوجوان طلبا جب اپنے دل و دماغ میں چونکا دینے والے خیالات کا طوفان لے کر گھر واپس آتے تو وہ رات کو ان حیرت انگیز کارناموں کے خواب دیکھتے جو انھوں نے دن کو دیکھے اور سنے تھے - اس لیے محلِ تعجب نہیں جو کہیں کہیں ایسے طلبا بھی ہوں جنھوں نے اول اول ان علوم کا مطالعہ شروع کیا تھا اور جن کے دل اس نئی شرابِ علم سے سرشار تھے - انھوں نے پرانی رسوم و قیود کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور شریعت کے رسمی عقاید کے بجائے ایسی زندگی کا تقاضہ کرنے لگے جس میں ریاضت اور عبادت کے ظاہری آداب کی جکڑبندی کم ہو - اس لیے یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ وہ لوگ جو طبعاً پرانے مدرسۂ خیال سے تعلق رکھتے تھے ، نئی تعلیم کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے[۸] -''

مزید یہ کہ :

''انھوں (منشی ذکاء اللہ) نے مجھے بتایا کہ یہ عمل ایسا تھا جیسے انسان کسی جادو بھری طلسمی دنیا میں داخل ہو گیا ہو - کون کہہ سکتا ہے کہ آگے کیا کیا کرشمے دکھائی دیں - کسی اچھوتی دریافت کی بدیہی توقع ہمیشہ دامن گیر رہتی - نئی تعلیم پانے والے خود اپنے کو اپنے ملک میں ہراول کے لوگ خیال کرتے اور خواب ہی خواب اور رویا ہی رویا دیکھا کرتے[۹] -''

جب آزاد نے داخلہ لیا تو اس کے بعد ان کے باپ اور مولوی جعفر علی میں ،

جو کالج میں شعبۂ قانون کے مدرس تھے اور ان کے دوست تھے ، ایک زبردست مذہبی مباحثہ[۱۰] شروع ہوگیا ۔ تاحال اس مباحثے کا بہت کم لوگوں کو علم تھا ۔ لیکن حال ہی میں ہمیں ایک چھوٹا سا رسالہ ہاتھ آیا ہے جس میں مولوی باقر پر باقاعدہ کفر کا فتویٰ عاید کیا گیا ہے کیونکہ راسخ العقیدہ شیعہ اُن کے عقاید کو فاسد خیال کرتے تھے ۔ اس رسالے سے ایسے مستند کوائف دستیاب ہوئے ہیں جن سے اس مباحثے پر مبسوط روشنی پڑتی ہے ۔ رسالے کا پورا نام یہ ہے :

''رسالہ مسماة بارشاد المؤمنین متضمنہ فتاوی حضرات مجتہدین بیچ مقدمہ خارج ہو جانے محمد باقر مالک اردو اخبار کے دائرۂ ایمان سے ۔ بیچ تاریخ پانچویں ماہ رجب ۱۲۷۰ھ کے (مطبع نور مغربی) ۔''

مختصراً یہ نزاع اس پرانے قضیے کا نہایت ہی تلخ شکل میں احیا تھا جو راسخ العقیدہ اور روشن خیال شیعوں کے مابین صد ہا سال سے ما بہ النزاع چلا آ رہا تھا ۔ یعنی پہلے تین خلفاے راشدہ رض کے خلاف تبرہ ، جسے راسخ العقیدہ شیعوں کا مقدس فریضہ قرار دیا گیا ہے ، اور جسے اعتدال پسند ایسی بدعت خیال کرتے ہیں جس کی قرآن و حدیث دونوں سے تصدیق نہیں ہوتی ۔ مولوی محمد باقر روشن خیال جماعت کے سربراہ تھے ۔ فتوے کے الفاظ میں ''نزاعِ سنّی شیعہ کو نزاعِ نفسانی اور شیطانی قرار دے ، اور گاہے رنگ اپنا یہ بیان کرے کہ میں میاں شیطان صاحب کو بلکہ کذابین ظالمین منصوی تک کو بھی اپنی زبان سے برا نہیں کہتا اور اہلِ بیت کے دشمنوں پر تبّرا کرنے کو جو فریضہ مؤمنین کا ہے حرکت بازاریوں کی اور اسے "طریقۂ یزید" سمجھتا ہوں ۔''

یہ تھی اس نزاع کی ابتدا ، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ، اور معاملات بھی پیدا ہوتے گئے جنھوں نے اس قضیے کو اور پیچیدہ بنا دیا ۔ مولوی محمد باقر کے مخالفین کہتے تھے کہ اُنھوں نے بنی امیہ کی تائید اور بنو فاطمہ کی فضیحت کی ہے ۔ فتوے کے الفاظ یہ ہیں : ''اور کبھی ساداتِ فاطمہ رض کی خدمت میں بہتان اور بے ادبیاں طبع کیں کہ روح مظلومہ فاطمہ رض کو نہایت غضب ناک کیا ۔'' علاوہ ازیں معلوم ہوتا ہے کہ مولوی باقر نے امیر معاویہ اور یزید کو خلفاے برحق قرار دیتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ "شیعوں پر اُن کا احترام بجا لانا

لازم ہے ۔" اس لیے فتوے میں ان پر یہ الزام بھی عاید کیا گیا ہے کہ ''وہ شیعانِ علی ابن ابی طالب کو تابع یزید و معاویہ قرار دیتا ہے ۔'' اس پر طرّہ یہ کہ وہ مذہب کے بعض ظاہری لوازمات کے پابند نہ تھے جو متشرّع لوگوں کی نظر میں عینِ ضلالت تھی ۔ فرد جرم پر نظر ڈالتے ہوئے پتا چلتا ہے کہ ''کہیں دست بستہ بے خوف نمازِ جنازہ سُنی مذہب کی پڑھتا ہے اور کہیں ہاتھ کھول کر شیعہ کے جنازہ کی نماز پڑھا دیتا ہے ۔'' الزامات کی آخری شق یہ تھی کہ وہ فرقۂ صوفیہ ضالہ کی مدح کرتا ہے ۔ فتوے میں درج ہے کہ اسے ایک فقیر مسمی بصری" بادہ نوش ، تارکِ صوم و صلواۃ ، ریش و بروت تراش سے بے حد عقیدت تھی ۔ بنابریں مولوی باقر کو حکم دیا گیا کہ وہ فوراً اس شخص کی صحبت ترک کرے ورنہ اُسے شیعہ فرقے سے خارج کر دیا جائے گا ۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا بحث و تکرار میں بیش از پیش تندی اور تیزی پیدا ہوتی گئی ۔ اس نے دہلی کے شیعوں کو دو مخالف فریقوں میں تقسیم کر دیا ۔ باقر اور جعفر ایک دوسرے سے دور تر ہوتے گئے ، اور بالآخر ان میں کھلم کھلا ٹھن گئی ۔ لڑائی ، مولویوں کے مخصوص حربے ، سب و شتم سے لڑی گئی جس سے دونوں طرف کے سنجیدہ لوگ منغّص ہوئے ۔ اس زمانے کے ایک شیعہ سربراہ کا فتویٰ ہماری نظر سے گزرا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے کس قدر خلاف تھے ۔ یہ فتوہ بازی میں ایک طویل عالمانہ دستاویز ہے جس کا متن حسبِ ذیل ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چوں از چند سال درمیان حافظ جعفر علی و مولوی محمد باقر مخالفت و منابزت باقصلی الغایت رسیدہ و از آں جا کہ ایں ہر دو شخص در شاہ جہان آباد بعلم منسوب اند ، لاجرم جماعتے با ایں و گروہے با آں یار و مددگار گشت ، تا آنکہ ایں جماعت جعفری و آں فرقہ باقری مشتہر شد ۔ و ایں تخاصم و تعاند چناں در مومنین اثر کرد کہ از حدِ مخالفتِ شیعہ و سنی در گزشتہ نوبتِ ترکِ سلام علیک بل جمیع حقوقِ ایمانی کہ رعایتِ آں بہ حسب اخبار و آثارِ متواترہ لازم و واجب است ، مانندِ حضوریِ جنازۂ موتٰی و عیادتِ مرضٰی و تعزیت و تہنیتِ

ہم دیگر کہ شعار مسلمانان و سنت اسلام است ، بالمرہ برخاست - و رئیس ہر دو گروہ استفتاہائے فرضیہ موافق آرائے خود بانواع ، بہ تلبیس و تدلیس تاویل ازیں جا می کنند و چون ہر سوالے را موافق آن مضمون ... جواب می رود ، ہر یک بہ اتباع خود تاویلش خاطر خواہ خود بہ ہمراہیانِ خویش خاطر نشیں می کند ، گو در واقع چنان نباشد - و از بسکہ ایں ہمراہیانِ جانبین نیز دو طبقہ اند : یکے صاحبان فہم و دیگراں جاہل و محض گوش بر آواز - و ہر یکے ازیں دو طبقہ نیز بر دو صنف اند : یکے آن کہ بوجہ من الوجوہ و سبب من الاسباب با رئیس فرقہ ثانیہ با بعضے مردم آن جا کینہ در سینہ و ضغینہ دیرینہ دارند - و ایں مخالفت را در باب تشنیع آنان و سرورِ دلِ خود غنیمت شمردہ اند - و صنف دوم کسانے اند کہ محض تبعیت را کاربند شدہ اند - یا خویشی یا تمتع دنیاوی یا امور دیگر ازیں قبیل باعث اطاعتِ یکے و مخالفتِ دیگرے شدہ است - الغرض ہر دو فرقہ اسبابِ اجازت تشنیع و تنابز دیگرے بایں خاندان نمودہ نوائر فساد و عداوت را بلند ساختہ بحد قطع رحم و لعنت بہ تسمیہ و اطلاق رسانیدہ اند و نمی دانند (و) غشائے تعصب و غطائے تعنت ایناں (را) (قول) خدائے تعالیٰ فراموش ساختہ اند کہ می فرماید : الفتنة اشد من القتل و جناب نبوت ارشاد فرمودہ است کہ لعن المومن کقتلہ و حق سبحانہ و تعالیٰ شانہ می فرماید : من قتل مومناً متعمداً فجزائہ جہنم خالداً فیہا و غضب اللہ علیہ و لعنہ ... الخ - و افسوس است کہ بہوائے نفس و کینۂ دیرینۂ خود مومنین را بہ تہمت ہائے چند ہدفِ سہام لعن و ملام سازند و نامہائے بد بر او گزارند و ایں فعل نیز مخالفِ امرِ الٰہی است کہ می فرماید و لاتنابزو بالالقاب ... (الآیة) و نمی دانند کہ اگر کسے بر غیر مستحق لعن کند برخودش باز می گردد - و حیرانی است کہ باوجود ادعائے علمیت چرا عمل بکریمہ الصلح خیر و بہ مضمون کرامت مشحون آیہ و انی ہدایہ انما المومنون اخوة ... نمے کنند - ہر گاہ چناں فرمودہ باشند پس چگونہ پسندیدہ اند در حقِ برادرانِ ایمانی اقوالے را کہ برائے خود نمی پسندند -

الحصل باستماعِ ایں حکایات و ادراک وفور چنیں شکایات آنفاً نظر بہ اصلاح ذات البین و رفع النزاع من المتخاصمین تحریرے ازیں جا رفتہ بود و دو شخص معتمد را ناظر حالات گردانیدہ شدہ بود ۔ آن زماں آگہی رسید کہ صورت اصلاح در آئینۂ ظہور مشہود شد ، مگر بعد اندک زمانے متواتر معلوم شد کہ باز نائرۂ فتنہ برخاست و ہماں معرکہ برخاست ۔ و اساسِ استیناس منہدم و اسطوانۂ مخالفت برپا است ۔ ظاہر شد کہ بعضے مومنین سیما معارف آن جا کہ عملاً و وقاراً مشارالیہ جمیع مومنین اند از صمیم القلب متوجہ اصلاح ہم دیگر نیستند بل یحتمل کہ بعضے اصلاً و بالذات و برخے تبعاً و بالعرض گویا علت مادی مواد خصومت و نفاق شدہ اند اعاذنااللہ ... الخ و جمیع المومنین فی وساوس الشیطانیہ و ہواجس النفسانیہ ازاں جا کہ بر مومن صالح لازم است کہ در اصلاح و ایلاف جماعت بہ قبیلۂ خود کوشد و در باب دین جامۂ کہنہ و غرض نفسانی نپوشد ۔

خصوصاً بر ہمہ خاندان سالزوم ایں امر اہم واتم است ۔ لاجرم بہ فحوائے آخر الدواء الکی بار دیگر تحریر مفصل و موکد نوشتن بر خود ضرور دانستہ ، بہ جمیع مومنین علی الاطلاق اطلاع دادہ می شود کہ ازیں مخالفت و قطع رحم و لعن مومنین گو بہ کنایہ یا بہ تصریح تواند شد ، ایں دو مخالف را بہ ہم دیگر موالف سازند و غمازان و مفتریانِ خود غرض را کہ غمازی و افترا شعار شاں باشد از مجلس خود بدر کنند و بہ فحوائے اذا جاء کم فاسق بقول ہر ناکس از جا نروند ۔ و اگر بعدِ جہد و کوشش بلیغ پندارند کہ ایں دو متخاصم ہرگز الفت نہ خواہند گرفت کہ باوجود علم کاربندِ استبداد و جہالت اند ، چوں ہیچ کس از ایشاں مقتداء و مفترض الطاعت نیست ایں ہر دو متخاصم را بہ حالِ شاں وا گزارند و بہ مضمون "لنا اعمالنا و لکم اعمالکم" عامل بودہ ، بہ صلح و آشتی از ہر دو کس کنارہ جویند و بر گفتار کسے عمل نہ کنند و در ضروریات دین ہر چہ پرسیدن باشد ، چہ در عبادت و چہ در معاملات ، ازیں جا تحقیق بے کردہ باشد ... و اگر باوجودِ ایں اطلاع باز بر سرِ نفاق باشند حجتِ ما پیش

خدا بر سرِ ہر سرکش تمام شدہ است و ما علینا الا الاصلاح ۔ و روز جزا قریب است ، اندیشہ جواب ہر کس خودش را باید و از بسکہ مفسدۂ عظیم و تفرقۂ بزرگ در دہلی اندر مومنین واقع شدہ و موجب قول لن یصلح العطار ما افسد الدھر بہ ظاہر رجائے واثق صلح نیست ، مگر چنیں تکلیف دریں صورت برائے (اسلام ؟) حزب شیعیان آل یٰسین اتم تکلیف خود را بہ عمل آوردہ ایم ۔ دریں تحریر مدح یکے و اہانت و ذم دیگرے منظور نیست ۔ اگر کسے ازاں دو فرقہ مضمونے از مضامینِ این کتاب را ممدِ خود و موہن دیگرے قرار (ساختہ) بے جا است ۔ و نیز جملہ مومنین بگوش ہوش شنوند کہ از جانبین استفتاہا دریں جا بے رسد و ازیں جا مضمون استفتا بالضرورت فتویٰ نہ بردہ (؟) ، و آں را اصحاب غرض مفید خود و مضر دیگرے می سازند ، لہٰذا نوشتہ می شود کہ ثانی العمل (؟) تا فتویٰ مفصلے در حق کسے بہ نام او ازیں جا نرود و مالش ...''

آئیے اب دیکھیں کہ آزاد نے اس بحث میں کیا حصہ لیا ۔ غالباً اپنے والد کی تحریک پر وہ بھی بحث میں کود پڑے اور کلاس میں مولوی جعفر علی سے چناں و چنیں شروع کر دی ۔ فاضل مدرس کو مولوی باقر سے دو دو ہاتھ کرنے میں کوئی تامل نہ تھا ۔ لیکن اس نئے محاذ سے وہ بہت جیز بیز ہوئے ۔ پہلے تو انھوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی ، لیکن رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ سٹپٹا اٹھے اور آزاد کے خلاف بے ادبی اور گستاخی کی شکایت کر دی ۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں کہا ''یہ لڑکا پڑھنے نہیں آتا ، مجھے پڑھانے آتا ہے ۔'' آزاد کی خوش قسمتی تھی کہ پرنسپل صاحبِ نظر اور با ذوق آدمی تھا ۔ وہ اس معاملے کو ہنسی میں ٹال دیتا ۔ لیکن برافروختہ مدرس کو بھی اس طرح مطمئن کرنا تھا کہ لڑکے کو کوئی نقصان نہ پہنچے ۔ اس لیے اس نے رفع شر کے لیے آزاد کو سنّی فقہ کی کلاس میں بھیج دیا جہاں انھیں مولوی سیّد محمد سے سُنی دینیات مطالعہ کرنے کا موقع ملا ۔

ممکن ہے اس وقت یہ تبدیلی بہت معمولی لگی ہو ۔ لیکن اس نے آزاد کی زندگی میں ایک نیا ورق الٹا ۔ اب تک وہ شیعہ روایات میں کھوئے رہتے تھے ۔

اب انھیں یہ موقع ملا کہ وہ تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھیں ۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مذہبی تعصّبات کس قدر لایعنی ہوتے ہیں ۔ یہ خیال ان کے دل میں پوری طرح بیٹھ گیا اور بعد میں قومی رجحانات سے گھل مل کر عالم گیر رواداری کے ان تصورات میں ظاہر ہوا جو ان کی تحریروں میں عام ہیں ۔

کالج میں آزاد نے بڑی قابلیت کا ثبوت دیا اور پرنسپل نے آن کے بارے میں بڑی اچھی رپورٹیں دیں ۔ ۱۸۴۸ - ۱۸۴۹ع میں انھیں اردو مضمون نویسی کا پہلا انعام دیا گیا ۔ اس مضمون کے بارے میں پرنسپل کے ملاحظات حسبِ ذیل ہیں :

"بہت سی معلومات اس مضمون میں ایسی کتابوں سے حاصل کی گئی تھیں جو نصابِ تعلیم میں شریک نہ تھیں ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طالب علم کا تعلق "دہلی گزٹ" یا "دہلی آردو اخبار" سے تھا اور اس لیے آسے اردو اخبارات کے پڑھنے کی عادت تھی اور ان سے اس نے بہت ہی مفید معلومات بہم پہنچائی تھیں[۱۲] ۔"

۱۸۴۹ — ۱۸۵۰ع میں آزاد نے پھر آردو مضمون نویسی کا پہلا انعام حاصل کیا ۔ موضوع تھا :

''اسلامی اور انگریزی حکومتوں کے تحت آزادیٔ رعایا کے بارے میں کیا فرق تھا[۱۳] ؟''

آزاد کا کالج میں قیام ان کی زندگی کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوا ۔ اسی نے انھیں زندگی کے سب سے زیادہ اثر پذیر زمانے میں مغربی افکار سے روشناس کرایا ۔ یہ سوال دل چسپی سے خالی نہیں کہ اگر وہ کالج میں داخل نہ ہوتے تو ان کی حالت کیا ہوتی ؟ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، جو دہلی کالج کے کارناموں پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں ، لکھتے ہیں :

''اگر دلی کالج نہ ہوتا تو کیا ماسٹر رام چندر ، مولانا آزاد ، مولوی نذیر احمد ، مولوی ذکاء اللہ ، ماسٹر پیارے لال جیسے لوگ پیدا ہو سکتے تھے ؟''

اور پھر مولوی نذیر احمد کے اس اثر کا جائزہ پیش کرتے ہیں جو انھوں نے دہلی کالج سے قبول کیا تھا ۔ لکھتے ہیں :

''معلومات کی وسعت ، رائے کی آزادی ، ٹالوریشن (درگزر) گورنمنٹ کی

سچی خیر خواہی ، اجتہاد علی بصیرۃ - یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرطِ زندگی ہیں ، ان کو میں نے کالج ہی سے سیکھا اور حاصل کیا ، اور اگر میں کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو کیا ہوتا ؟ مولوی ہوتا ، تنگ خیال ، متعصب ، اکھل کھرا ، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ اور دوسروں کے عیوب کا متجسس ، برخود غلط .... مسلمانوں کا نادان دوست ، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا ، بہرا ، صم ؕ بکم ؕ عمی ؕ فہم لا یرجعون ... من حسنۃ فی الدین و فی الدنیا'' -۱۴

بڑی اعلیٰ اور بجا تعریف ! لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ سید احمد خاں ، حالی اور شبلی نے جو اپنے عہد میں مذہبی اور معاشرتی قلبِ ماہیت کے علم بردار تھے ، کوئی جدید تعلیم نہیں پائی تھی - کالج کو جو بھی اہمیت حاصل ہو سو ہو ، لیکن وہ روحِ عصر بھی کچھ کم نہ تھی جو اس وقت شمالی ہندوستان میں قومی زندگی کو ایک نئے رخ پر موڑ رہی تھی - البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ کالج نے اس روحِ عصر کو ابھارنے میں کچھ کم حصہ نہیں لیا -

اگر ہم فی الحال تاریخِ ادب کے بارے میں ''جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا'' کو چھوڑ کر صرف یہ اندازہ لگانے کی کوشش کریں کہ دہلی کالج نے آزاد پر کیا اثر کیا ، تو اس کے متعلق شاید ہی کوئی اختلاف ہو - کالج نے آزاد میں جرأت ، خود اعتمادی ، آزاد روی اور زندگی کے بارے میں وسیع النظری پیدا کی - سر سے روایات کا بوجھ اتار دیا - تنقیدی صلاحیتوں کو ابھارا اور ان معلمانِ قوم کا ہم نوا بنایا جن میں سے اکثر ان کے اپنے ہی کالج کے چشم و چراغ تھے - یہی لوگ تھے جنھوں نے جنگ آزادی کے بعد سر رشتہ ترقی کو پھر ہاتھ میں لیا اور برصغیر میں نشأۃ الثانیہ کو آگے بڑھنے میں مدد دی -

چونکہ ہمارا سروکار صرف آزاد کے خارجی حالات و ظروف سے نہیں ، بلکہ ان کی باطنی نشو و نما سے ہے ، اس لیے ان کے ذہن کا جائزہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا ، جب تک ہم اس ماحول کا مطالعہ نہ کریں جس میں انھوں نے آنکھ کھولی اور پروان چڑھے - ان کی ذہنی نشو و نما میں بے شک دہلی کالج نے نمایاں حصہ لیا - لیکن جہاں تک جذباتی پہلو کا تعلق ہے ، اور یہ صریحاً اتنا ہی

اہم ہے جتنا ذہنی پہلو ، آزاد نے دہلی کی ثقافتی فضا سے گہرا اور پائدار اثر قبول کیا ۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح انگریزوں کے دارالسلطنت پر قبضہ جمانے کے بعد دہلی میں دوبارہ امن امان کا جو دور دورہ ہوا اور اسے پھر مدتوں کے بعد خوش حالی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا ۔ فرض کیجیے ، تقدیر آزاد کو اس قتل و غارت اور کشت و خون کے زمانے میں پیدا کرتی جس سے میر ، سودا اور دوسرے شعرا کو واسطہ پڑا ، تو کیا ان کی طبیعت کا وہی رنگ ہوتا جو "آبِ حیات" میں دکھائی دیتا ہے ؟ کیا وہ ماضی کی داستان اسی ذوق و شوق سے لکھتے ؟ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ آزاد کا ماضی کو دھوم دھام سے پیش کرنا محض ان کی رومان پسندی کا نتیجہ نہ تھا ، بلکہ اس کی جڑیں مضبوطی سے اصلیت میں گڑی تھیں ۔ میر اور سودا کی شاعری پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ سیاسی حالات نے ان کے کلام پر کیا اثر ڈالا ۔ وہ حزن ، وہ یاس پرستی ، وہ ویرانی اور ''رکھ تسلی کہ یوں مقدر تھا'' کا احساس ، کیا یہ سب اس سیاسی انحطاط اور افراتفری کی بولتی ہوئی علامات نہیں ہیں جن میں ان کی زندگی محصور رہی ؟

مگر جب آزاد پیدا ہوئے تو جہان آباد میں پھر وہی پرانی رونق عود کر آئی تھی ، اور ادب و فن میں وہی بیتی ہوئی دل چسپیاں پھر تازہ ہوگئیں اور پرانے رسوم و آداب پوری شدّ و مد سے جولانی میں آ گئے ۔ بے شک یہ ساری رونق اور خوش حالی چند روزہ تھی ، جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا ، لیکن جواں سال آزاد کو ان خوف ناک عواقب کی کیا خبر تھی ۔ اس زرق برق دنیا سے اس نے اپنی یادوں کا دامن بھر لیا ۔ اور جب نیرنگیِ حوادث کے باعث ، جنگ آزادی کے بعد ، یہ سارے کا سارا نظام ایک خوف ناک دھماکے سے زمین پر آ رہا ، تو ان کے دل و دماغ اس نئے معاشرے میں اپنی وجدانی و روحانی تسکین نہ پا کر بے اختیار اس دنیا کی طرف لوٹ گئے جو ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گئی تھی ۔ آزاد کی نگارشات کی سب سے زیادہ دل چسپی اسی جذباتی لگاؤ میں مضمر ہے ۔ ماضی کا حسن و جمال ، اس کی سحر آفریں کیفیات ، گہما گہمی اور چہچہے ، ان کی طبیعت پر چھائے رہے جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے ، آزاد کی دل چسپی جتنی اخلاقی تھی اتنی ہی جمالیاتی بھی تھی ۔

جس شخص نے اس مبہم جذباتیت اور جمالیاتی رغبت کو اور اجاگر کر کے شعوری اعتقاد میں تبدیل کیا ، وہ آن کا استاد شیخ ابراہیم ذوق تھا ۔ آزاد کے والد اور ذوق میں گہری دوستی تھی ۔ آزاد لکھتے ہیں :

> ''والد مرحوم کا اور ان کا آغازِ تحصیل میں ساتھ ہوا تھا ۔ ساتھ پڑھے ، ساتھ بڑھے ۔ ہر معرکہ میں شریکِ حال رہے اور تھوڑے فاصلے میں دنیا سے رخصت ہوئے ۔ مجھے بیس برس تک اس طرح حضوری خدمت رہی کہ ہر وقت پاس بیٹھ کر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا ، اور جو حال نہیں دیکھے ، وہ بھی اس طرح سنے ہیں گویا سامنے گزرے ہیں[۱۰] ۔''

خاندانی روایت کے مطابق آزاد کی تعلیم کا یہ پہلو اوائل عمر ہی سے شروع ہو گیا تھا ۔ ان کے والد اور ذوق اکثر اکٹھے اٹھتے بیٹھتے تھے اس لیے ذوق کو ان کی ہم نشینی کا اکثر موقع ملتا تھا ۔ باقر کی طبیعت میں رجال پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ، جو آزاد کو ورثے میں ملی ۔ باقر اپنے دوست کے کمالِ فن اور حُسنِ طبع کی ہر وقت تعریف کرتے تھے ۔ اس نے ہونہار لڑکے کی طبیعت پر گہرا اثر ڈالا ۔

بعد میں جب آزاد نے بڑے ہو کر ذوق کی شاگردی اختیار کی تو انھیں اپنی طبیعت کو جلا دینے کا اور بھی موقع ملا ۔ جب دہلی کے حریفانِ کمال میں مقابلے ہوتے تو آزاد اکثر ذوق کے ساتھ گلی کوچوں میں پھرتے ۔ اس وقت ذوق کے ذہن میں گوناگوں نظاروں اور مقامات سے جو جو یادیں ابھرتیں ، وہ ان کا مزے لے لے کر ذکر کرتے ۔

غرض ہم آزاد کو عالمِ جوانی میں کچھ اس طرح تصور کرتے ہیں : ایک ہمہ تن شوق ، سراپا نظر ، تجسس پسند ، نوجوان جو اکیلا یا دوسروں کے ہمراہ ، شہر کے مختلف مقامات پر آتا جاتا ہے ۔ پڑھنے لکھنے کا شوقین ، ملنسار ، تخیّل کا تیز اور ذکی الحس جس نے یقیناً اس ابتدائی زمانے ہی میں شعرا کے متعلق مواد جمع کرنا شروع کر دیا ہوگا ، بعینہ جس طرح والٹر سکاٹ نے شباب ہی میں اپنے وطن کے منظوم عوامی قصّے کہانیاں جمع کرنی شروع کر دی تھیں ۔

جنگ آزادی سے پہلے آزاد کے متعلق صرف اس قدر معلوم ہے کہ ان کی شادی ایک گھوڑوں کے سوداگر ، مرزا عسکری ، کی صاحب زادی سے ہوئی تھی - غالباً یہ اس زمانے کا واقعہ ہوگا جب وہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اخبار نویسی میں اپنے والد کا ہاتھ بٹاتے رہے - "دہلی اردو اخبار" کا واحد پرچہ متعلقہ ستمبر ۱۸۵۴ع سے جو ہمارے پاس ہے ، پتا چلتا ہے کہ آزاد نے اس پرچے کی چھپائی اور اشاعت کا سارا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا -

شاعر کی حیثیت سے آزاد شرمیلے اور مردم گریز تھے اور شاذ و نادر ہی شعر خوانی کے لیے مشاعروں میں حصہ لیتے[16] - جیسا کہ ان کے صاحب زادے نے صراحت کی ہے کہ جب استاد ذوق فوت ہو گئے تو انھوں نے پھر بزم شعرا میں شعر خوانی شروع کی - ان کی ادبی زندگی کا آغاز حقیقی معنوں میں جنگ آزادی کے بعد ہوا -

* * *

حوالے اور حواشی

۱- مخالفین کا یہ کہنا کہ انھیں بوجہِ رشوت ستانی برخاست کر دیا گیا تھا ، درست معلوم ہوتا ہے -

۲- تیس سال سے زیادہ عرصہ (۱۸۲۵ — ۱۸۵۵ع) کالج کے ہیڈ ماسٹر اور اگلے دو سال پرنسپل رہے -

۳- "سید الاخبار" جس کے مدیر سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں تھے ، اسی سال شائع ہونا شروع ہوا ، اور ہمیں ان میں سے کسی کو مقُدم قرار دینے میں تامّل ہے - دونوں کا زمانہ ایک دوسرے کے لگ بھگ ہے - باقی رہی یہ بات کہ برّعظیم میں اُردو کا پہلا اخبار کون سا تھا ؟ تو وہ "جام جہاں نما" تھا جو کلکتے کے فرنگی تجارتی ادارے کی ملکیت تھا اور اس شہر سے ۱۸۲۲ع میں لالہ سدا سکھ اور ڈبلیو - ایچ - پیٹرسن کی زیرِ ادارت جاری ہوا -

۴- یہ مکان چھوٹا بازار ، اندرون کشمیری دروازہ میں واقع ہے - اسے "غدر" میں ضبط کر لیا گیا - لیکن آزاد کے بیٹے آغا محمد ابراہیم نے ۱۸۹۰ع میں دوبارہ خرید لیا - اب یہ ''آزاد منزل'' کہلاتا ہے -

۵- اسلامی سنہ کے مطابق ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ -

۶- مکتوبات آزاد ، صفحہ ۱۴۲ -

۷- جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے ، برعظیم کے تعلیمی ادارے ، جو مغربی اثرات کی تیزی سے نشر و اشاعت کا باعث ہوئے ، ان میں سب سے پیش پیش دہلی کالج ہے - یہ ۱۸۹۲ع میں اوریئنٹل کالج کے طور پر قائم ہوا جس کے لیے مسلمان شرفا نے عربی و فارسی کی تدریس کے لیے رضاکارانہ طور پر چندوں سے امداد دی - لیکن مربّیوں کی اقتصادی

حالت گر جانے کے باعث امدادی رقم ناکافی ثابت ہوئی - ۱۸۲۵ء میں پبلک انسٹرکشن کمیٹی کے تحت دہلی میں ایک گورنمنٹ کالج قائم ہوا جسے نواب اعتماد الدولہ ، وزیراعظم اودھ نے ایک لاکھ ستر ہزار روپے رقم خطیر وصیت میں دی - ۱۸۲۸ء میں سر چارلس مٹکاف کی سفارش پر اس میں ایک انگریزی جماعت جاری کی گئی - اس انقلابی اقدام سے وسیع پیمانے پر بے اطمینانی پیدا ہوئی اور بعض دیگر ترقیاتی تدابیر کی طرح لوگوں نے اسے بھی عیسائیت پر نازل کرنے کی عیارانہ ترکیب خیال کیا - مگر یہ تعصب بہت جلد دور ہوگیا - کالج کے موسسین کا بڑا مقصد ایک ایسا اینگلو انڈین ادارہ بنانا تھا جہاں قومی زبان کے ذریعے مغربی سائنس اور فلسفہ کی تعلیم دی جا سکے - کالج کی ایک نمایاں خصوصیّت سوسائٹی برائے فروغ علوم ہند تھی جو ''دہلی ٹرانسلیشن سوسائٹی'' کے نام سے مشہور ہے ، اور جس نے فلکیات ، طبیعیات اور دیگر موضوعات پر متعدد انگریزی کتابوں کے تراجم شایع کیے - اس کے اساتذہ ایم فیلکس بوتروس ، ڈاکٹر سپرنگر اور ماسٹر رام چندر جیسے مشہور و معروف فضلا تھے -

۸- ص ۴۲ ، ۴۳ -

۹- ص ٦۵ -

۱۰- اس نزاع کے آغاز و اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے آغا محمد طاہر لکھتے ہیں :

''دہلی میں نواب سیّد حامد علی خاں صاحب مرحوم بڑی چلتی رقم تھے کہ اپنی عقل و تدبّر کے زور سے ابو ظفر بہادر شاہ کے وزیراعظم اور مختار کل بنے ہوئے تھے - ان کی رئیسانہ طبیعت کو گوارا نہ تھا کہ دوسرا شخص بادشاہ کے مزاج میں داخل ہو - ادھر یہ حال تھا کہ شہر میں مولانا محمد باقر ... اور قلعۂ معلّٰی میں ان کے دلی دوست حضرت ذوق کا طوطی بول رہا تھا - نواب صاحب موصوف کو اس کی تاب کہاں تھی ، چنانچہ انھوں نے حضرت ذوق کے توڑ پر تو غالب کو پہنچایا ، اور مولانا کے مقابلے میں علامہ قاری جعفر علی کو

لا کھڑا کیا ۔ قلعہ میں تو کچھ بس نہ چلا ، لیکن شہر میں دھڑا بندی شروع ہوگئی اور رشک و حسد کی فوجیں پرے جانے لگیں ۔
(فلسفۂ الٰہیات)

آغا محمد باقر کی تصریحات جو غالباً مندرجہ بالا بیان سے ماخوذ ہیں ، یا پھر اسی روایت کی ترجمانی کرتی ہیں ، حسب ذیل ہیں :

''محمد اکبر کے انتقال کے بعد دہلی میں دو جماعتیں پیدا ہو گئیں ۔ ایک جماعت قاری جعفر علی کی معتقد تھی... اور دوسری مولانا محمد باقر کے خاندان سے مختص تھی ۔ لیکن قاری جعفر علی صاحب کے دہلی میں قیام کرنے سے یہ قدیمی اعزاز منقسم ہوگیا ۔ اس افتراق کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ نواب حامد علی خاں مرحوم نے ... اپنی پارٹی کو تقویت دینے کے لیے ... جعفر علی صاحب کو مولانا محمد باقر کے مقابلے میں لا کھڑا کیا ۔ اس طرزِ عمل اور دراندازی سے دہلی کی شیعہ جماعت میں نفاق پیدا ہوگیا اور وہی گروہ ، جو مدتوں سے ایک ہی خاندان سے عقیدت رکھتا چلا آتا تھا ، دو جماعتوں میں تقسیم ہوگیا ۔ (اورینٹل کالج میگزین ، فروری ۱۹۳۹ء ، ص ۴۴)

آغا محمد باقر نے اپنے خاندان کے لیے جس فضیلت کا دعویٰ کیا ہے ، اس کی تائید اس فتوے سے نہیں ہوتی جس کا حوالہ دیا گیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی محمد باقر تمام شیعہ فرقے کے سربراہ نہیں بلکہ صرف ایک جماعت کے سرخیل تھے ۔ چونکہ نواب حامد علی کے اس تنازعے میں شرکت کے متعلق کوئی اور شہادت دستیاب نہیں ، اس لیے اس کی تصدیق مشکل ہے ۔ بہرحال اس کے قبول کرنے میں بعض دشواریاں ہیں ۔ اول ، اگر نواب مذکور کو واقعی ذوق سے حسد تھا تو پھر وہ ان کی مدد پر کیوں آمادہ ہوئے ؟ جیسا کہ ''مقدمۂ دیوان ذوق'' میں آزاد کے اپنے بیان سے ثابت ہوتا ہے ۔ آزاد کے مطابق ذوق ہمیشہ نواب حامد علی خاں کے پیش رو ، مرزا مغل بیگ کی خسّت کی شکایت کرتے تھے ، اور نواب حامد علی خاں میں انھیں ایک بڑا مربی ہاتھ آیا ۔

وہ لکھتے ہیں :

''مرزا مغل بیگ وزیر ہوگئے ، تو وزیرِ شاہی کا سارا کنبہ قلعہ میں بھر گیا ؛ مگر استادِ شاہی کو ۳۰ روپیہ مہینہ - چند روز کے بعد مرزا مغل بیگ کی ترکی تمام ہوگئی ... نواب حامد علی خاں مرحوم مختار ہوئے ، تب استاد شاہی کا سو روپیہ مہینہ ہوا -''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ذوق نواب کے پروردۂ نعمت تھے - نیز یہ باور کرنا مشکل ہے کہ انھیں ذوق جیسے عضوِ ضعیف سے کوئی اندیشہ لاحق ہو سکتا تھا -

یہاں ایک اور امر بھی قابلِ غور ہے - نواب موصوف ۱۸۳۸ع میں مختار مقرر ہوئے ، اور یہ نزاع ۱۸۴۸ع کے لگ بھگ شروع ہوا - پھر یہ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی یہ شاخسانہ کھڑا کر دیا - در حقیقت اس نزاع کو راسخ العقیدہ اور ''بدعتی'' شیعوں کے باہمی اختلافات کا قدرتی نتیجہ تصور کرنا چاہیے - باقی رہے نواب حامد علی خاں تو اگر انھوں نے اس قیل و قال میں حصہ لیا تو اس کے دو اسباب ہو سکتے ہیں ؛ وہ اپنے عقائد میں قدامت پسند تھے - یا پھر اس لیے کہ انھیں ہر دل عزیز فرقے کی حمایت اور خوش نودی حاصل ہو -

چونکہ ہمارا مقصد آزاد اور ان کے اسلاف کی بابت چند غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا بھی ہے ، یہاں ایک اور روایت کی تکذیب بھی ضروری معلوم ہوتی ہے - آغا باقر نے اس تنازعہ کی روداد پیش کرتے ہوئے لکھا ہے :

''ان دونوں گروہوں کی مخالفت روز بروز ترقی پر تھی ... چنانچہ معاملات اس حد کو پہنچے کہ ایک دن رات کی تاریکی میں کسی تاریک دل جعفری نے مولانا کے مکان کی ڈیوڑھی پر آ کر دستک دی - مولانا نے جونہی ڈیوڑھی میں قدم رکھا اس نامعلوم شخص نے ایک دم چھری سے سات کاری زخم لگائے - مولانا سخت مجروح ہوئے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے اور حملہ آور اپنا کام کرکے تاریکی میں غائب ہوگیا -'' (اورینٹل کالج میگزین بابت فروری ۱۹۳۹ع)

یہ خاندانی روایت سراسر غلط ہے - یہ درست ہے کہ اسی نوعیت کا حملہ ان پر ہوا تھا - لیکن یہ تقریباً بیس سال پہلے کی بات ہے - اس سلسلے میں ہم تک دو روایتیں پہنچی ہیں اور یہ فیصلہ کرنا کہ ان میں سے کون سی درست ہے ناممکن ہے - مندرجہ بالا فتوے تکفیر میں درج ہے :

''رشوت ستانی کی جس تہمت سے آپ تو موقوف ہوا ، لیکن اکثر عملہؐ کچھری کو بھی موقوف کرایا - اور عمر بھر جھوٹی نالش کرتا رہا - جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک پتھر چھاپے خانے کے مسمی ریاض کے گھر رکھوا کر بعلت دزدی سات برس قید کروائی ... اور نو چھریاں اپنے بدن پر کھا کر واسطے دفع بدنامی ایک طالب علم کو پھنسوا دیا کہ لوگ جانیں طالب علموں کے جھگڑے میں چھریاں کھائیں - اس طالب علم نے طامس صاحب کے محکمے میں جا کر نجات پائی -''

اس حساب سے یہ حملہ متذکرہ بالا ریاض کے لواحقین یا احباب کی طرف سے ایک انتقامی اقدام تھا - موافقین کا کہنا ہے کہ یہ حملہ کالج کے ایک بد چلن استاد کے ایما پر اس کے ایک آلہؐ کار طالب علم نے کیا - اس روایت کے مطابق مولانا باقر نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ایک طالب علم کو ، جس میں انھیں دل چسپی تھی ، محولہؐ بالا استاد کی جماعت سے ایک اور جماعت میں منتقل کروا دیا - اس سے مولانا اور اس استاد میں ٹھن گئی اور مؤخرالذکر نے انتقام کے لیے ایک طالب علم کو رازداں بنایا - مولوی باقر اس غریب طالب علم کی درس و تدریس کے لیے اس کی قیام گاہ پر جایا کرتے تھے - ایک رات جب وہ اکیلے واپس آ رہے تھے ، استاد کے آلہؐ کار نے ان پر حملہ کر کے زخمی کر دیا -

۱۱- مرحوم دہلی کالج ، ص ۴۶ -

۱۲- ایضاً ، ص ۴۷ -

۱۳- ایضاً ، ص ۱۶۹ -

۱۴- ایضاً ، ص ۱۶۹ - ۱۷۰ -

۱۵- آزاد کا بیان کہ انھوں نے بیس سال ذوق کی خدمت میں گزارے قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا - آزاد ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے اور ذوق کا سنہ وفات ۱۸۵۴ء ہے - اس حساب سے انھیں چار سال ہی کی عمر سے ذوق کا قرب حاصل ہو گیا تھا - اور وہ ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرنے لگے - اس میں ذرا شک نہیں کہ آزاد نے ذوق سے بہت کچھ سنا ، لیکن یہ سب کچھ اس زمانے سے متعلق ہے جب وہ سنِ شعور کو پہنچ چکے تھے -

۱۶- اوائلِ عمر میں آزاد کو اپنے بزرگوں کے بغیر مشاعروں میں شمولیت کی اجازت نہ تھی - ملاحظہ ہو ''دیوان ذوق'' ص ۱۷۲ اور ۲۰۰ -

دوسرا باب

جنگِ آزادی کے دوران میں

جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد آزاد کے والد مولوی محمد باقر کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی ۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق کا بیان حسبِ ذیل ہے :

مسٹر ٹیلر اور مسٹر اسٹنر جان بچا کر بھاگے اور میگزین سے صحیح سلامت باہر نکل آئے ، لیکن ہوش و حواس باختہ ۔ حیران تھے کہ کہاں جائیں ۔ ہر سمت موت کھڑی نظر آتی تھی ۔ بہ ہزار دقت ٹیلر صاحب کالج کے احاطے میں آئے اور اپنے بڈھے خانسامے کی کوٹھری میں گھس گئے ۔ اس نے انھیں محمد باقر صاحب ، مولوی محمد حسین آزاد کے والد ، کے گھر پہنچا دیا ۔ مولوی باقر سے اُن کی بڑی گاڑھی چھنتی تھی ۔ انھوں نے ایک رات تو ٹیلر صاحب کو اپنے امام باڑے کے تہ خانے میں رکھا ۔ لیکن دوسرے روز جب ان کے امام باڑے کی خبر محلے میں عام ہوگئی تو مولوی صاحب نے ٹیلر صاحب کو ہندوستانی لباس پہنا کر چلتا کیا ۔ مگر ان کا بڑا افسوس ناک حشر ہوا ۔ غریب بیرم خاں کی کھڑکی کے قریب جب اس سج دھج سے پہنچے تو لوگوں نے پہچان لیا اور اتنے لٹھ برسائے کہ بچارے نے وہیں دم دے دیا ۔ بعد میں مولوی باقر صاحب اس جرم کی پاداش میں سولی چڑھائے گئے اور ان کا کوئی عذر نہ چلا ۔ مولوی محمد حسین آزاد کا بھی وارنٹ کٹ گیا تھا ۔ مسٹر ٹیلر کے مارے جانے میں آن کی بھی سازش خیال کی گئی تھی اور ان پر بھی قوی شبہ تھا ۔ مگر یہ راتوں رات نکل بھاگے اور کئی سال تک سرزمینِ ایران میں بادیہ پیمائی

کرتے رہے - جب معافی ہوئی تو ہندوستان واپس آئے۔[1]

مندرجہ بالا بیان کے علاوہ مولوی محمد باقر کی سزا یابی کی مسلّمہ وجہ یہ بھی بیان کی جاتی تھی کہ وہ اپنے زمانے کے چوٹی کے صحافی تھے، جن کو بہادر شاہ ظفر کے ساتھ انتہائی ہمدردی تھی - بلا شبہ یہ امر قابلِ تسلیم ہے کہ اس زمانے کے معیارِ انصاف کے مطابق اتنی ہی بات ان کو موردِ الزام ٹھہرانے کے لیے کافی تھی - لیکن ہمیں تلاش و تفحص سے ایسے کوائف بھی دستیاب ہوئے ہیں جن سے مولوی باقر ہمارے نقطۂ نظر میں شہادت کے مستحق ٹھہرتے ہیں، لیکن سرکار برطانیہ کی رعایا ہونے کے لحاظ سے موردِ الزام - یہ شہادت اس رسالے سے فراہم ہوئی ہے جو انگریزوں کے ایک اشتہار یا اعلان کے جواب میں اس وقت شایع ہوا تھا جب وہ دہلی پر آخری حملہ کرنے والے تھے - اس اشتہار کا مطلب باغیوں میں پھوٹ ڈالنا تھا - اس میں قطعی طور پر یقین دلایا گیا تھا کہ انگریزوں کی مہم آرائی کا مقصد ہندوؤں کی گوش مالی ہے - نیز کارتوسوں میں جو چکنائی استعمال کی گئی تھی وہ سور کی چربی سے نہیں بلکہ گائے کی چربی سے حاصل کی گئی تھی - جوابی اشتہار، جس میں انگریزوں کی مصالحانہ تجویز کو شدت سے رد کیا گیا تھا اور ان کے خلاف جہاد کو جائز قرار دیا گیا تھا "اردو اخبار" میں شایع ہوا تھا - رسالے کا عنوان ہے:

"رسالہ ہادی العباد فی جواز الجہاد الی یوم التناد - متضمن جوابِ با صواب در ردِ اشتہار مہارانِ جعل ساز - عدویّن دین خاتم النبیّین - تنوک زدہ جناب استادی محمد ابن محمد در ۱۲۷۲ھ مطبع دہلی "اردو اخبار" ملقب بہ خطاب ظفر بن اہتمام سید عبداللہ -"

اس سلسلے میں 'اردو اخبار' کا ذیلی عنوان 'اخبار ظفر' خاص معنی رکھتا ہے - یہ اردو اخبار کے اس واحد نسخے کی لوح پر، جو ہمارے پاس ہے، درج نہیں - بہ گمان غالب یہ ذیلی عنوان جنگ آزادی کے دوران اُس وقت اختیار کیا گیا تھا جب انگریزوں کے خلاف جہاد کا سیلاب پورے چڑھاؤ پر تھا، اور اس سے اس کے مدیر کی قلعۂ دہلی سے وابستگی قطعی طور پر ثبوت کو پہنچ جاتی ہے[2] - فتوے کا پورا متن یہ ہے:

استفسار: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ انگریز دہلی پر

چڑھ آئے ہیں اور اہلِ اسلام کے جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں ؟ اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں ؟ اور اگر فرض ہے تو فرضِ عین ہے یا نہیں ؟ اور جو لوگ شہروں اور بستیوں میں رہنے والے ہیں ، ان کو بھی جہاد فرض ہے یا نہیں ؟ بیان کرو ۔

جواب : در صورتِ مرقومہ فرضِ عین ہے اوپر اس شہر کے تمام لوگوں کے ۔ اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے ۔ چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلے اور لڑائی کی ہے ۔ اور بہ سبب کثرت اجتماعِ افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے آلاتِ حرب کے تو فرضِ عین ہونے میں کیا شک ہے ۔ اور اطراف و احوال کے لوگوں پر ، جو دور ہیں ، باوجودِ خبر فرضِ کفایہ ۔

ہاں اگر اس شہر کے لوگ عاجز ہو جائیں مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا ۔"

بلا لحاظ اس امر کے کہ فتوے کا مصنّف کون تھا ، اس 'پرآشوب دور میں مطبع اخبار دہلی سے اس کی محض اشاعت ہی مالک کی سزائے موت کے لیے کافی دلیل تھی ۔ لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ محمد ابن محمد ، مولوی باقر کا اپنا فرضی یا تصنیفی نام تھا[۳] ۔ نیز مستند تاریخی شواہد سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مولوی باقر نے جنگِ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا ۔

ان دلائل و شواہد کے بعد مولوی محمد باقر کی سزایابی پر مزید غور کرنا بے کار ہے ۔ یہ حیرانی کی بات نہیں کہ انھیں پھانسی کیوں دی گئی اور ان کی جائیداد کیوں ضبط کی گئی ، بلکہ حیرت اس پر ہے کہ آزاد ، جو اس وقت اخبار کے مدیر تھے ، کیسے جان بچا کر نکل گئے !

دہلی سے نقلِ مکانی کے بارے میں آزاد مقدمۂ "دیوانِ ذوق" میں لکھتے ہیں :

"میرا یہ حال ہوا کہ فتح یاب لشکر کے بہادر دفعۃً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد نکلو ــــ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی ۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران تھا کہ کیا کیا کچھ اٹھا کر لے چلوں ۔ اُن کی غزلوں کے 'جنگ پر نظر پڑی ۔ یہ ہی خیال آیا کہ

محمد حسین زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا ، مگر اُستاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو غزلیں پھر آ کر کہیں گے ۔ اب ان کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے ۔ یہ ہیں تو مر کر بھی زندہ ہیں ، یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا ۔ وہی 'جنگ اُٹھا بغل میں مارا ۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ بائیس نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا ... آوارہ ہو کر خدا جانے کہاں نکل آیا [۴]۔''

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل ہمیں آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد سے حاصل ہوتی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"اس انتہائی بے بسی کے عالم میں آزاد نے اپنے والد کے ایک دوست سے مدد طلب کی جو فوج میں افسر تھا ۔ اس نے انھیں کچھ عرصہ سائیس کے بھیس میں ملازم رکھا ۔ ایک دفعہ وہ انھیں اپنے باپ کے پاس بھی لے گیا ۔ یہ بڑی ہی مختصر اور کرب آمیز ملاقات تھی ۔ باپ بیٹا بڑی حسرت سے ایک دوسرے کو دور ہی سے دیکھتے رہے اور پھر ایسے جدا ہوئے کہ کبھی ملاقات نہ ہو سکی ۔"

حیاتِ آزاد کے اس حصّے کا تکملہ اس سے بہتر اور کیا ہوگا کہ ان اثرات کی نشان دہی کی جائے جو جنگِ آزادی کے بعد ان کے دل و دماغ پر مرتسم ہوئے ۔ "غدر" کے بعد آزاد نے دو سال کا بیشتر حصّہ ایک آوارہ و سرگرداں اور بے خانماں شخص کی حیثیت سے بسر کیا جسے ہر وقت اپنی زندگی معرضِ خطر میں نظر آتی تھی ۔ ان مصیبتوں نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑا ۔ جوانی کی ساری اُمنگیں اور ولولے بجھ کر رہ گئے ۔ 'غدر' سے پہلے وہ بڑے ہشاش بشاش ، زندہ دل اور ملنسار تھے ۔ اب خاموش اور عزلت پسند ہو گئے ۔ مولوی خلیل الرحمٰن کہتے ہیں : ''ایامِ غدر کے مصائب کا طبیعت پر بہت ہی زیادہ اثر تھا ۔ نہ پوچھیے ۔ میں نے صبح کی ہوا خوری یا شام کی فرصت میں بارہا چھیڑا اور انجام آنسوؤں پر ہوا ۔''

* * *

حوالے اور حواشی

۱- دیکھیے مرحوم دہلی کالج، ص ۶۱، ۶۲ -

آزاد جنگِ آزادی کے بعد بھاگ کر ایران نہیں گئے - ۱۸۵۸ء میں جب عام معافی کا اعلان ہوا تو وہ اس وقت، اپنے بیان کے مطابق، لکھنؤ میں تھے (ملاحظہ ہو آبِ حیات، ص ۱۵۲) - اور نہ ہی غدر کے فوراً بعد ان کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے تھے - کئی سال بعد ان کے ایک رشتہ دار کی رپورٹ پر ان کے خلاف فوج داری مقدمہ دائر کیا گیا جسے غالباً مولوی رجب علی یا ڈاکٹر لائٹنر کی سفارش پر واپس لے لیا گیا تھا -

۲- ہمارے اس خیال کی تائید اس اقتباس سے ہوتی ہے جو ڈاکٹر اسلم فرّخی نے "محمد حسین آزاد" میں نقل کیا ہے :

''دہلی اُردو اخبار کے آخری دنوں میں ایک بڑا انقلاب یہ آیا کہ اس کا نام بدل کر ''اخبار ظفر'' ہوگیا ... تبدیلی کی وجہ یہ ظاہر کی گئی تھی کہ بہادر شاہ نے اپنے نام کی مناسبت سے اس اخبار کا نام از رہِ کمال رافت و ظرافت "اخبار الظفر" بہ دستخطِ خاص مرحمت کیا تھا -

۳- میرے مضمون 'اُردو کا پہلا صحافی' کو دیکھ کر آغا محمد باقر نے اپنے مضمون 'مولوی محمد باقر' میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ محمد ابنِ محمد اور مولوی باقر ایک ہی شخص تھے (دیکھیے 'ادبی دنیا' دور پنجم، شمارہ ہشتم، ص ۱۰۹) - اس مقالے میں انھوں نے نادانستہ طور پر ہمارے موقف ہی کی تائید کی ہے کہ حکومت انگریزی انھیں سزائے موت دینے میں حق بجانب تھی -

۴- یہ سچ ہے لیکن تمام تر سچ نہیں - اس تاریخی 'جنگ کے علاوہ، جس کا ادبی حلقوں میں اتنا چرچا ہے، آزاد اور بھی بہت کچھ بچا کر ساتھ لانے میں کامیاب ہوئے تھے - ہم نے آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد کے پاس مولوی محمد باقر کی بہت سی کتابیں، رسالے اور کاغذات دیکھے ہیں - آزاد کا مقصد اس ڈرامائی انداز سے اپنے قارئین کو، ذوق سے اپنی فرطِ عقیدت سے، متاثر کرنا تھا -

---

تیسرا باب

پنجاب میں ابتدائی زندگی

(۱)

دہلی کے اُجڑنے کے بعد علم و حکمت نے پورب کی طرف کوچ کرکے جس طرح لکھنؤ میں نیا گہوارۂ ادب قائم کیا تھا اُسی طرح جب دلی کی سیاسی حیثیت ملیامیٹ ہوگئی تو ادب اور فن نے پنجاب میں ایک نیا میدان تلاش کر لیا۔ دہلی کی بزم آرائیوں کی رونق لاہور میں کھنچ آئی۔ دہلی کے مشاہیر جن میں ماسٹر پیارے لال آشوب، منشی درگا پرشاد، مولوی کریم الدین اور خواجہ الطاف حسین حالی جیسے مشاہیر کا نام لینا کافی ہے، یکے بعد دیگرے یہاں تشریف لائے۔ ان میں سب سے پہلا جو شخص لاہور آیا اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی، آزاد تھے۔ وہ تا دمِ زیست لاہور سے وابستہ رہے۔

پنجاب میں آزاد کے ابتدائی ایام کے متعلق بہت کم معلومات ہیں۔ یوں بھی ان کا دستیاب ہونا ازبس دشوار بلکہ محال معلوم ہوتا ہے۔ جگراؤں کے مولوی رجب علی ارسطو جاہ[1] کی ملازمت اختیار کرنے سے پہلے آزاد کچھ عرصہ جالندھر میں ایک شخص ڈاکٹر لاکر سٹائین کے ملازم رہے۔ آزاد نے اس بات کا ذکر دختر کشی پر اپنے مقالے میں کیا ہے جو اُنھوں نے حکومتِ پنجاب کے ایک اشتہار کے جواب میں اُنیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں لکھا تھا۔ اس کے علاوہ ریاست جنید میں بھی آزاد کے عارضی قیام کا پتا چلتا ہے لیکن اس کے متعلق بہت کم مستند معلومات دستیاب ہیں۔

ایک بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ آزاد ۱۸۶۰ع میں مولوی رجب علی کے اخبار 'مجمع البحرین'[2] کے دفتر میں ملازم تھے۔ مولوی رجب علی دہلی کالج

میں مولوی محمد باقر کے ہم جماعت رہ چکے تھے - جب ان کو پتا چلا کہ ان کا ملازم کون ہے تو اُس نے ان کے ساتھ بہت عمدہ سلوک کیا -

قیاس ہے کہ آزاد ایک سال سے زیادہ عرصہ جگراؤں نہیں ٹھیرے - جو کام انھیں دیا گیا تھا اس میں ان کا دل نہیں لگا - ۱۸۶۰ع کے آخر یا اگلے سال کے شروع میں وہ پندرہ روپے ماہوار پر جنرل پوسٹ آفس لاہور میں سررشتہ دار[۳] کے طور پر ملازم پائے گئے - یہ ساری ملازمتیں سدِ رمق کی عارضی تدابیر تھیں - وہ محکمۂ تعلیم میں ملازم ہونے کے خواہاں تھے اور اس غرض کے لیے ۱۸۶۰ع میں ، جب وہ ابھی تک جگراؤں میں مقیم تھے،[۴] ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب سے لدھیانہ میں ملے - بعد ازاں انھوں نے اس سے مئی ۱۸۶۱ع میں دوبارہ ملاقات کی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا - وہ بدستور جنرل پوسٹ آفس میں ۱۸۶۳ع کے بعد تک کام کرتے رہے - آخر لفٹننٹ گورنر کے میر منشی پنڈت من پھول کے توسل سے انھیں ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کے محکمے میں معمولی سی نوکری مل گئی - یہ جنوری ۱۸۶۴ع کی بات ہے -

اس زمانے کا آزاد کا ادبی کام چند سلاموں ، قصیدوں ، مرثیوں اور غزلوں پر مشتمل ہے - ان میں سے "قصیدہ در تہنیتِ ولادتِ جناب امیرالمومنین علی ابن ابی طالب" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے - اس سے آزاد کی باطنی زندگی پر روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جنگِ آزادی کے بعد کس طرح انقلاباتِ زمانہ کا سامنا کیا - قصیدے میں دنیاوی جاہ و جلال کے ہیچ ہونے پر زورِ بیان صرف کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

جو کچھ کہ گزرا ہے سب ہے حضور پر روشن
کہ گھر تباہ ہوا اور خان و مان برباد
یہ لاکھ شکر کہ ثابت قدم ہے دل اب تک
اگرچہ سیلِ حوادث نے توڑ دی بنیاد
ہو ایسے حال میں پھر خاک زندگی کا لطف
زمانہ بر سرِ کیں ، چرخ بر سرِ بیداد
نہیں ہے قطرۂ خوں دل میں نام کو ، لیکن
ہے اشکِ چشم رواں مثلِ دجلۂ بغداد

ز بس یگانہ و بیگانہ سب ہیں تشنۂ خوں
کرے ہے سوے بدن کارِ نشترِ فصّاد

پڑی بلا پہ بلا اس قدر کہ آنکھوں میں
جہاں سیاہ ہے مانندِ کورِ مادر زاد

بہ تنگ ہو کے زمانے کے ہاتھ سے ہر دم
نکلتی دل سے صدا ہے کہ یا علی فریاد!

پھروں ہوں اڑتا ادھر کا ادھر، ادھر کا ادھر
بہ گردِ بادِ حوادث مثالِ کاغذِ باد

حصارِ چرخ سے جاؤں مگر نکل کے کہاں
کہ گھیرے بیٹھے ہیں رستوں کو زادہ ہاے زیاد

کرم کی ہو نظر اے آفتابِ عزّ و شرف
کہ چھائی عالمِ ہستی میں ظلمتِ بے داد

بس اب تو ہو شبِ راحت نصیبِ جانِ حزیں
کہ میں بھی بیٹھ کے روشن کروں چراغِ مراد

رجوعِ قلب سے سب مومنیں کہیں آمیں
بحقِ احمدِ مرسل ؐ و آلہ الامجاد

کمی ہے حضرتِ عالی میں کون سی شے کی
عطا ہوں مطلبِ دل حدِّ آرزو سے زیاد

(۲)

برطانوی ہند میں شمول کے بعد پنجاب میں جو نظامِ تعلیم رائج کیا گیا وہ مقامی زبانوں کے لیے نیک فال تھا۔ میکالے کا نظریہ، جو سابقہ ماہرینِ تعلیم کا نصب العین رہا تھا، یعنی پرانے علوم کو ہٹا کر نئے علوم رائج کیے جائیں، اُن بلند توقعات کو پورا کرنے میں ناکام ہو چکا تھا جو اس کے حامیوں کے دل میں جاگزیں تھیں۔ ایک مشہور اہل الرائے کے الفاظ میں ''اس نظام سے فقط

ایسے اشخاص پیدا ہوئے جو محض سرکاری دفتروں اور ریلوے سٹیشنوں پر کلرک کی حیثیت سے کام کر سکتے تھے مگر ان میں حقیقی علمی و ادبی استعداد نہ تھی"۔[۵]

اس کے برعکس خالص مشرقی وضع کی تعلیم بڑی ہی رجعت پسندانہ پائی گئی۔ مشرقی تعلیم کا مقصد لوگوں پر قدیم وضع کا بےکار سا علم مسلّط کرنا تھا، اس لیے قرینِ قیاس یہی سمجھا گیا کہ پرانے اور اس نئے نظام میں، جو میکالے کی یادداشت محرّرہ ۱۸۳۹ع کے باعث وجود میں آیا تھا، مفاہمت پیدا کرکے درمیانی روش اختیار کی جائے۔ پنجاب کے اربابِ اختیار کا مقصد یہ تھا کہ مقامی زبانوں میں ایسا ادب پیدا کیا جائے جس میں مغرب کی روح سموئی گئی ہو۔

نئے نظامِ تعلیم کا آغاز پنجاب کے قلم روِ ہند میں شامل ہونے کے فوراً ہی بعد ہو چکا تھا۔ پہلے پندرہ سال، یا کچھ زیادہ عرصہ، ابتدائی تعلیم کو ترقی دینے پر صرف کیا گیا، تاکہ اس پر آگے چل کر اعلیٰ تعلیم کی عمارت کھڑی کی جا سکے۔ ۱۸۶۴ع میں کہ کچھ عرصے سے سکولوں کی تعلیم کا ایک عمدہ نظام سرگرمِ کار تھا، حکومت نے فوقانی تعلیم کے لیے کالج کی ضرورت محسوس کی، جہاں میٹرک کا امتحان پاس کرنے والے طلبہ ادب کے اعلیٰ مدارج تک تعلیم حاصل کر سکیں۔ حکامِ اعلیٰ سے اس بارے میں رجوع کیا گیا اور لاہور اور دہلی میں دو ایسے کالج قائم کرنے کی منظوری حاصل ہوگئی جن میں طلبہ کو جامعہ' کلکتہ کے امتحانات کے لیے تیار کیا جا سکے۔

پنجاب میں اردو ادب کی ترقی کا دامن گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر[۶] کے نام سے وابستہ ہے۔ بےشک ان میں بعض کمزوریاں تھیں (جیسا کہ "اے ہسٹری آف دی گورنمنٹ کالج" سے بخوبی ظاہر ہے) لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی درست ہے کہ پنجاب اپنی ذہنی ترقی اور عام بیداری کے لیے سب سے زیادہ انھی کا مرہونِ منّت ہے۔

ڈاکٹر لائٹنر کی صلاحیتوں اور کمزوریوں نے باہم مل کر انھیں ہیرو بنا دیا ـــ ایک ایسا شخص جس نے اپنے ہم عصروں پر جادو کا سا اثر کیا۔ وہ نہ صرف عوام و خواص کو اپنے جوش و خروش میں بہا لے گئے، بلکہ اعلیٰ سے اعلیٰ برطانوی حکام سے بھی اپنا لوہا منوانے میں کامیاب رہے۔ ڈاکٹر لائٹنر میں ہر دل عزیز قیادت کے تمام جوہر تھے ـــ جاذبِ نظر مدبّرانہ شخصیت (جس میں

نمائش پسندی کا میلان بھی تھا) ناقابلِ تسخیر جوش و خروش جو سب کو اپنے والہانہ پن سے گرویدہ بنائے ، ان تھک محنت اور سب سے زیادہ پروپیگنڈے کی زبردست صلاحیت - ملازمت کے آغاز میں آنھوں نے پنجاب میں اورینٹل یونیورسٹی قائم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا - چنانچہ متعدد مشکلات جیسے مناسب تعاون کا فقدان ، مخالفانہ نکتہ چینی اور سرکاری تذبذب کے باوجود وہ برابر جدوجہد کرتے رہے ، یہاں تک کہ ان کا خواب جزوی طور پر پورا ہوا اور یونیورسٹی کالج لاہور ۱۸۶۹ع میں قائم ہوگیا -

مگر ڈاکٹر لائٹنر اس کالج سے مطمئن نہ تھے - اس کا الحاق جامعہٗ کلکتہ سے تھا جس میں ذریعہٗ تعلیم انگریزی تھا - اس بارے میں ڈاکٹر لائٹنر کے عقائد بڑے پختہ تھے - وہ تعلیم کو حقیقی معنوں میں موثر بنانے کے لیے دیسی زبانوں میں تدریس ضروری سمجھتے تھے - ان کی رائے میں ''جامعہ کلکتہ کا نظام طلبہ کو ملکی زبانوں اور ثقافت سے ، جو ان کی کلاسیکی زبانوں میں محفوظ تھی ، بیگانہ کر دیتا ہے ... اور تو اور یہ کام یاب طلبہ کو دو دنیاؤں میں معلّق چھوڑ دیتا ہے اور وہ کسی سے بھی صحیح ربط پیدا نہیں کر سکتے - ناکام طلبہ کی حالت ان سے بھی خراب تر تھی -''[7]

صحیح حل یہ تھا کہ جامعہٗ علومِ شرقیہ قائم کی جائے - ڈاکٹر لائٹنر اس کام کی طرف متوجہ ہوئے - پہلا قدم یہ تھا کہ رائے کو ہموار کیا جائے اور برطانوی حکام اور ہندوستانی اکابر کا تعاون حاصل ہو - اس مقصد کے لیے آنھوں نے ۲۰ جنوری ۱۸۶۵ع کو انجمنِ پنجاب قائم کی - اس ورنیکلر سوسائٹی کے صدر وہ خود تھے - انجمن کے مقاصد میں قدیم مشرقی علم و حکمت کا احیا ، دیسی زبانوں کے ذریعے ہر دل عزیز تعلیم کی فراہمی ، عام دل چسپی کے معاشرتی ، ادبی اور سائنسی مسائل پر بحث اور تعلیم یافتہ ، بااثر طبقوں کی عمّالِ حکومت سے راہ و رسم شامل تھی -

انجمنِ پنجاب نے صوبے بھر میں بیداری اور خود آگاہی پیدا کرنے ، نیز جدید علوم کی ترویج میں بڑا مفید کام کیا - ایک مفت پبلک لائبریری اور ریڈنگ روم قائم کیا گیا - دیسی اور کلاسیکی زبانوں کے متعدد رسالے اور تراجم شایع کیے گئے - اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عملی طریقہ یہ اپنایا گیا کہ مترجموں ، ایڈیٹروں

اور مولفّوں کی نقد انعامات سے حوصلہ افزائی کی گئی ۔ علاوہ ازیں ممتاز علما و فضلا سے عام دل چسپی کے موضوعات پر مسلسل لکچروں کا اہتمام بھی کیا گیا ۔

اس انجمن کو سرکردہ انگریزی حکام کی پوری مدد حاصل تھی ۔ ان حکام میں مسٹر ایجیسن ڈپٹی کمشنر لاہور ، مسٹر برانڈرتھ کمشنر لاہور ، مسٹر گرفن اور مسٹر الگزانڈر انسپکٹر مدارس خاص طور پر نمایاں ہیں ۔ لفٹننٹ گورنر سر ڈونلڈ میکاوڈ بھی اس پروگرام کے حامی تھے ۔

لاہور میں قائم کردہ مثال کی پنجاب کے دوسرے شہروں میں بھی پیروی کی گئی اور تھوڑے ہی عرصے میں دہلی ، راولپنڈی ، سیالکوٹ ، حصار ، امرتسر ، گورداسپور اور گجرانوالہ میں بھی اسی طرز کی انجمنیں قائم ہوگئیں ۔ جلد ہی سارا صوبہ اس نئی روشنی سے متاثر ہوگیا ۔

صوبے کی تعلیمی پالیسی اور علمی ترقی پر بالتفصیل بحث ہمارے دائرے سے خارج ہے ۔ جو اصحاب اس موضوع میں دل چسپی رکھتے ہیں انھیں "اے ہسٹری آف دی یونیورسٹی آف دی پنجاب" مولفہ پروفیسر گیرٹ سے رجوع کرنا چاہیے ۔ ان کوائف کے لیے ہم نے بھی اسی مأخذ سے استفادہ کیا ہے ۔

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے بخوبی ظاہر ہے کہ مقامی زبانوں میں ایسے ادب کی ترویج و اشاعت کا شوق روز بروز بڑھتا چلا گیا جس میں مغرب کی روح کارفرما تھی ۔ چنانچہ ایسے اربابِ علم ، اساتذہ اور محققین کی مانگ برابر بڑھ رہی تھی جو علومِ جدید کی تحقیق اور نشر و اشاعت میں مدد دے سکیں ۔

اب ہم پھر اپنے موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔

(۳)

آزاد کو عوامی اور سرکاری حیثیت سے منظرِ عام پر لانے کا ذریعہ یہی انجمنِ پنجاب تھی ۔ ڈاکٹر لائٹنر چاہتے تھے کہ انھیں چند ایسے محبِ وطن اصحاب کا تعاون حاصل ہو جو انھیں ان کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں مدد دیں ۔ اب تک انھیں اپنی پسند کا آدمی ہاتھ نہیں آیا تھا ۔ آزاد کے لیے یہ عمدہ موقع تھا کہ وہ اپنی اہمیت کا احساس دلا سکیں ۔ چنانچہ انھوں نے انجمن کی سرگرمیوں

میں جوش و خروش سے حصّہ لینا شروع کر دیا اور جلد ہی انجمن کی ایک نمایاں شخصیت بن گئے ۔ ڈاکٹر لائٹنر اور آزاد اکثر اکٹھے اُٹھتے بیٹھتے تھے ۔ اس سے دونوں میں گہری دوستی اور رفاقت پیدا ہو گئی ۔ ۱۸۶۷ع میں آزاد ، انجمن کے سیکرٹری مقرر ہوئے ۔ یہ تقرر ان کے روشن مستقبل کی ضمانت تھا ۔

آزاد کو انجمن سے کس قدر دل چسپی تھی اور اُنھوں نے اس کے لیے کیا کام کیا ؟ اس کا اندازہ اُن مقالات سے کیا جا سکتا ہے جو اُنھوں نے انجمن کے مختلف جلسوں میں فروری ۱۸۶۵ع سے ستمبر ۱۸۶۸ع تک پڑھے ۔ کل ۱۴۴ مقالات میں سے ۲۲ مقالے صرف آزاد کے تھے ۔ ان میں سے بہت سے موضوعات مقبول نوعیت کے تھے ۔ اکثر کا موضوع سائنس اور سماجی اصلاح تھا ۔ زیادہ علمی نوعیت کے مقالے تعلیمی ، ادبی اور ثقافتی پہلوؤں سے تعلق رکھتے تھے ۔

۱۸۶۶ع میں حکومت نے آزاد کو ایک خاص کام کے لیے کلکتہ بھیجا ۔ وہاں انھیں محمڈن لٹریری سوسائٹی [۸] میں دل چسپی پیدا ہوئی جس کی بنیاد نواب عبداللطیف نے ڈالی تھی ۔ اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو برطانوی تہذیب سے روشناس کیا جائے ۔ لاہور واپس آنے پر آزاد نے اس سوسائٹی کے دستور پر ایک لکچر دیا ۔

اس بارے میں یادداشت بھی محفوظ ہے کہ جب انجمن پنجاب قائم کی گئی تو ڈاکٹر لائٹنر نے مقامی حکومت کے ساتھ انجمن کے لیے با مشاہرہ لکچرار مقرر کرنے کی ضرورت پر بھی بات چیت کی تھی ۔ بالآخر یہ تجویز منظور ہو گئی اور ایک لکچر فنڈ مخصوص کر دیا گیا ۔ تقریباً دو سال تک اس تجویز پر عمل درآمد نہ ہو سکا ۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کے لیے مناسب شخص کی خدمات حاصل ہونے میں دشواری پیش آ رہی تھی ۔ آزاد جب کلکتے سے واپس آئے تو انھیں یہ عہدہ پیش کیا گیا اور اُنھوں نے قبول کر لیا ۔ اس اسامی کا مشاہرہ ۷۰ روپے تھا ۔

ڈاکٹر لائٹنر اور آزاد کے باہمی ذوق و شوق اور شرکتِ عمل کے باوجود انجمن ابھی تک با شعور طبقے کو متاثر نہیں کر سکی تھی ۔ انجمن میں جن امور پر بحث کی جاتی تھی ان میں عوامی زندگی سے وابستہ اہم مسائل پر سنجیدہ غور و خوض کی بجائے محض علمی اور نظری مباحث پر زور دیا جاتا تھا ۔ گارساں دتاسی کے لکچر بابت ۱۸۶۷ع کے ایک مختصر اقتباس سے پتا چلتا ہے کہ ان دنوں انجمن کی کیفیت

کیا تھی ، نیز آزاد نے اسے مقبولِ عام بنانے میں کیا کام کیا :

''انجمنِ پنجاب ڈاکٹر لائٹنر کی کوششوں کی مرہونِ منّت ہے - چونکہ کچھ عرصے سے انجمن کچھ سست پڑ گئی تھی ، اس لیے اس کا ایک اجلاس اپریل ۱۸۶۷ء کو بلایا گیا جس میں اس کے سیکرٹری محمد حسین نے اعلان کیا کہ آیندہ انجمن غربا کو مدد پہنچانے کا کام کرے گی - اس غرض سے ایک پروگرام مرتّب کیا گیا تاکہ سرکاری ہسپتالوں میں غربا کے علاج کو خاص طور پر مدِ نظر رکھا جائے ، عورتوں کو ناداری کے باعث گناہ کی زندگی اختیار کرنے سے بچایا جائے اور محتاجوں میں مفت دوا تقسیم کرنے کا بندوبست کیا جائے -۹''

آزاد نے انجمن کے جلسوں کی جو رودادیں لکھی ہیں ان سے مندرجہ بالا مقاصد کے علاوہ کچھ اور معاملات کا بھی پتا چلتا ہے - مثلاً یہ کہ ایران و عرب سے کتابیں خرید کر انجمن کے کتب خانے میں توسیع کی جائے - مسلمانوں میں کثرتِ ازدواج پر پابندیاں عائد کی جائیں اور دوسری شادی کی اجازت صرف اسی صورت میں دی جائے کہ عورت بانجھ یا دائمی مریض ہو - عورتوں میں بد زبانی کا انسداد کیا جائے ، شادی بیاہ کے اخراجات میں کمی کی جائے ، محکمۂ ڈاک کی کارکردگی کو بہتر بنایا جائے - ان سب کا نتیجہ کیا ہوا ، اس پر غور کی ضرورت نہیں - ان میں سے اکثر برائیاں بدستور ہمارے معاشرے میں موجود ہیں اور ان کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے - مگر جو لوگ اس قسم کی اصلاحی تدابیر کو خام خیالی تصوّر کرتے ہیں ، ممکن ہے ڈاکٹر لائٹنر اور آزاد کی پادر ہوا گرم جوشی پر زیرِ لب متبسّم ہوں ، تاہم اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ بعض اوقات برائیوں کی نشان دہی کر دینا بھی کچھ کم بات نہیں ہوتی -

ان امور سے کہیں زیادہ اہم کام مدارس کے لیے نئے نصابات تیار کرنا تھا - اس کام میں آزاد سب پر بازی لے گئے - انھوں نے ابتدائی جماعتوں کے لیے ایسی کتابیں لکھیں جو واقعی شاہ کار ہیں - تھا تو یہ فرمائشی کام لیکن نہایت بلند پایہ - اگر زبان کے چٹخارے اور محاورے کے بانکپن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ہمارے بچوں کے ادب میں ان تصانیف کا جواب نہیں -

آزاد پانچ برس تک محکمہ' تعلیمات عامہ میں مختلف حیثیتوں سے کام کرتے رہے - پھر ۱۸۷۰ع میں ڈاکٹر لائٹنر کی سفارش پر کرنل ہالرائیڈ[۱۰] نے انھیں گورنمنٹ کالج میں عربی کا مددگار پروفیسر تعینات کیا -

(۲)

۱۸۶۵ع کا سال اس لیے اہم ہے کہ اس میں وسط ایشیا کو ایک سیاسی مشن روانہ کیا گیا - اس میں آزاد ، پنڈت من پھول اور دو اور آدمیوں کو اس غرض سے بھیجا گیا کہ وہ وہاں کے سیاسی حالات پر رپورٹ پیش کریں" - مشن کا مقصد واضح کرنے کے لیے ہمیں تھوڑی دیر اصل موضوع سے ہٹنا پڑے گا -

انیسویں صدی کے آغاز میں روس وسط ایشیا میں اپنے مقبوضات کی توسیع کی پالیسی پر عمل پیرا تھا - ۱۸۳۹ع میں ایک روسی فوجی دستہ اورن برگ سے روانہ ہوا تاکہ خان خیوا کی گوشمالی کرے جو روسی باشندوں کو اغوا کرکے انھیں ترکستان میں غلاموں کی منڈیوں میں فروخت کیا کرتا تھا - یہ مہم ناکام ہوئی - جنگ کریمیا کے بعد روس نے پھر وسط ایشیا میں اپنی حیثیت مستحکم کرنے کی کوشش کی - ۱۸۶۴ع میں اس نے کامیابی سے وسط ایشیا میں قدم بڑھائے اور خوخند ، بخارا اور خیوا کے ازبک خوانین سے ٹکر لی -

خان خوخند اور امیر بخارا نے اپنا انجام دیکھتے ہوئے ہندوستان ، انگلستان اور قسطنطنیہ سے مدد کی بے سود التجا کی - خوخند کا ایک سفیر اکتوبر ۱۸۶۴ع میں لاہور آیا اور جب لارڈ کارنوالس نے وہاں عظیم دربار منعقد کیا تو وہ اس میں موجود تھا - بخارا کا سفیر جنوری ۱۸۶۷ع میں وارد ہوا - تب تک دونوں ریاستوں کی آزادی کا خاتمہ ہو چکا تھا اور انھیں باقاعدہ زار کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا تھا -

حکومت ہند ان بیرونی معاملات میں دخل دینے کی خواہاں نہ تھی - پھر بھی مناسب خیال کیا گیا کہ خوانین کی ریاستوں کے سیاسی حالات پر رپورٹ پیش کرنے کے لیے ایک خفیہ مشن بھیجا جائے -[۱۲]

کوئی سیاسی مشن شاید ہی ایسا ہوگا جو ادبی لحاظ سے اس قدر مفید ثابت ہوا ہو۔ "سخن دان فارس" جس میں آزاد نے وسطِ ایشیا کے مشاہدات قلم بند کیے ہیں، گزشتہ صدی کی چند جان دار کتابوں میں سے ایک ہے۔

آزاد کے لیے یہ مشن ایک اور طرح بھی مفید ثابت ہوا۔ اس سے وہ غرض بھی پوری ہوگئی جس کے پیشِ نظر وہ انجمن پنجاب سے وابستہ ہوئے تھے اور اس کی کارروائیوں میں حصّہ لینا شروع کیا تھا۔ غدر کے زمانے سے ان کی شخصیت شکوک و شبہات سے گھری ہوئی تھی۔ اب جب کہ انھوں نے ایسی خدمات سرانجام دیں تو ان کی ساکھ حکومت کی نظروں میں پوری طرح بحال ہوگئی اور غدر کے اثرات کا جو خوف ان پر تقریباً دس سال سے مسلط تھا، اب دور ہوگیا۔

(۵)

شاذ و نادر ہی ایسا ہوا ہے کہ کوئی فرمائشی تصنیف، جو اقتصادی غرض سے لکھی گئی ہو، ادبی شاہ کار ثابت ہو۔ اس لحاظ سے "قصصِ ہند"، حصہ دوم، اردو ادب میں ایک مستثنا حیثیت رکھتی ہے۔

سالِ تصنیف قطعی طور پر متعیّن نہیں، لیکن اس کی اشاعت کا اتا پتا کرنل ہالرائیڈ کے اس اعلان سے ملتا ہے جو مارچ ۱۸۶۸ء میں کیا گیا تھا اور جس کا خلاصہ گارساں دتاسی کے لکچر برائے ۱۸۶۸ کے صفحہ ۱۹۷ پر درج ہے۔ اعلان کی تفصیلات اس کتاب کے مندرجات سے اس قدر مطابقت رکھتی ہیں کہ ہمیں کتاب کا سنہ تصنیف ۱۸۶۸ء قرار دینے میں تامل محسوس نہیں ہوتا۔ اعلان کی تیسری شق حسبِ ذیل ہے:

> ''ایک ایسی کتاب جو تاریخِ ہند کے اہم واقعات سے متعلق چیدہ چیدہ کہانیوں پر مشتمل ہو اور ان افراد کے مفصّل حالات پیش کرے جنھوں نے کارہائے نمایاں دکھائے۔"

اعلان میں خصوصی انعامات بھی تجویز کیے گئے تھے اور مزید ہدایت کی گئی تھی کہ ''لکھنے والوں کو بہت ہی سادہ زبان برتنی چاہیے جس میں فارسی الفاظ اور تراکیب بہت کم ہوں۔''

یہ تھیں اعلان کی موٹی موٹی باتیں ۔ آزاد نے کرنل ہالرائڈ کی ہدایت پر "قصص ہند" کا دوسرا حصّہ لکھنا شروع کیا ۔ پہلا اور تیسرا حصّہ ماسٹر پیارے لال آشوب[۱۳] کے لیے چھوڑ دیا گیا ۔

یہ چھوٹی سی کتاب آزاد کے ذہن و اسلوب کی نمایاں خوبیوں کو نہایت پُرکشش پیرائے میں پیش کرتی ہے ۔ تاریخی لحاظ سے بعض واقعات مشتبہ ضرور ہیں لیکن جہاں تک قرونِ وسطیٰ کے طمطراق ، کرّ و فرّ ، شان و شوکت اور رومانیت کی جیتی جاگتی ، بولتی چالتی تصویریں پیش کرنے کا تعلق ہے ، اردو ادب میں اس سے بہتر اور کوئی کتاب نہیں ۔

* * *

حوالے اور حواشی

۱- رجب علی، تلونڈی ضلع لدھیانہ میں ۱۸۰۶ع میں پیدا ہوئے - ۱۸۳۵ع میں دہلی کالج میں داخل ہوئے - سرکاری خدمات کے سلسلے میں انھیں ارسطو جاہ کا خطاب اور لدھیانہ میں جاگیر ملی - نہایت متشدد شیعہ تھے اور تمام عمر مناظروں میں گزاری -

۲- یہ اخبار ۱۸۶۰ع میں کسی وقت جاری ہوا اور اس پر گارساں دتاسی نے ۱۸۶۱ع کے لکچر میں تبصرہ کیا -

۳- مکتوبات آزاد، ص ۲۲۳ -

۴- ایضاً، ص ۲۲۳ -

۵- A History of the University of the Punjab ص ۱۲—۱۳ -

۶- ڈاکٹر ڈبلیو - لائٹنر، ایم - اے، پی ایچ - ڈی : فرائی برگ، ہنگری میں پیدا ہوئے - انھوں نے ۱۸۵۵ع میں جنگ کریمیا میں درجۂ اول کے ترجمان کی حیثیت سے انگریزی فوج میں کام کیا - بعد میں کنگز کالج لندن میں ترکی زبان کے مدرس رہے - ۱۸۶۰ع میں انھیں اسی کالج میں عربی اور اسلامی قانون کا پروفیسر مقرر کیا گیا - یہیں انھوں نے شعبۂ مشرقی کی بنیاد رکھی - وہ یورپ اور ایشیا کی متعدد انجمنوں کے صدر اور مؤسس تھے - ۱۸۷۸ع میں مستشرقین کی کانگرس منعقدہ فلورنس میں ہندوستان کی نمائندگی کی - گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۸۸۶ع میں سبک دوش ہوئے -

۷- اے ہسٹری آف دی یونیورسٹی آف دی پنجاب، ص ۹ -

۸- یہ انجمن ۱۸۶۳ع میں قائم ہوئی -

۹- خطبات گارساں دتاسی ، ص ۵۹۰ -

۱۰- ۱۸۶۸ع میں ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات عامہ پنجاب مقرر ہوئے -

۱۱- آغا محمد طاہر نے اپنی تالیف "مکتوبات ِ آزاد" کے آخر میں ڈاکٹر لائٹنر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے : "ڈاکٹر لائٹنر ۱۸۷۶ع میں سنٹرل ایشیا میں پولٹیکل خدمات پر گئے تو مولانا کو بھی ساتھ لے گئے -" کچھ ان الفاظ اور کچھ مولوی خلیل الرحمٰن کی فراہم کردہ معلومات کی بنا پر ہم نے ابتداً یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس مشن کے سربراہ ڈاکٹر لائٹنر تھے - اس بارے میں صحیح معلومات آغا محمد اشرف نے فراہم کی ہیں - انھوں نے انڈیا آفس لائبریری ، لندن میں اس مشن سے متعلق دستاویزات کو بچشم ِ خود دیکھا اور پتا چلایا کہ اس کے سربراہ درحقیقت پنڈت من پھول تھے ، جنھیں ہم نے اپنے ابتدائی مسودے میں وفد کا ایک رکن قرار دیا تھا - ہم آغا محمد اشرف سے استفادے کا تہ ِ دل سے شکریہ بجا لاتے ہوئے اپنے بیان میں مناسب ترمیم کرتے ہیں -

۱۲- مشن کو جو کام تفویض کیا گیا تھا اس کے لیے ضمیمہ (۱) ملاحظہ ہو -

۱۳- ماسٹر پیارے لال آشوب ۱۸۳۸ع میں بمقام دہلی پیدا ہوئے اور دہلی کالج میں تعلیم پائی - وہ پنجاب بک ڈپو کے کیوریٹر تھے اور بعد میں انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز ہوئے - انھوں نے "رسوم ِ ہند" کے پہلے تین باب اور قصص ِ ہند ، حصہ اول و سوم تحریر کیے - (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ''حیات ِ آشوب'' از امداد صابری) -

چوتھا باب

سخن دانِ فارس سے نیرنگِ خیال تک

(۱)

''قصصِ ہند'' کے علاوہ ، جس کا ذکر پچھلے باب میں آ چکا ہے ، آزاد نے چالیس سال کی عمر تک کوئی ایسا کارنامہ سرانجام نہیں دیا جس پر وہ ناز کر سکتے ۔ جب وہ ادھیڑ عمر کو پہنچے تو انھوں نے ایسی معرکہ آرا کتابیں تصنیف کیں جن پر ان کی شہرت کا تمام تر مدار ہے ۔

پہلی کتاب فارسی زبان اور ادب پر متعدد لکچروں کا مجموعہ ہے ۔ یہی لکچر بعد میں ''سخن دانِ فارس'' کے نام سے شایع ہوئے ۔ کتاب کے دو حصّے ہیں ۔ پہلے میں لسانیات کے اصولوں پر دو خطبات ہیں اور مثالیں فارسی ، عربی اور سنسکرت سے پیش کی گئی ہیں ۔ یہ حصّہ الگ سے کتابچے کی شکل میں چھٹی دہائی کے کہیں آخر میں شایع ہوا تھا ۔ دوسرا حصّہ جو فارسی ادب اور اسی نوع کے دوسرے موضوعات سے تعلق رکھتا ہے ، مسودے کی شکل میں عرصے تک پڑا رہا ، تا آنکہ ۱۹۰۷ء میں دونوں حصّے اکٹھے شایع ہو گئے ۔

''سخن دان فارس'' کو مستقل کتاب کے بجائے اس موضوع پر متفرق مقالات کا مجموعہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا ۔ یہی وجہ ہے کہ معلومات کی فراوانی اور آپچ کے باوجود اسے وہ امتیاز حاصل نہیں ہوا جو "آبِ حیات" کو حاصل ہے ۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اب ملک میں فارسی زبان و ادب کی پہلی سی گرم بازاری نہیں رہی تھی ۔ کتاب میں خاص طور پر دو باتوں سے بحث کی گئی ہے ۔ اول یہ کہ زبان ایک جیتی جاگتی چیز ہے اور جس طرح دوسرے عضوے قدرتی طور پر نشو و نما

اور تغیّر و تبدّل کے مراحل سے گزرتے ہیں ، زبان بھی گزرتی ہے ۔ الفاظ بندھے ٹکے مفاہیم کی بے حس و حرکت علامات نہیں ہوتے ، جن میں کوئی تبدیلی نہ ہو ۔ ان کا تلفّظ اور ان کے معانی بدلتے رہتے ہیں ، یہاں تک کہ بعض اوقات وہ مر بھی جاتے ہیں ۔ یہ بحث مصنف کو قدرتی طور پر تلفّظ ، علمِ معانی ، معانی میں ترفّع اور تنزل ، مستعار الفاظ کے نظریے ، قوموں کا میل جول اور لسانی نشو و نما ، متروکات ، اشتقاق اور ان سے ملتے جلتے مُوضوعات کی طرف لے جاتی ہے ۔ اطلاعات نہایت مختصر ہیں لیکن ان کی لسانیات پر گہری نظر کا پتا دیتی ہیں ۔

کتاب کا دوسرا موضوع لسانیات کا یہ مشہور انکشاف ہے کہ تہذیب کے دوسرے شعبوں کی طرح زبان پر بھی قدرتی اور معاشرتی ماحول کا اثر پڑتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''کسی زبان کی نکتہ فہمی کا حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے ملک کی تاریخ اور جغرافیہ اور ملکی حالات اور اہلِ ملک کے عادات و اطوار سے بخوبی واقفیت نہ ہو ... وہ جن استعاروں اور تشبیہوں سے مرصّع ہے ، ان کی بنیاد ضرور کسی نہ کسی خصوصیتِ ملکی پر ہے ، جس میں ملک کی حالت ، سرزمین کی صورت ، لوگوں کی ریت و رسوم ، رہنے سہنے کے دستور ، ملاپ جلاپ کے طریقے ، طرزِ لباس ، نشست و برخاست کے قاعدے وغیرہ وغیرہ ، سب کو دخل ہے ۔ اور انھی کی بنیاد پر وہ نمکیں محاورے اور رنگیں استعارے ، چبھتے ہوئے اشارے ، کھٹکتے ہوئے کنائے قرار پاتے ہیں جو ان کی انشا پردازی کو اور زبانوں کی فصاحت سے الگ جلوہ دے کر روشن اور ممتاز دکھاتے ہیں ۔[1]''

اور یہ کہ :

''غور کرو تو کسی قوم کی تحقیقی حالت اور حقیقی لیاقت اور طبیعت کی اصلیت ہمیں نہیں معلوم ہوتی ، اور تاریخ بھی ہمارے دل پر تصدیقی اور یقینی نقش نہیں کرتی ۔ ہاں ، جو باتیں خود ان کے منہ سے نکلی ہیں اور کتابوں میں لکھی گئی ہیں ، اگر وہ ہاتھ آ جائیں تو ان کے سارے کاروبار اور حالات و خیالات گویا اقراری تصدیق کو پہنچ جاتے ہیں ۔[2]''

آزاد اہلِ ایران کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں کو لیتے ہیں ، خواہ ان کا تعلق حال سے ہو یا ماضی سے —— آب و ہوا ، موسم ، لباس ، مذہب وغیرہ - اور متعدد مثالیں دے کر واضح کرتے ہیں کہ ان سب عناصر نے فارسی زبان اور ادب پر کیا اثر کیا - ان مباحث سے وہ صرف زیرِ بحث نظریے کی تائید میں شہادت ہی فراہم نہیں کرتے ہیں بلکہ یہ نتیجہ بھی اخذ کرتے ہیں (جس کا احساس ان کے دورۂ ترکستان سے پیدا ہوا) کہ انسان کسی بھی ادب کی روح کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ اس کے پس منظر سے پوری طرح آگاہ نہ ہو -

یہ تمام لکچر یکساں طور پر وقیع نہیں - آٹھواں لکچر "زبان فارسی کا انداز اور زبانوں کے انداز سے کیا نسبت رکھتا ہے" تشنہ ہے - غالباً اس لیے کہ آزاد کو عربی اور اردو کے سوا کسی زبان کا علم نہ تھا - فارسی شاعری پر بھی لکچر بے حد سرسری ہے - اس کے برعکس فارسی نثر پر اس قدر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہو - یہاں آزاد نے ایک جدید نقّاد کی حیثیت سے بڑی جرأت سے کام لے کر پرانے مقفیٰ و مسجع طرزِ انشا پردازی کی بھرپور مذمّت کی ہے جس میں گوناگوں تکلفات اور صنائع بدائع کی بھرمار نظر آتی ہے - وہ فارسی ادب پر تاتاری اثرات کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اس سے اقلیمِ سخن میں انقلابِ عظیم نمودار ہوا - زمین آسمان اور آسمان زمین ہوگیا - عالمِ صورت کے تماش بیں اسے فارسی کا نوروز کہیں گے ، کیونکہ استعارے اور تشبیہ کی گلکاری سے ... کاغذی تختے گلزار نظر آتے ہیں - مگر آزاد تم سے کہتا ہے کہ اندر کچھ نہیں - وہ حقیقت میں لفظوں کی بہار تھی اور معنوں کی خزاں -[۳]''

''اعجازِ خسروی'' پر تنقید کس قدر برجستہ ہے :

''۶۸۸ صفحے کی موٹی کتاب ہے ، مگر اول سے آخر تک ایہام ، مراعات النظیر ، طباق ، تضاد ، وغیرہ وغیرہ - صنائع بدائع میں لغت بازی اور جگت بازی کا مینہ برس رہا ہے - اس دھواں دھار میں تاریخی آگاہی ، اخلاقی تاثیر ، علمی مسائل ، مذہبی ہدایت کچھ نظر نہیں آتی - لفظوں ہی لفظوں میں ساری دنیا تمام ہے -[۴]''

اسی ''سہ نثر ظہوری'' پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اس صدی میں انشا پردازی کے عالم میں بہت سے مخلوق پیدا ہوئے جو عجیب الخلقت ہیں ، یعنی چند کتابیں لکھی گئیں کہ علمی ، تاریخی ، اخلاقی کوئی مطلبِ کتابی ان میں نہیں ، پھر بھی کتابیں ہیں ۔ ایک اُن میں سے 'سہ نثر ظہوری' ہے ۔°''

اس کتاب کا موازنہ ایسے ہی متوازی موضوعات پر حالی اور شبلی کی تحریروں سے کیا جائے تو قاری کو فوراً اس بات کا احساس ہوگا کہ آزاد کس ذوق و شوق سے اپنے پسندیدہ مضامین کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ داخلیت ان کی تحاریر کی ایک مستقل خصوصیت ہے ۔ اس کے برعکس حالی اور شبلی ہمیشہ عالمانہ ثقاہت اختیار کرتے ہوئے تمام تر نفس الامر ہی سے سروکار رکھتے ہیں ۔ آزاد اول و آخر انشا پرداز ہی انشا پرداز ہیں ۔ وہ ایک مصوّر کی طرح مُو قلم سے مرقّعوں پر مرقّع کھینچتے چلے جاتے ہیں ۔ اور اس میں ذرا شک نہیں کہ جہاں تک ذوق و شوق سے لبریز جذباتی مرقّع کشی کا تعلق ہے ، اردو ادب میں ان کا کوئی حریف نہیں ۔

(۲)

اس مختصر سے تنقیدی جائزے کے بعد جب ہم اس تصنیف پر تحقیقی نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایک عجیب مشکل کا سامنا ہوتا ہے ، جس کا بادی النظر میں کوئی مناسب حل نظر نہیں آتا ۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس تصنیف کا معتدبہ حصہ قدیم و جدید ایرانی ثقافت ، مذہبی خیالات و روایات ، روزمرہ زندگی ، مشاغل ، دل چسپیوں اور جغرافیائی کیفیات پر مشتمل ہے اور یہ سب کچھ آزاد کے مخصوص انداز میں کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ پوری تصویر اپنے اصل رنگ و روپ میں ہمارے سامنے آ جاتی ہے ۔ صرف یہی نہیں ، آزاد نے بارہا ، نہ صرف اشارۃً بلکہ صریحاً ، اس امر کا اعادہ کیا ہے کہ یہ تمام مواد ان کے ذاتی مشاہدات کی پیداوار ہے ۔ لیکن جیسا کہ آگے بتایا جائے گا ، آزاد پہلی اور آخری بار ۱۸۸۵ع میں ایران تشریف لے گئے ، اور ایران پر لکچر ۱۸۷۲ع — ۱۸۷۴ع ، یعنی سیرِ ایران سے دس بارہ برس پہلے دیے گئے ۔ ظاہر ہے کہ اس وقت انھیں ایران کا

کوئی ذاتی علم نہ تھا ۔ لیکن آزاد ان تمام اطلاعات کو ذاتی مشاہدہ بتاتے ہیں ۔ اس بوالعجبی کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے ؟

ہم نے اس سوال کا بہ نظرِ امعان مطالعہ کیا ہے اور ذیل کے دو نتائج پر پہنچے ہیں :

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ آزاد کو حکومتِ ہند نے ہدایت کی تھی کہ وہ سیاحت وسط ایشیا کو صیغہٴ راز میں رکھیں ۔ علاوہ ازیں ، اس سفر کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ اس کا انکشاف اپنے ذاتی وقار کے منافی خیال کرتے تھے ۔ اگر ان کے حریف یہ سن پاتے تو اس پر کیا کیا حاشیہ آرائیاں ہوتیں ! للہذا انھوں نے سیاحت سے واپسی پر یہ ظاہر کیا کہ وہ ایران تشریف لے گئے تھے ۔ چنانچہ ان لکچروں میں انھوں نے اپنے وسط ایشیائی مشاہدات و اطلاعات کو ایران پر منطبق کر دیا اور اس میں تردد کی کوئی بات نہ تھی ۔ اول تو ان کے قارئین کو ایران کا کوئی ذاتی علم نہ تھا ، اس لیے انھیں آزاد کی تصریحات قبول کرنے میں کیا تامل ہو سکتا تھا ؛ دوسرے ، اور یہ امر زیادہ اہم ہے کہ اس وقت ایران و وسط ایشیا کی تہذیب میں ایک واضح مشابہت تھی ۔ سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں وسط ایشیا کی تہذیب ، تہذیبِ ایران ہی کی صدائے بازگشت تھی ۔ للہذا ایک کو دوسرے پر بہ آسانی چسپاں کیا جا سکتا تھا ، اور آزاد نے یہی کیا ۔

اگر آپ اسے محض قیاس آرائی یا دور از کار مفروضہ خیال کریں تو ہم سوچنے پر مجبور ہیں کہ دریں حالات آزاد نے یہ تمام مواد کیوں کر حاصل کیا ؟

نیز آزاد نے اپنے بیانات میں ایک ایسی فاش ، لیکن پُرلطف ، غلطی بھی کی ہے جس سے ہمارے مذکورہ بالا نظریے کو (ہم اسے ابھی نظریہ ہی کہیں گے) تقویت پہنچتی ہے ۔ آزاد ایک لکچر میں ایران میں موسم سرما کی شدت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "ایک سال یہی جاڑے کا موسم تھا اور میں اسی ملک میں تھا ۔ برفیں پڑ رہی تھیں ۔ دو مہینے برابر سفر کرنا پڑا ۔ دریائے سیحوں رستے میں ملا ۔ اس پار سے اُس پار تک ایک تختہ آئینے کا تھا ۔ شتری اور اسپی قافلے پیادہ اور سوار برابر چلے جاتے تھے ۔"[٦]

کہاں ایران اور کہاں سیحوں جو ایران سے کالے کوسوں دور خجند اور

کوکان کے شمال سے ہوتا ہوا بحرِ ارال میں گرتا ہے ۔ لیکن آزاد سے بھول ہوگئی اور انھوں نے اپنا راز خود ہی فاش کر دیا ۔ یہ واقعہ انھیں وسط ایشیا میں پیش آیا تھا لیکن انھوں نے اسے سہواً ایران سے منسوب کر دیا ۔ ایران کے موسموں کے جو نظر فریب مرقعے انھوں نے پیش کیے ہیں وہ سب کے سب وسط ایشیا ہی سے متعلق ہیں ۔

اوپر کا استدلال بجائے خود ایسا مسکت اور حقیقت پسندانہ ہے کہ کسی بھی غیر متعلق شخص کو اسے قبول کرنے میں تامل نہ ہوگا ۔ لیکن یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ان کے اکثر مشاہدات ان کی اپنی کاوش کا نتیجہ نہیں ، ہمارے پاس ایک اور ناقابلِ تردید شہادت موجود ہے ، جس کی بنا پر ہم یہ بات دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ آزاد کی ایرانی معلومات بھی مستعار ہیں ۔

آزاد سے تقریباً اسّی سال پہلے انگلستان کے سفیر مقیمِ ایران ، مالکم نے تاریخِ ایران پر دو ضخیم جلدوں میں ایک نہایت خیال افروز اور پُر از معلومات تصنیف مرتّب کی تھی ۔ "سخن دان فارس" کی ترتیب و تدوین کے وقت یہ تاریخ آزاد کے پیشِ نظر تھی اور ایران کے بارے میں ان کے بہت سے اہم بیانات اسی تصنیف سے ماخوذ ہیں ۔ "سخنِ دان فارس" میں عام طور پر ان کا ترجمہ کر دیا گیا ہے ۔ صرف ایک دو جگہ ان مطالب کو اپنی زبان میں پیش کیا گیا ہے ۔

ان انکشافات کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہر وہ اطلاع جو مالکم کی کتاب میں درج نہیں ، براہِ راست وسط ایشیا سے متعلق ہے ، اور ہر وہ اطلاع جو وسط ایشیا سے متعلق نہیں ، مالکم کی کتاب سے لی گئی ہے ۔

مثال کے طور پر آزاد نے ایران کے حمّاموں کی ایک جیتی جاگتی تصویر دکھائی ہے ۔ (دیکھیے صفحہ ۱۶۷—۱۶۸) اس کا کتابِ مذکور میں کوئی ذکر نہیں ۔ للہذا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اطلاع وسط ایشیا سے متعلق ہے ۔

نیز آزاد نے ایران کی آب و ہوا اور موسموں کے جو نقوش مرتّب کیے ہیں وہ سب کے سب وسط ایشیا سے متعلق ہیں اور سراسر مشاہدہ ہیں ۔ اس منظرکشی کے بعد ، جو اردو ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتی ، انھوں نے ایران کی موسمی کیفیات کو کتابِ مذکور سے لفظ بہ لفظ نقل کر لیا ہے ، حالانکہ اس سے ان کے پہلے بیان کی تکذیب ہوتی ہے ۔

اب اگر یہ پوچھا جائے کہ آزاد کے ہم عصر اس غلطی میں کیوں کر مبتلا ہوئے کہ آزاد واقعی ایران تشریف لے گئے تھے ؟ تو اس کا جواب ظاہر ہے : انھیں ایسا ہی بتایا گیا تھا ۔

لیکن پوچھا جائے گا کہ ''سیر ایران'' کی اشاعت پر انھیں اپنی غلطی کا کیوں احساس نہ ہوا ۔ اس کا جواب نہایت آسان ہے : ''سیر ایران'' کی اشاعت آزاد کی وفات کے بعد ہوئی اور یہ بیانات تمام تر زمانہ ما قبل سے متعلق ہیں ۔

(۳)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب مشرقی علوم کی بجائے مغربی علوم کی ترویج کا نظریہ ناکام ثابت ہوا تو کس طرح ملک بھر میں سیاست دان اور ماہرین تعلیم مقامی ادب کو مغربی نہج پر ترقی دینے کے مسئلے پر غور کرنے لگے ۔ اس پالیسی کے تحت لاہور میں شاعری کا جو نیا مکتب وجود میں آیا ، ایسا نہ تھا جسے خود رو یعنی قومی تقاضوں کا قدرتی نتیجہ قرار دیا جا سکے ۔ یہ اجنبی پودا تھا جسے حکومت ہی کے ایما پر لگایا گیا تھا اور وہی اس کو پروان چڑھانے میں کوشاں تھی ، یہ تحریک ایک طرح زمانے کے تقاضوں اور رجحانات کے مطابق تھی ، لیکن کچھ وقت سے پہلے ہی بروئے کار آ گئی ۔ اور اگر حکومت کی نظر عنایت نہ ہوتی تو ممکن ہے اس کی نمود کافی عرصے تک التوا میں پڑی رہتی ۔

اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ آزاد کو اس شرف سے محروم کیا جائے جو انھیں پنجاب کی ادبی تحریک کی ترویج کے سلسلے میں حاصل ہے ۔ ہمارا مقصد صرف اس امر واقع کی طرف توجہ کرانا ہے کہ یہ تحریک حکومت کے منشا کے مطابق بروئے کار آئی ، اور ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر آزاد کو سرکاری حمایت حاصل نہ ہوتی تو وہ اس طرح پرانے مدرسہ ٔ ادب کی مخالفت نہ کرتے ۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد اور حالی اس موقع پر خود نہیں آئے بلکہ لائے گئے تھے ۔ اور وہ جو کچھ کر رہے تھے دوسروں کے اشارے پر کر رہے تھے ۔ چنانچہ ۱۸۷۴ع کے تاریخی لکچر میں آزاد کا تمام تر حکومت کی ترجمانی کرنا "کوہ نور" مورخہ ۱٦ جون

۱۸۷۴ء کے اس اقتباس سے ظاہر ہے:

تقریر صاحب ڈائرکٹر بہادر:

"یہ جلسہ اس لیے منعقد کیا گیا ہے کہ نظم اردو، جو چند عوارض کے سبب سے تنزّل اور بد حالی میں پڑی ہے، اس کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے جائیں۔ اسی واسطے جملہ رؤسا اور اہلِ علم اور ان لوگوں سے، جو شعر و سخن اور تصانیف سے لطف اٹھاتے ہیں، درخواست کی جاتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس کی طرف توجہ کریں ... نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کو جو اس امر کی طرف توجہِ خاص ہے، وہ صاحب سکرٹری گورنمنٹ پنجاب کی تحریر سے واضح ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

'جناب لفٹنٹ گورنر بہادر اب ایک اور امر کی نسبت ہدایت فرماتے ہیں جس کا کمیٹی[۶] نے کچھ ذکر نہیں کیا اور جو ممدوح کے نزدیک اس ملک کے سر رشتہ[۷] تعلیم کے افسروں کے لیے قابلِ غور ہے۔ وہ یہ ہے کہ اردو کی پڑھائی کی کتابیں، جو بالفعل رائج ہیں یا جن کے پڑھانے کی کمیٹی نے سفارش کی ہے، ان میں اردو نظم بالکل نہیں۔ مگر اس میں کچھ کلام نہیں کہ نظم عمدہ وسیلہ تعلیم کا ہے اور طرح طرح کے دیسی راگ اور گیت، جو اس ملک میں رائج ہیں جن میں سے بعض کو مراثی لوگ دیہاتی مجمعوں میں گاتے ہیں یا موروثی بھاٹ کہتے ہیں اور بعض کو لوگ خود اپنے گھروں میں شادی و غم کے موقع پر گاتے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ ملک شادی و غم اور ہجو کے اظہار کرنے میں نظم کی کتنی قدر اور اس کا کس قدر استعمال کرتے ہیں۔ نظربرآں حسب الہدایت آپ کو کہا جاتا ہے، یعنی آپ اس بات پر غور کریں کہ ہمارے دیہاتی اور ضلع مدارس میں ایک منتخبات اردو نظم جس میں اخلاق، نصیحت اور ہر ایک کیفیت کی تصویر کھینچی گئی ہو، کیا پڑھائی میں داخل نہیں ہو سکتی؟ اس قسم کا انتخاب سودا، میر تقی، مسکین، ذوق یا غالب کے تصانیف سے مرتّب ہو سکے گا۔ اگر شعرائے مذکورہ بالا کے دیوان یا اور

مثنوی ہائے موجودہ سے انتخاب نہ ہو سکے تو حسب الہدایت دریافت کیا جاتا ہے کہ شعرائے زمانۂ حال سے خاص مدارس کے استعمال کے لیے ایک ایسی نظم کی تصنیف کا سرانجام ہو سکتا ہے یا نہیں ؟ اگر اس طور پر مدارسِ سرکاری کے وسیلے سے دیسی نظم غیر مذہبی کی تہذیب ہو جائے اور واہیات نظم ، جو بالفعل بہت جاری ہے ، رفتہ رفتہ اس کی جگہ قائم ہو جائے تو بہت ہی عمدہ بات ہوگی۔"

اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے ڈائرکٹر نے کہا :

"اب میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ جس طرح ہر شہر میں عموماً شاعری ہوا کرتی ہے ، آپ بھی ایک مشاعرہ مقرر کریں ۔ مگر اتنا ہو کہ یہاں بجائے طرح مصرع کوئی مضمون خاص ملا کرے کہ اسی پر سب لوگ طبع آزمائی کر کے لایا کریں اور جلسۂ عام میں سنایا کریں ۔ میرا جی چاہتا ہے کہ جب یہ سلسلہ جاری ہو جائے تو سال بھر کے بعد جن کے کلام سب سے انتخاب ہوں ان کے لیے ایک خاص طور پر انعام و اکرام بھی تجویز کیے جائیں ۔ جو تجویز میں نے آپ کے رو برو پیش کی ہے اگر وہ خاطر خواہ عمل میں آئے تو ۱۸۷۴ع ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا اور لوگ کہیں گے کہ نظم اردو کی طرزِ قدیم کن کن اشخاص کی سعی و کوشش سے چاہِ تنزل سے نکل کر اوجِ ترقی پر پہنچی ۔ میری یہ رائے ہے کہ مہینے بھر کے بعد یہ جلسہ ہوا کرے اور اب کی دفعہ جو جلسہ ہو سب اہلِ سخن ایک نظم ''برسات'' کی تعریف میں کہیں ۔''

اس موقع پر آزاد کی تقریر کو پرانی شاعری کے عیوب اور خامیوں پر ایک ادبی اور تاریخی منشور کی حیثیت حاصل ہے ۔ اس میں آزاد اندھا دھند فارسی شعرا کی خصوصیات مستعار لینے اور شاعری میں فصاحت و بلاغت کے پُر تصنع مذاق کی شکایت کرتے ہیں ۔ ان کے الفاظ میں :

''فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغہ اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اڑے ۔ قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے ۔ لفاظی اور شوکت کے الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھ گئے اور استعاروں کی تہ میں ڈوب کر

غائب ہوگئے ۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم ، کسی شے پر رغبت یا اس سے نفرت ، کسی شے سے خوف و خطر یا کسی پر قہر و غضب ، غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو اس کے بیان سے وہی اثر وہی جذبہ وہی جوش سننے والوں کے دلوں پر چھا جائے ۔"

شاعری پر تنقید کرتے ہوئے انھوں نے واضح کیا ہے کہ کس طرح شاعری بعض بے کار مضامین تک محدود ہوگئی ہے :

"یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں اور بعض دفعہ ایسے پیچیدہ اور دور از کار استعاروں میں ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی ۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ان حدود سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اٹھا سکتے ۔ یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو بدمزہ ہو جاتے ہیں ۔"

آخر میں فرماتے ہیں :

"اگرچہ مدت سے مجھے اور اکثر اہل وطن کو اس کا خیال ہے مگر اب اس تقریر میں زیادہ زور دینے کا باعث یہ ہے کہ میں دیکھتا ہوں کہ آج کل ہماری گورنمنٹ کو اور اس کے ارا کین کو اس طرف توجہ ہے جو ہماری تعلیم و اصلاح کا دل و جان سے ذمہ اٹھائے ہوئے ہیں ۔ سچ پوچھو تو یہ ہمارے انشا کے ستارۂ اقبال کی ساعت ہے ۔ اس موقع پر ہماری تھوڑی کوشش بہت اثر کرے گی ۔"

بسا اوقات ایک زمانے کا کفر دوسرے زمانے کا ایمان قرار پاتا ہے ۔ آزاد کے ارشادات ، جنھیں تنقید میں مبادیات کا درجہ حاصل ہے ، ان کے زمانے میں شطحیات سے کم نہ تھے ۔ چنانچہ اخبارات میں اُن کے خلاف مخالفت کا طوفان برپا ہوگیا ۔ جیسا کہ عموماً ہوتا ہے ، کتنے ہی ذاتی اور غیر ادبی امور کو ادبی قدامت پسندی کے ساتھ گڈمڈ کرکے اظہار ناپسندیدگی کو شدید سے شدید تر بنانے کی کوشش کی گئی ۔ معتمدِ انجمن اور مددگار پروفیسر کی حیثیت سے بلند مقام ، حکام کے ساتھ گہرا ربط اور اثر و رسوخ اور طبیعت میں لچک کا فقدان ، جسے غرور و تکبّر سے تعبیر کیا جاتا تھا ، یہ سب مل کر ان کے خلاف ہنگامہ آرائی کا باعث ہوئے ۔ ان کا بدترین مخالف "پنجابی اخبار" تھا ۔ ذیل میں "کوہ نور"[7] سے ایک اقتباس

پیش کیا جاتا ہے جس سے اس مخالفت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ''کوہ نور'' کا مضمون دراصل پہلے ''پنجابی اخبار''[۸] میں شائع ہوا تھا:

بلند پروازی اچھی نہیں ہوتی

'پنجابی اخبار' مطبوعہ ۱۰ - اکتوبر میں ذوق کے کسی لئیق شاگرد نے آزاد کی مثنوی 'صبح اُمید' کا ریویو کیا ہے۔ اس سے جس قدر صاحبِ مضمون کی لیاقت کا ثبوت ملتا ہے اس سے زیادہ آزاد صاحب کی ہرزہ سرائیوں کا اظہار ہوتا ہے۔

اکثر اہلِ علم و فضل تو آزاد کی علمی لیاقتوں کو بھی کچھ وقعت نہیں دیتے، مگر زمانے کی حالت دیکھ کر ہم نے ان کو مولوی مان لیا تھا اور ان کی طلاقتِ زبان کے صدقے میں ان کے کلام کو بھی ایک دو مرتبہ 'پر زور کہہ دیا۔ لیکن اس ریویو نے ہماری تمام امیدیں قطع کر دیں۔ عالی دماغ نکتہ چین نے ایسے ایسے اعتراض کیے ہیں جو فی الواقع بدیہی ہیں اور آزاد کی پریشاں خیالی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اعتراض مذکورہ اس قسم کے ہیں کہ ان سے بے تامل آزاد کی فصاحت اور بلاغت بلکہ علمیت پر بھی حرف آتا ہے۔ اور یہ بیان اس پر طرّہ ہے کہ آزاد شیخ ذوق مغفور کے شاگرد نہیں ہیں، جن کی شاگردی سے ان کو فخر تھا۔

ہماری رائے یہ ہے کہ آزاد صاحب کچھ پڑھے لکھے بھی ہیں اور طبیعت بھی بری نہیں رکھتے۔ مگر بلند پروازیاں اُن کو سر اُٹھانے نہیں دیتیں۔ اگر سوچ سمجھ کر لکھا کریں تو ان کے کلام سے ہمارے مشاعرے کو شاید بہت عزت ہے۔ ہم اپنے اخبار کے ناظرین کے تفننِ طبع کے لیے مضمونِ مذکورۃ الصدر ''منقولات'' میں نقل کرتے ہیں:

''پہلے اس سے کہ میں اس مثنوی پر کچھ لکھوں، میں تھوڑا حال اپنا اور صاحبِ مثنوی کا گزارش کرتا ہوں۔ بندہ دلی کا رہنے والا اور شیخ محمد ابراہیم کا ایک ادنٰی شاگرد ہے۔ برسوں اپنا کلام استاد

مرحوم کو دکھایا ہے اور بڑے بڑے معرکے کے شاعروں میں ان کے ساتھ رہا ہے۔ استاد کا کوئی نامی شاگرد ایسا نہیں جس کو میں نہ جانتا ہوں ... باوجود ان سب باتوں کے میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے مولوی محمد حسین آزاد کو نہ کبھی استاد کے سامنے غزل لاتے دیکھا، نہ کسی مشاعرے میں ان کے ساتھ پڑھتے سنا۔ یہ اور بات ہے کہ مولوی محمد باقر استاد کے بڑے گاڑھے دوست تھے۔ شاید اس لحاظ سے استاد ان کو اپنا پیارا بھتیجا جانتے ہوں۔ مگر استاد کا بھتیجا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ان کے شاگرد رشید بھی بن جائیں۔ خیر ہم نے ان سب باتوں پر خاک ڈالی۔ کاش مولوی صاحب کو شاعری سے کچھ مناسبت ہی ہوتی تو بھی استادی شاگردی کا دعویٰ ان کے چہرے پر کھل جاتا۔ جب یہ بھی نہیں تو میں حیران ہوں کہ یہ بزرگ کیوں لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہوتے ہیں اور کس واسطے لوگوں سے اپنا خاکہ اڑواتے اور کس لیے دہلی اور اہلِ دہلی کا نام بدنام کرتے ہیں۔ سنو صاحب! یہ کچھ برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ آپ فاضل، آپ منشی، آپ پروفیسر، آپ کی کتابیں سرکاری مدرسوں کی پڑھائی میں داخل۔ جب اتنی فضیلتیں آپ میں جمع ہیں تو پھر کیا ضرور ہے کہ آپ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شریک ہوں ... بھائی! شاعری بڑا ہی بُرا فن ہے۔ تم کیا ہو، ہم نے بڑے بڑوں کو سر کے بل گرتے دیکھا ہے۔ آج تک جتنا تمھارا کلام چھپ چکا ہے اس میں ایسے مصرعے بہت ہی کم پائے ہیں جن کو سن کر انسان خاموش رہے، ورنہ ہر شعر سن کر بے تامل ہنسی آتی ہے۔

خصوصاً مثنوی 'امید' میں تو تم نے ایسا بھکنا شروع کیا کہ ساری مثنوی کو مجذوب کی بڑ کر دیا ہے۔ ساری مثنوی میں الفاظ ہی الفاظ نظر آتے ہیں، معنی کا نام و نشان نہیں۔ اس کے سوا بیان ایسا پھسیڈا ہے جس کو سن کر دھنیے جولاہے بھی ہنستے ہیں۔ اگر تم کو میرے کہنے کا یقین نہیں آتا تو ذرا غور سے ان چند شعروں کو دیکھو جو بطور نمونے کے ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔"

مثنوی پر جو تنقید کی گئی ہے اُس کے جستہ جستہ حصے حسبِ ذیل ہیں :

(١) گرچہ تھا پاؤں اٹھانے کا نہ یارا دل کو
کوئی دیتا تھا مگر ایسا سہارا دل کو

عقل ہرچند یہ کہتی تھی کہ ہے دور بہت
دل یہ کہتا تھا کہ ہمت میں ہے مقدور بہت

پہلے شعر میں ''ایسا سہارا'' کا لفظ سن کر سامع کو یہ انتظار ہوتا ہے کہ اگلے شعر میں اس ''سہارے'' کا اندازہ بیان کیا جائےگا مگر دوسرا شعر سن کر اس کا دل سرد ہو جاتا ہے - شاید کاتب وہ شعر لکھنا بھول گیا جس میں سہارے کا بیان تھا -"

[یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں کہ اس اعتراض کے بعد آزاد نے دوسرے مصرعے کو اس طرح بدل دیا :

کہ جو میدان نظر آ رہا تھا دور بہت
دل یہ کہتا تھا کہ ہمت میں ہے مقدور بہت

بعد میں اسے اور بھی بدل کر یوں کر دیا :

کہ چڑھائی جو نظر آ رہی تھی دور بہت]

(٢) دل اس آواز پہ اس طرح کھنچے جاتے ہیں
جیسے ذرے سوئے خورشید اڑے جاتے ہیں

میں نے آج تک کسی بازاری کو بھی اس طرح بات چیت کرتے نہیں سنا کہ بگھی اس طرح دوڑی جاتی تھی جیسے ریل اڑی جاتی تھی - یا تو یوں بولتے ہیں کہ گویا ریل اڑی جاتی تھی یا یوں کہتے ہیں کہ جیسے ریل اڑتی ہے یا جیسے ریل اڑی جاتی ہو -

(٣) اُس طرف میرا بھی یوں آہ دلِ زار چلا
جیسے بلبل سوئے گل، کبک سوئے ماہ چلا

پھر وہی ٹھوکر لگی ہے - دوسرے مصرع میں چلے کی جگہ چلا فرما گئے -

(٤) غور کی رازِ نہفتہ میں بہت سی میں نے
شجرِ چتر پہ لیکن جو نظر کی میں نے

میں نے ساری لغت کی کتابیں دیکھیں مگر یہ نہ کھلا کہ شجرِ چتر
کس درخت کو کہتے ہیں ۔

(۵) دیکھتا کیا ہوں کہ بیٹھا ہے ہمائے اقبال
دونوں پر کھولے ہوئے ہے بہ ہوائے اقبال

'ہمائے اقبال' سے مراد غالباً خود اقبال ہی ہوگا ۔ پھر نہیں معلوم کہ دوسرے مصرع میں وہ کون سا اقبال ہے جس کی خواہش میں خود اقبال پر کھولے بیٹھا ہے ؟

(۶) تارِ برق سے سوا حکم ترا چلتا ہے
دیکھا جس ملک میں واں سکّہ ترا چلتا ہے

بھائی آزاد ! شرم کی جگہ ہے ۔ ذوق کا شاگر اور دلی کا رہنے والا اور مولوی محمد باقر کا بیٹا اور پھر ایسی موٹی غلطی کرے جس کے ظاہر کرنے سے ہم کو خود شرم آتی ہے ۔ حضور! یہ تو ارشاد ہو کہ 'حکم' کا قافیہ دوسرے مصرع میں کہاں ہے ؟ یہاں تو سہوِ کاتب کا عذر بھی پیش نہ جائے گا ۔ ایسا لفظ کہاں سے لاؤ گے جو 'حکم' کا قافیہ ہو سکے گا ۔ بھائی تمھاری طبیعت کو شاعری سے بالکل مناسبت نہیں ۔ بس بہت اپنا خاکہ اڑوا چکے ، اب باز آؤ اور شاعروں کی فہرست سے اپنا نام کٹواؤ ۔

(۷) جامِ دل ، خونِ شجاعت سے چھلک جاتے ہیں
نعرۂ اہلِ وغا تا بہ فلک جاتے ہیں

خونِ شجاعت سے اگر شجاعت کا مار ڈالنا مراد ہے تو شعر کے معنی ؟ ورنہ خونِ شجاعت کے معنی ارشاد ہوں ۔

(۸) آبِ شمشیر کو شربت کی طرح پیتے ہیں
اور جو مرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم جیتے ہیں

دوسرے مصرع سے شاید یہ مراد ہے کہ وہ موت کو زندگی سمجھتے ہیں ۔ مگر اس مصرع سے یہ معنی کوئی ہمیں سا روشن ضمیر سمجھے تو سمجھے ۔ ہاں اگر اس کی جگہ یہ ہوتا کہ 'ہم جی جاتے ہیں' ؟

بھی مضائقہ نہیں تھا۔

(۹) جامِ ہمت جو اُسے 'تونے ہیں پلوائے ہوئے
کوسوں اک دم میں لیے جاتے ہیں دوڑائے ہوئے

پہلے مصرع میں ''پلوائے ہوئے'' خدا جانے کہاں کی بول چال ہے۔ ہم نے تو اپنی یاد میں کسی دلی والے کو اس طرح بولتے نہیں دیکھا کہ تونے پلوائے ہوئے ہیں یا تونے کھلائے ہوئے ہیں۔ مگر تم نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، کہیں پنجاب یا ترکستان میں ایسا سنا ہوگا۔

(۱۰) کہ جسے آب سمجھتا تھا نہیں آب ہے یہ
سرِ دریائے فنا موت کا گرداب ہے یہ

گرداب دریا کے بیچ میں ہوتا ہے نہ کہ کنارے پر۔''

ہمیں آزاد کی مثنوی 'زمستان' پر بھی ایک تبصرہ ملا ہے جس میں ایڈیٹر نے شاعر کا خوب مذاق آڑانے کے بعد کہا ہے کہ ''یہ تبصرہ اس لیے شائع کیا جا رہا ہے کہ آزاد اپنی بگڑی ہوئی زبان اور پوچ خیالات کی درستی میں کوشش کرے۔'' اعتراضات کے چند نمونے یہ ہیں:

شرق تا غرب ترا ملک ہے ہر طرف سفید
اُڑ رہا پرچمِ اقبال ہے جوں برف سفید

کیا غضب ہے! شرق تا غرب بچہ بھی نہیں بولتا۔ شرق سے غرب تک اور شرق سے لے کر غرب تک اردو میں صحیح ہے اور از شرق تا غرب فارسی میں۔ مدرسے کی بولی کی ہم کو خبر نہیں۔

گل و گلزار نظر آتے ہیں ویران سارے

گلزار کی ویرانی صحیح۔ مگر حضرت! گل کی ویرانی کون بولتا ہے۔ گل کیا اجڑے گا، مرجھانا کہیے، کمھلانا فرمائیے، سوکھ جانا لکھیے۔

یا الٰہی وہ جوانانِ چمن ہوگئے کیا
باغ سنسان ہے، مرغانِ چمن ہوگئے کیا

لله مجھ کو بتلائیے کہ 'جوانان' اور 'مرغان' کا قافیہ کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔ حضرت! شاید آپ نے کبھی سنا ہو یہ ایطائے جلی ہے جو ایک شعر میں قطعاً ممنوع ہے۔ دونوں میں الف نون جمع کا ہے اور اس کے حذف کے بعد 'جوان' اور 'مرغ' باقی رہتا ہے۔ اگر آپ کے نزدیک 'جوان' اور 'مرغ' کا قافیہ درست ہے تو 'جوانان' اور 'مرغان' کا بھی ہوگا۔ یہ بات آئندہ بھی یاد رکھیے گا۔

کی تری رات نے داناؤں کی ہے بات بڑی
کہ کبھی دن ہیں بڑے اور کبھی رات بڑی

حضرت سلامت! محاورہ تو یہ ہے "کبھی کے دن بڑے کبھی کے رات۔"

بزمِ احباب کی صحبت کا مزا ہے تجھ سے

اب تو مجھ کو بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ خدا کے لیے اس فضیلت پر یہ خرافات۔ "بزمِ احباب کی یہ صحبت" اے حضرت! صحبتِ احباب کہو یا بزمِ احباب۔ بلا سے یوں ہی لکھتے: ملتا احباب کی صحبت کا مزہ ہے تجھ سے۔

چائیں پی پی کے ترے سر کو دعا کرتے ہیں

جان کو دعا دینا تو سنا ہے مگر سر کو دعا دینا اردو میں حضرت ہی کا محاورہ ہے۔ دوسرے دعا کا استعمال ایسے موقع پر "دینے" کے ساتھ ہے نہ ''کرنے'' کے ساتھ۔ ذرا تو تامل کو کام فرمایا کیجیے۔

بزمِ دربار میں ہیں صاحبِ فرماں آئے

''بزمِ دربار!'' کیا اچھی ترکیب ہے۔ قربان اس لیاقت و قابلیت کے۔"

یہ اس زمانے کی مکتبی تنقید کے بہت اچھے نمونے ہیں جنھیں آزاد کو کسی نہ کسی طرح نیچا دکھانے کی خواہش نے اور بھی تند و تیز کر دیا ہے۔ اس وقت ادب کی جانچ پرکھ صرف زبان اور قواعد و ضوابط کی کڑی پابندی کے اعتبار سے کی جاتی تھی۔ اسی شدید تقاضے کے باعث ایران اور ہندوستان میں استادی شاگردی کا سلسلہ ناگزیر ہو گیا تھا۔ اور بڑے بڑے نامور شاعر سنِ شعور تک پہنچنے سے پہلے اپنا کلام تصحیح کے بغیر مشاعرے میں پڑھنے

سے گریز کرتے تھے۔ شاعری کے جدید معیار کے مطابق نفسِ مضمون کو وہی اہمیت حاصل ہے جو اسلوب یا ہیئت کو اور محض فنی مہارت اور زبان پر قدرت کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ کلام کی برجستگی اور حسن و خوبی ہی محاورے سے انحراف کا جواز ہے۔ بے شک جس تنقید کے نمونے اوپر دیے گئے ہیں وہ کلام میں ِمین میکھ نکالنے کے سوا اور کچھ نہیں اور بعض اعتراض خاصے لغو ہیں۔ مثلاً چوتھا اور ساتواں شعر بالکل معقول اور قابلِ فہم ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اکثر قارئین آٹھویں شعر پر اعتراض کو ''شعر مرا بمدرسہ کہ برد'' کا مصداق قرار دیں گے۔ دسویں اور بارھویں شعر پر تنقید نری موشگافی ہے اس لیے غیر معقول۔ زبان اقلیدس تو نہیں کہ اس کے بنے بنائے سانچے ہوں اور ان میں کسی قسم کا تصرّف نہ ہو سکے۔ پھر بھی اس میں کلام نہیں کہ بعض اشعار میں آزاد سے سہو بھی ہوا ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ یہ اشعار بعض قارئین کی نظر میں اس لیے بھی انگشت نما ہوں کہ دوسری شاعرانہ خوبیاں، جو ان اسقام کا اثر زائل کر سکیں، موجود نہیں۔

خبر نہیں آزاد اور ان کے رفقا دوسروں کو اپنا ہم نوا بنانے میں کامیاب ہوئے یا نہیں لیکن مشاعرہ گرتے پڑتے جاری رہا اور تقریباً ایک سال کی ہنگامہ آرائیوں کے بعد گم نامی کی موت مر گیا۔ جو بھی صورت تھی، اس کی ایک واضح جھلک اُس مشاعرے کی روداد میں نظر آتی ہے جو انجمن کا آخری مشاعرہ ثابت ہوا:

''اس مشاعرے کو شروع ہوئے چند ماہ ہوئے اور بر وقت شروع ہونے کے حکام نے ظاہر کیا تھا کہ اس مشاعرے کے جو عمدہ شاعر ہوں گے ان کو بشرطِ پسند اور کمیٹی کی تجویز سے انعام اور بلکہ کچھ ماہوار دیا جائے گا۔ سو اس میں کئی شاعر ایسے شریک ہوئے کہ جن کی معاش شاعری وغیرہ پر منحصر ہے اور کتنے ہی ایسے تھے کہ جو صرف اپنے شوق اور ناموری کے لیے شریک ہوئے تھے۔ چنانچہ ان شاعروں میں ایک شاعر آزاد مولوی محمد حسین صاحب جو کہ سر رشتۂ تعلیم میں عربی کے پروفیسر ہیں اور بجائے خود اپنے تئیں لاثانی تصور کرتے ہیں۔ گو دو ایک اور شاعر اس مشاعرے میں ایسے تھے کہ جن کی حکام بھی تعریف کرتے تھے اور لوگوں کے

نزدیک بھی اچھے خیال کیے جاتے تھے اور ان لوگوں کے روبرو مولوی محمد حسین آزاد کی کچھ دال نہ گلتی تھی اور نہ بیچارے کو شاعری میں رسوخ ہوتا تھا - اور ادھر کئی اخباروں میں ان کی ایسی خبر لی گئی کہ ساری ہی شاعری کا قافیہ تنگ ہوگیا - چنانچہ خاص کر کے "پنجابی اخبار" نے تو اپنا فرض سمجھ لیا ہے کہ ہر مشاعرہ کے جلسے کے بعد کچھ نہ کچھ آزاد صاحب کے حق میں خود ہی لکھ دیتا ہے جس کو اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان میں ضرور کسی ذاتی معاملے میں کبھی ناچاق ہو چکی ہے جو ہمیشہ ایسا لکھ دیتا ہے - گو یہ سہی کہ بعض شعر آزاد کے قابلِ اعتراض ہوتے ہیں لیکن نہ ایسے کہ کل شاعروں کو چھوڑ کر صرف آزاد ہی کو دبانا - لیکن ہاں خرابی یہ ہے کہ آزاد صاحب کا ایک تو عہدہ ایسا ہے، دوسرے ان کی خود بینی نے یہ کر رکھا ہے - اب تھوڑے عرصے سے آزاد صاحب نے ایسے طریقے و ڈھنگ، نامی شاعروں سے برتے کہ جو اچھے شاعر تھے، انھوں نے اس مشاعرے میں مثنوی کہنا اور شریک ہونا موقوف کردیا - اور آزاد صاحب نے دو ایک شاعر جیسے خواجہ الطاف حسین حالی وغیرہ سے ایک رنجیدگی ظاہر کی اور بلکہ صاحب سلامت بھی ترک کردی - آزاد صاحب کے اوصافِ حمیدہ ایسے ہیں کہ جو شخص ان سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے وہ ان سے ویسا ہی پیش آتا ہے - ان کا یہ حال ہے کہ ظاہر میں تو ہر ایک سے بہت تپاک سے پیش آتے ہیں اور باطن میں خدا حافظ - ہر ایک کی دوسرے سے کچھ نہ کچھ برائی کرنا جس سے اپنے تئیں کچھ فائدہ نظر نہیں آتا، یہ ان کا ایک ضروری فرض ہے - اب لاہور کے لوگ ان کو خوب پہچان گئے - ظاہر میں تو اکثر لوگ راضی کر دیتے ہیں اور باطن میں ان کو سب نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں - اب کے بتاریخ ١٣ کو جو مشاعرہ انجمن میں ہوا تو کل شاعروں میں کوئی نامی شاعر نہ تھا - اس سبب سے اب کے آزاد صاحب نے خوب چمک کر اور دل کھول کر اپنی مثنوی پڑھی - گو اب کے جلسے میں آزاد صاحب سے بڑھ کر نامی شاعر اور کوئی نہ تھا، لیکن اب کا

جلسہ ایسا بے رونق بنا کہ سابق میں ایسا نہیں ہوا تھا ۔ نہ تو کوئی عمدہ شاعر تھا اور نہ اعلیٰ درجے کے شائقین تھے... رفیق نے اب کی دفعہ جو تہذیب کے مضمون کی مثنوی سنائی تو اس میں اخبار والوں کو بھی کچھ سنایا ۔ اور اس کے پڑھنے کے اوپر سکرٹری صاحب نے ایستادہ ہو کر رفیق سے کہا کہ اخباروں کی بابت یا کسی خاص کی بابت کچھ پڑھنا نہ چاہیے جس پر رفیق کو ذرا تیش آیا اور سب کو منصف ٹھہرا کر برابر اس کو پڑھتا گیا ۔ اور اس کے مضمون سے پایا جاتا تھا کہ وہ 'پنجابی اخبار' کو آوازہ صاف کس رہا تھا ۔ حقیقت میں انجمن کے جلسے میں ایسا مضمون پڑھنا نامناسب ہے ۔ آیندہ امید ہے کہ اگر آزاد صاحب کا قدم اس جلسے میں رہا تو کوئی نامی شاعر اس میں شریک نہ ہوگا ۔ سنا گیا کہ ہما اور عطا اور رفیق کو ڈائرکٹر صاحب نے اپنی کوٹھی پر مولوی محمد حسین آزاد کی معرفت انعام دیا ۔ اب یہاں بھی یہ پایا جاتا ہے کہ جس کی سفارش آزاد صاحب نے کی اس کو انعام ملا اور آزاد صاحب نے انعام تھوڑا خیال کرکے خود شاید لینا منظور نہ کیا ۔ اس جلسے کے واسطے بڑا افسوس یہ ہے کہ اب عمدہ شاعر اس میں شاید شریک نہ ہوں گے اور جو گورنمنٹ کا منشا اس مشاعرہ کے مقرر کرنے کا تھا وہ پورا نہ ہوگا ۔ اب اس مشاعرے میں آج کل لونڈے شاعر آتے ہیں ۔ کوئی کنجڑہ ہے اور کوئی حلوائی وغیرہ ہے جن میں آزاد صاحب عمدہ شاعر تصور ہو سکتے ہیں ۔"

مشاعرے کی سرگرمیوں کے جس چیز سے ٹھنڈا پڑ جانے کا اندیشہ تھا وہ کوئی عارضی بات نہ تھی ۔ اس کا خاتمہ مخالفانہ اعتراضات سے نہیں ہوا ، یہ صرف اس لیے ناکام رہا کہ اس میں جو شاعری پیش کی جاتی تھی وہ سراسر آورد تھی اور لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے سے قاصر تھی ۔

محولہ بالا خط سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مشاعرے میں آزاد کو جو نمایاں حیثیت حاصل تھی اس کا دوسرے شاعروں نے برا مانا اور بعض ممتاز شعرا نے برگشتہ خاطر ہوکر مشاعرے ہی سے کنارہ کشی اختیار کرلی ۔ انھیں آزاد کا

تابع مہمل بننا گوارہ نہ تھا ۔ اس سے مخالف فریق کا زور اور بھی بڑھ گیا ۔ علاوہ ازیں یہ بھی شہادت ملتی ہے کہ آزاد کو نئی پود میں سے کچھ ایسے شوریدہ سر مل گئے تھے جو اخبار نویسوں سے بر سر پیکار تھے اور انھیں جلی کٹی سنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے ۔ اس سے بارگاہِ صحافت کے مسند نشینوں کا بڑا اہمان ہوا اور انھوں نے بیزار ہو کر مشاعرے میں جانا ترک کر دیا ۔

آزاد نے مشاعرے کے لیے کل گیارہ نظمیں لکھیں جو ان کے بستوں میں پڑی رہیں ۔ کہیں ۱۸۹۹ع میں جا کر ان کے صاحب زادے نے ان کی طباعت کا انتظام کیا ۔

(۴)

کرنل ہالرائڈ اصلاحِ سخن کا دائرہ صرف پنجاب ہی تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے ، وہ اسے بیرونِ پنجاب پھیلانے کے خواہاں تھے ۔ ان کی التماس پر ڈائرکٹر تعلیماتِ عامہ لکھنؤ نے آزاد کا لیکچر شائع کیا اور اسے اپنے صوبے کے ادبی حلقوں میں تقسیم کیا ۔ اس کا وہی نتیجہ ہوا جس کی توقع تھی ۔ وہاں کے لوگ تو پرانے شعرا کو مسلّم الثبوت استاد اور ائمہ فن خیال کرتے تھے ، انھوں نے آزاد کو ان کی عظمت سے انکار کرتے اور ان کے مسلک سے انحراف کرتے دیکھا تو اس تنقید کو شدید گستاخی پر محمول کیا ۔ اخبار "سر رشتہ تعلیم" لکھنؤ کے مدیر نے لیکچر پر طویل تبصرہ کرتے ہوئے اصلاح و تجدید کی تجویز کو شیخ چلی کا منصوبہ قرار دیا ۔ وہ لکھتا ہے :

"اردو نظم کا حصر مضامینِ عاشقانہ پر ہرگز نہیں ہے اور ہر قسم اور ہر رنگ کے مضامین اس عمدگی اور لطافت کے ساتھ نظم ہو چکے ہیں اور نظم ہوتے جاتے ہیں کہ اگر سو کمیٹیاں ایسی ایسی مقرر ہوں اور سو برس تک ایسی بے سود کوششیں کریں اور لاکھ روپیہ انعام دیں تو بھی اس سے بہتر نظم نہ ہو سکے گا ۔"

اس کے بعد وہ نہایت فاتحانہ انداز میں انیس اور دبیر کی شاعری کی طرف توجہ دلاتا ہے اور آزاد کو مشورہ دیتا ہے کہ :

"ان دونوں صاحبوں کے کلام کو جمع کرکے نظر تفصیلی سے دیکھیں کہ جن عیوب کے وہ شاکی ہیں ان سے ان کا کلام مبّرا اور جن محاسن کے وہ خواہاں ہیں ان سے آراستہ ہے یا نہیں ۔ اگر مولوی صاحب کو کچھ بھی مذاقِ شعر ہوگا تو ان حضرات کے کلام کو مدارسِ سرکاری میں جاری کرنے کا مشورہ دیں گے اور ذوق اور غالب اور سودا وغیرہ کے قصائد کو نظم اردو کا محک قرار دیں گے ۔"

یہاں اس شائستہ جواب کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو لکھنو کے ایک مدرس منشی گوردھن لال کی طرف سے اس رسالے میں شائع ہوا ۔ آزاد کی تائید کرتے ہوئے وہ شعرائے سلف کو ہدفِ تنقید بنانے میں ان کے ہم نوا نہیں ۔ استدلال یہ ہے کہ کلاسیکی شاعری میں ہر قسم کے موضوعات کا حق ادا کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''اس شہر لکھنؤ میں ابھی تک باوجود عدمِ پرسش کے مثل منشی [جلال ؟] امیر اور میاں بحر صاحب و مرزا دبیر اور انیس صاحب اور سوا ان کے اور شاعر موجود ہیں جن کے کلام ایسے ہی ہیں جیسا صاحب سکرٹری بہادر تحریر فرماتے ہیں ۔"

آخر میں آزاد نے جو ایک 'دوں کی لی تھی ، مبتّصر نے اس کا بھی پول کھول دیا ہے ۔ آزاد کا افتتاحی لکچر جس طرح ابتدا میں شائع ہوا تھا ، اس کے آخری الفاظ یہ تھے :

''چنانچہ ایک مثنوی جو رات کی حالت پر میں نے لکھی ہے ، اس وقت گزارش کرتا ہوں ۔ اہل نظر یہ بھی دیکھیں گے کہ آزادگیِ آزاد نے اس میں کئی قسم کی قیدوں کو توڑا ہے ۔ ایک ان میں سے یہ مثنوی ہے ۔ مگر جو معمولی بحریں مثنوی کی رائج ہیں ان سے قدم بڑھائے ہوئے ہے ۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان بحروں میں گنجائش کم ہے ۔ ساتھ اس کے یہ کہ جو بحریں مثنوی کی خاص ہیں انھیں کسی مذہب نے خاص نہیں کیا ۔ اب کہ ہمیں علی العموم ہر قسم کے

مضامین کا نظم کرنا ہے۔ پس کچھ گناہ نہ ہوگا اگر ہم قصیدہ یا غزل کے بحر میں مثنوی کہہ دیں۔"

اس پر تبصرہ نگار لکھتا ہے:

"کمترین عرض کرتا ہے کہ مثنوی اور غزل اور قصیدہ اور قطعہ و ترکیب بند و ترجیع بند و مسمط اور مستزاد کے واسطے کوئی بحر یا کوئی وزن خاص مقرر نہیں۔ صرف رباعی کے واسطے ۲۴ وزن بحر ہزج سے خاص ہیں۔ بلکہ بعض مثنوی پروفیسر صاحب کی مثنوی سے بھی قدم بڑھائے ہوئے ہیں۔ مثلاً "گلِ کُشتی" میر نجات جس کا مطلع یہ ہے:

در کفِ عشق بر آن نامہ دلخواہ بود
زینتش نامِ خوشِ حضرت اللہ بود

کیونکہ اس میں ہر ایک مصرع میں ۲۳ یا ۲۴ حرف ہیں اور پروفیسر صاحب کی مثنوی میں ۲۲ یا ۲۳۔ اور مثنوی تصنیف مرزا سودا جس کا مطلع یہ ہے:

یارو خدا ایک ہے، دوسرے برحق نبی
صورتِ لوح و قلم جس کے لیے ہے خلق کی

اس میں بھی ہر ایک مصرع ۲۳ یا ۲۴ حرف کا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اور مثنویاں بھی ہیں۔ ہاں اتنا ہے کہ اکثر استادوں نے نظامی کی پانچوں مثنویوں پر مثنویاں کہی ہیں لہٰذا آن پانچوں وزنوں میں بہت مثنویاں ہیں۔"

اس تنقید کے شائع ہونے پر آزاد نے اپنی مذکورہ بالا عبارت لکچر سے حذف کر دی۔

(۵)

آزاد کی تصنیف "نیرنگِ خیال" تمثیلی مضامین پر مشتمل ایک مجموعہ ہے۔ مولوی خلیل الرحمٰن کے بیان کے مطابق اس کے حصۂ اول کے مضامین

انجمنِ پنجاب کی نشستوں میں پڑھے گئے اور ۱۸۸۰ع میں مدّون ہوئے ، اگرچہ یہ کچھ سال پہلے ۱۸۷۴ع یا اس کے لگ بھگ تحریر کیے گئے تھے - اس کا دوسرا حصّہ ویسے ہی پڑا رہا اور آزاد کی وفات کے بعد اسے آغا محمد طاہر نے ۱۹۲۳ع میں شائع کیا - کتاب کے دیباچے میں جس طرح بھرپور طور پر اس انقلاب کا ذکر کیا گیا ہے جو پنجاب میں اس وقت رونما ہو رہا تھا ، اس کی نظیر آزاد کی کسی اور تصنیف میں نہیں ملتی - مندرجہ ذیل اقتباس بعینہ اس خلوص اور جوش کا مظہر ہے جو نئی تہذیب کے زیرِ اثر باشعور طبقے میں رونما ہو رہا تھا :

"تماشا گاہِ عالم میں جو اہلِ نظر ایک نگاہ سے میدانِ ماضی اور ایک سے حال اور استقبال کی سیر دیکھ رہے ہیں انہیں صاف نظر آ رہا ہے کہ ملک عنقریب آفرینشِ جدید کے وجود میں قالب تبدیل کیا چاہتا ہے - نئے نئے علوم ہیں ، نئے نئے فنون ہیں - سب کے حال نئے ہیں ، دل دل کے خیال نئے ہیں - عمارتیں نئے نئے نقشے کھینچ رہی ہیں ، رستے نئے خاکے ڈال رہے ہیں - اس طلسمات کو دیکھ کر عقلِ رسا حیران ہے ، مگر اسی عالمِ حیرت میں ایک شاہراہ پر نظر جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے سولزیشن (تہذیب) کی سواریِ شاہانہ چلی آتی ہے - ہر شخص اپنے اپنے ویرانے کو جھاڑ بہار رہا ہے اور جس حال میں ہے اس کی پیشوائی کو دوڑا جاتا ہے -

نیز یہ کہ پرانی روایات کو ترک کرنے کا رجحان پہلے سے کہیں زیادہ ترقی کر چکا ہے - اردو زبان کے پاس جو کچھ اصل سرمایہ ہے وہ شعرائے ہند کی کمائی ہے جنھوں نے فارسی کی بدولت اپنی دکان سجائی ہے - یہ مفلس زبان علمی الفاظ میں تو اس لیے تہی دست رہی کہ یہ ملک کی علمی زبان نہ تھی - افسوس یہ ہے کہ عام مطالب کو ادا کرنے میں بھی مفلس ہے ... جو کچھ ہے وہ اتنا ہے کہ فارسی کے پروں سے اڑی ، لفاظی اور مبالغوں کے زور سے آسمان پر چڑھ گئی - وہاں سے جو گری تو استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئی -

اس کی طبع آزمائی کا زور اب تک فقط چند مطالب میں محصور ہے -

مضامینِ عاشقانہ ، گلگشتِ مستانہ ، نصیبوں کا رونا ، اُمید موہوم پر خوش ہونا ۔ امرا کی ثنا خوانی ، جس پر خفا ہوئے اُس کی خاک اُڑانی ۔ البتہ ان رنگوں میں اس نے لطافت اور نازک خیالی کو اس درجے تک پہنچایا کہ حد سے گزار دیا ۔ اس قسم کے الفاظ و مطالب کا عمدہ ذخیرہ اس کے پاس ہے ۔ فارسی میں صدہا نظم و نثر کی کتابیں ہیں جن کے خیالات ، باریکی اور تاریکیٔ عبارت میں جگنو سے اڑتے نظر آتے ہیں ، لیکن کیا حاصل ؟ اس انداز میں اصلی ماجرا ادا کرنا چاہو تو ممکن نہیں ۔ ایسی ماں کا دودھ پی کر اردو نے پرورش پائی تو اس کا کیا حال ہوگا ۔''

آخر میں آزاد قرونِ وسطیٰ کے طلسمی قصے کہانیوں پر بھرپور حملہ کرتے ہیں ۔ ان کی تحریر میں دورِ جدید کے مخصوص رجحان کا پورا عکس دکھائی دیتا ہے :

''حق تو یہ ہے کہ مجھ ناقابل کو ایسے موقع پر قلم اُٹھانا ان مضامین کو ذبح کرنا ہے لیکن اب وہ زمانہ بھی نہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک کہانی طوطے یا مینا کی زبانی سنائیں ۔ ترقی کریں تو چار فقیر لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائیں ۔ یا پریاں اڑائیں ، دیو بنائیں اور ساری رات ان کی باتوں میں گنوائیں ۔ اب کچھ اور وقت ہے ۔ اسی واسطے ہمیں بھی کچھ اور کرنا چاہیے ۔ عُلوم و فنون کے علاوہ ایسی تصنیفیں بھی چاہئیں جو صاف شفّاف تصویریں رسوم و اخلاق کی ہماری بزمِ کلام میں سجائیں ۔ ان سے جو ہمارے داغ دھبّے ہیں سب نظر آئیں ۔''

''نیرنگِ خیال'' کو ہمیشہ آزاد کی طبع زاد تصنیف خیال کیا گیا ہے ۔ بجز اس اقرار کے کہ اس کا مواد غالباً ڈاکٹر لائٹنر نے فراہم کیا تھا ۔ شیخ عبدالقادر نے ، جو بعد میں سر عبدالقادر کہلائے ، آزاد سے متعلق اپنے لکچر میں یہی رائے ظاہر کی ہے :

''جہاں تک میرا علم مدد کرتا ہے ، ٹھیٹھ یونانی نمونے پر سب سے پہلے تمثیل لکھنے کا اعزاز آزاد ہی کو حاصل ہے ۔ میں نے سنا ہے

اور غالباً یہ درست بھی ہے کہ مصنف کو اس تصنیف کا خاکہ ڈاکٹر لائٹنر ہی سے ملا تھا۔ اُس نے آزاد کو اپنی معلومات سے مستفید کیا اور اس نے اس کے مہیّا کردہ مواد سے "نیرنگِ خیال" کی عمارت تعمیر کی۹۔"

مضامین کے ماخذ کے متعلق آزاد کے اپنے حوالے تین ہیں جو سب کے سب گول مول اور سرسری سے ہیں۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:

"یہ چند مضمون جو لکھے ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں۔ ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکرِ مناسب نے زبان کے حوالے کیا، ہاتھوں نے اسے لکھ دیا۔"

اس لمبی چوڑی اور ایچ پیچ والی بات کو اگر سیدھے سادے پیرائے میں پیش کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو کچھ انھیں سُجھایا گیا، انھوں نے لکھ ڈالا۔ بہ الفاظِ دیگر یہ مواد اُنھیں زبانی طور پر فراہم کیا گیا اور انھوں نے اسے اپنی عبارت میں بنا سنوار کر پیش کردیا۔

اسی دیباچے میں آزاد فرماتے ہیں:

"انگریزی میں بڑے انشا پرداز وہی کہلاتے ہیں جن کی چشمِ سخن ہر بات میں ان کے تصوّرں پر اشارے کرتی جائے۔ مگر اردو کے باغ نے فارسی اور عربی کے چشموں سے پانی پیا ہے۔ وہاں دیوی دیوتا کا گزر نہیں۔ اور یہ سخت دشواری ہے۔ کیونکہ اگر لکھنے میں کچھ تصرّف کریں تو ترجمہ نہ رہا اور اصل کی رعایت کی تو کتاب معمّائے دقیق ہوگئی، نہ کہ رفیقِ تفریح۔"

تیسرا حوالہ مضمون بہ عنوان "علمیت اور ذکاوت کے مقابلے" کے فٹ نوٹ میں یوں درج ہے:

"انگریزی میں وِٹ اور لرننگ کا مباحثہ تھا۔ میں نے وِٹ کے واسطے بہت خیال کیا، کوئی لفظ نہ ملا۔ ناچار ذکاوت لکھ دیا۔"

مجھے اُن مضامین کے انگریزی سے ماخوذ ہونے کا شبہ اُس بدیہی مشابہت سے پیدا ہوا جو جانسن کے "Voyage of Life" اور آزاد کے مضمون

"سیرِ زندگی" میں نظر آئی - موازنہ کرنے پر یہ انگریزی مضمون کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ثابت ہوا - جب اٹھارویں صدی کے ان انگریزی مضامین پر نظر ڈالی جن میں انشائیوں کو بڑی مقبولیت حاصل تھی ، تو معلوم ہوا کہ ان کا ماخوذ ہونا محض شبہ نہیں بلکہ حقیقت ہے - درحقیقت "نیرنگِ خیال" کے تمام انشائیے انگریزی سے ترجمہ ہیں - گو استفادے کے اعتبار سے ان میں فرق ہے ، اگرچہ مضامین لفظ بہ لفظ ترجمہ ہیں ، لیکن ان کے بعض حصوں کو کافی آب و رنگ دیا گیا ہے اور ایک دو جگہ تو آزاد نے اصل انشائیوں سے قصداً انحراف بھی کیا ہے - مثلاً "سیرِ زندگی" کا آخری حصہ اور "شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار" میں مشاہیرِ مغرب کے بجائے مشاہیرِ مشرق کا تذکرہ اسی طرح کے انحرافات ہیں -

ذیل میں انگریزی انشائیوں اور ان کے ماخذ کو ایک دوسرے کے مقابل پیش کیا گیا ہے :

(۱) آغاز آفرینش میں باغِ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا	An Allegorical History of Rest and Labour—Johnson
(۲) سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ	Truth, Falsehood & Fiction, an Allegory—Johnson
(۳) گلشنِ امید کی بہار	The Garden of Hope, a Dream—Johnson
(۴) سیرِ زندگی	The Voyage of Life—Johnson
(۵) انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا	The Endeavour of Mankind to get rid of their Burdens, a Dream—Addison
(۶) علوم کی بدنصیبی	The Conduct of patronage—Johnson
(۷) علمیت اور ذکاوت کے مقابلے	An Allegory of Wit and Learning—Johnson

(۸) جنّت الحُمقا	Paradise of Fools—Parnell The Spectator, No. 460
(۹) خوش طبعی	The Spectator, No. 35—Addison
(۱۰) نکتہ چینی	An Allegory of Criticism —Johnson
(۱۱) مرقّعِ خوش بیانی	The Spectator, No. 63—Addison
(۱۲) سیرِ عدم	The Spectator, No. 501—Addison
(۱۳) شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار	Vision of the Tables of Fame, No. 81—The Tatler

قدرتی طور پر سوال اٹھتا ہے کہ آزاد ان مضامین کا ترجمہ کیسے کر سکتے تھے جب کہ عام خیال کے مطابق انھیں انگریزی پر عبور نہ تھا، یا کم از کم اتنا نہ تھا کہ وہ ان انشائیوں کا ترجمہ کر سکیں ؟

اس کی دو طرح توجیہ کی جا سکتی ہے - ایک وہی جس کا اوپر ذکر آیا ہے، یعنی ان کا مواد ڈاکٹر لائٹنر نے فراہم کیا ہو مگر ہمیں یہ نظریہ کسی طرح بھی قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا - کیونکہ اس کے مطابق ڈاکٹر لائٹنر نے یہ مضامین خود ترجمہ کیے اور آزاد کے حوالے کر دیے کہ ان کو آب و رنگ بخشیں - اس میں کچھ شک نہیں کہ ڈاکٹر لائٹنر کو آردو پر کچھ نہ کچھ دسترس حاصل تھی، پر نہ اتنی کہ وہ ان مضامین کو آردو میں ڈھال سکیں - اس کے لیے اعلیٰ علمی استعداد کی ضرورت تھی اور وہ انھیں حاصل نہ تھی - بفرضِ محال اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو کیا آزاد کا اخلاقاً یہ فرض نہ تھا کہ وہ اس اعانت اور اس کی نوعیت کا 'پیش لفظ' میں برملا ذکر کرتے اور شکریہ بھی ادا کرتے لیکن ایسا نہیں کیا گیا - صرف یہی نہیں، اگر انھوں نے کسی بھی صورت میں لائٹنر سے استفادہ کیا ہوتا تو کیا لائٹنر اس بات پر مصرّ نہ ہوتا کہ اس کی اعانت کا ذکر کیا جائے، جبکہ ہم جانتے ہیں کہ لائٹنر کی سب سے بڑی خواہش یہ

تھی کہ ان کا چرچا ہو۔ وہ یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ آزاد دیباچے میں لیپل گرفن اور کرنیل ہالرائیڈ کی تعریف میں تو اپنی شاعرانہ لن ترانیوں کا ثبوت دیں اور لائٹنر کا نام تک نہ آئے؟ دوسری صورت میں اگر انھوں نے لائٹنر کے ایما پر یا ان کے زیرِ ہدایت ترجمہ کیا ہوتا تو بھی آزاد اس کا ذکر ضرور کرتے۔ عین ممکن ہے کہ لائٹنر نے کبھی برسبیلِ تذکرہ ایسے تراجم کا تذکرہ کیا ہو، لیکن اس تصنیف سے ان کا کوئی واضح تعلق نہیں ہے۔

آج کل جب ہم اس مسئلے کی بھول بھلیّوں میں سرگرداں ہو کر کسی قابلِ قبول نتیجے تک پہنچنا چاہتے ہیں تو ہم یہ حقیقت فراموش کر جاتے ہیں کہ آزاد انگریزی پر اس سے کہیں زیادہ عبور رکھتے تھے جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے یا اُن کے ہم عصروں کا خیال تھا۔ تاہم اس میں کلام نہیں کہ وہ بطورِ خود اس مشکل اور صبر آزما کام سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تھے۔ انھیں اس کام میں کس کس کی اعانت حاصل تھی؟ یہ اب کبھی معلوم نہ ہو سکے گا۔

تاریخی اہمیت سے قطع نظر کتاب فی نفسہ کچھ زیادہ پُرکشش یا ادبی محاسن کی حامل نہیں۔ تمثیلی انشائیہ اٹھارویں صدی کے انگلستان میں بہت مقبول تھا۔ لیکن ان مضامین کا خواہ آزاد کے تراجم میں مطالعہ کیا جائے خواہ اصل انگریزی میں، ان کی وضع قاری کو بہت جلد اکتا دیتی ہے۔ وہی خوابوں اور رؤیا کا گھسا پٹا انداز، وہی حق و باطل کی آویزش، فصاحت کا شجرۂ نسب اور خوشی و حسد وغیرہ کے ہیولے جا بجا دامن گیر نظر ہیں، جو انسان اور طلسمی ہستیوں کے سوانگ رچاتے نظر آتے ہیں۔ ان مضامین میں بہترین "شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار" ہے جس میں دورِ آخر کے بعض طالبانِ شہرتِ دوام کا کردار بڑی چابک دستی اور ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے۔ اورنگ زیب کی سیرت کا اس سے زیادہ شوخ اور جیتا جاگتا مرقع اور کیا ہوگا:

"ایک تاجدار آیا کہ جبّہ و عمامہ سے وضع زاہدانہ رکھتا تھا۔ ایک ہاتھ سے تسبیح پھیرتا جاتا تھا، مگر دوسرے ہاتھ میں جو فردِ حساب تھی، اس میں غرق تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی میزان کو پڑتالتا تھا۔ سب نے دیکھ کر کہا کہ انھیں خانقاہ میں لے جانا چاہیے۔ اس دربار میں اس کا کچھ کام نہیں۔ لیکن ایک ولایتی کہ بظاہر

مقطع اور معقول نظر آتا تھا ! وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھا اور کہا کہ اے اراکینِ دربار ہمارے ظلِ سبحانی نے اس کم بخت سلطنت کے لیے بھائی سے لے کر باپ تک کا لحاظ نہ کیا۔ اس پر بھی تمھارے اعتراض اسے دربار میں جگہ نہ دیں گے ۔ یہ لطیفہ اس نے مسخرہ پن سے ادا کیا کہ سب مسکرائے اور تجویز ہوئی کہ تیموری خاندان کے سب سے اخیر میں انھیں جگہ دو۔ معلوم ہوا کہ وہ عالم گیر بادشاہ اور ساتھ اس کے نعمت خاں عالی تھا ۔"

یا غالب کا یہ نقش جو ان کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے ، خواہ اسے ستائش پر محمول کیا جائے یا عدمِ ستائش پر :

"غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے ۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے ۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ واہ کرتے رہ گئے ۔"

اوپر کہا گیا ہے کہ تمثیلی ادب کا آج کل رواج نہیں ۔ اور آزاد کے تمثیلی انشائیے جن میں مجرّد خیالات اور حقائق کو انسانی صورت اور لب و لہجہ سے متّصف کیا گیا ہے ، گوشت پوست کے انسانوں کی سی دل چسپی پیدا نہیں کر سکتے ۔ لیکن اس دل چسپی کے فقدان یا کم از کم کمی کا سبب آزاد کے ترجمے کی کوتاہی یا نارسائی نہیں ۔ معاملہ اس کے برعکس ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم ان انشائیوں میں دل چسپی لیتے ہیں تو اس کا سبب آزاد کی مطالب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کی حیرت انگیز قوت ہے ۔ ترجمے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ترجمہ دکھائی نہ دے ، بلکہ اس پر تخلیق کا گمان ہو ۔ یہی اس تصنیف کی بڑی خوبی ہے ۔ یاد رہے پچھلے سو سال میں اردو نے بے حد ترقی کی ہے اور اسے نئے نئے الفاظ ، تراکیب ، محاورات اور اسالیبِ بیان سے مالا مال کیا گیا ہے ۔ آزاد کے وقت تک زبان ابھی ابتدائی حالت میں تھی ، اس کے باوجود وہ مشکل سے مشکل خیالات اور اجنبی سے اجنبی کیفیات کو حیرت انگیز آسانی سے ادا کرتے چلے جاتے ہیں ۔ زبان کی بے مائیگی یا بے بسی کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا ۔ وہ اردو کے پرانے الفاظ کو موڑ توڑ کر یا انھیں نئے معنی پہنا کر اپنا ما فی الضمیر ادا کرتے

چلے جاتے ہیں - بحیثیت مجموعی اُن کے ترجمے کی سب سے بڑی خوبی اُس کی دریا کی سی روانی ہے اور قاری اس سے متاثر ہو کر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے -

اگرچہ یہ بہ ظاہر عجیب معلوم ہوگا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اُن کے دیباچے میں وہ روانی اور حسنِ ادا نہیں جو تراجم میں جا بجا ملتا ہے - اس کا سبب یہ ہے کہ ان تراجم میں آزاد کی تمام تر کوشش ان خیالات کو جوں کا توں ادا کرنے پر مرکوز رہی ہے ، اور ان کا تخیّل ، جو ان کی تصانیف میں اکثر بے جا طور پر اثر انداز ہوتا ہے ، یہاں راہ نہیں پاتا - ان کے اسلوب کے بارے میں یہ چند ہلکے سے اشارے ہیں جن کی مکمل روداد آگے آنے والے باب میں پیش کی جائے گی[۱] -

* * *

حوالے اور حواشی

۱- سخن دان فارس ، حصہ دوم ، ص ۳ -

۲- ایضاً ، ص ۵ -

۳- ایضاً ، ص ۱۸ -

۴- ایضاً ، ص ۳۷ - لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ''سہ نثر ظہوری'' کا اثر خود آزاد کے اسلوب میں موجود ہے - ملاحظہ ہو ''یاد ایام'' از عبدالرزاق ، صفحات متعلقہ محمد حسین آزاد ، جن میں آزاد کی نثر پر ظہوری کے اثرات کا سراغ لگایا گیا ہے -

۵- ایضاً ، ص ۸۳ -

۶- وہ کمیٹی جو مدارس کے نصاب مقرر کرنے کے لیے بنائی گئی -

۷- یہ اخبار ۱۸۶۶ع میں محمد عظیم کے زیر ادارت جاری ہوا - ملاحظہ ہو خطبات گارساں دتاسی ، ص ۵۱۵ - آزاد کے خلاف مضامین ، حالی کے ایک شاگرد انوارالحق نے لکھے تھے - یہ مضامین حالی اور آزاد کی شکر رنجی سے متاثر ہو کر لکھے گئے - (دیکھیے ''مکتوبات آزاد'' ص ۱۰۰) -

۸- یہ پنجاب کے قدیم ترین اخبارات میں سے ایک ہے -

۹- The New School of Urdu Poetry (اردو شاعری کا نیا دبستان ، ص ۳۴) - سرعبدالقادر کا خیال کہ allegory ایک قدیم یونانی صنف ادب ہے ، درست نہیں - یہ قرون وسطیٰ کی پیداوار ہے - قدیم یونان میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی - البتہ یہ درست ہے کہ جب بعد میں یورپ میں allegory کا عام رواج ہوا تو ہومر اور ہیسیڈ کی تصانیف کو مثالی

معانی پہنائے جانے لگے ۔ لیکن فی الاصل یہ تاویلات بالکل دور از کار ہیں اور کھینچ تان کر بنائی گئی ہیں ۔

۱۰۔ جب سے ہم نے 'نیرنگِ خیال' کے ماخذ پر روشنی ڈالی ہے (اور یہ آج سے تقریباً چالیس سال قبل کی بات ہے) یہ امر تمام معقول محققین کے نزدیک مسلّمہ صورت اختیار کر چکا ہے کہ ان چند نہایت مختصر مستثنیات کے سوا ، جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے ، اس تصنیف کے تمام مضامین انگریزی سے ترجمہ ہیں ۔ یہاں کسی مزید دلیل و حجت کی ضرورت نہیں ۔ آزاد کے مضامین اور ان کے متوازی انگریزی مضامین موجود ہیں اور اس حقیقت کو ہر شخص بطورِ خود معلوم کر سکتا ہے ۔

حال ہی میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنے مضمون ''نیرنگ خیال کے مطبوعہ نسخے'' میں جو 'صحیفہ' بابت اپریل ۱۹۷۱ع میں شایع ہوا ، دو باتیں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اول یہ کہ ''نیرنگ خیال'' کے مضامین ترجمہ نہیں بلکہ انگریزی مضامین سے ماخوذ ہیں ۔ بہ الفاظِ دیگر انگریزی مضامین کے مطالب کو اپنی زبان میں ادا کیا ہے ۔ دوسرے یہ کہ ''نیرنگ خیال'' حصّہ دوم کی ترتیب اور تحریر میں محمد طاہر نبیرۂ آزاد کا حصّہ ہے ۔ ان کی رائے میں موخرالذکر نے ان خاکوں اور اشارات کو ، جو آزاد نے تیار کیے تھے ، باقاعدہ مضامین کی صورت میں تحریر کرکے عملی جامہ پہنایا ہے ۔ ان کی رائے میں جو کچھ ہم نے اس موضوع پر لکھا ہے ''بے معنی'' ہے ۔

ہم نہایت وثوق سے کہتے ہیں کہ یہ دونوں دعوے بے دلیل اور مشتبہ شہادت پر مبنی ہیں ۔ ہمارے بیان کی تردید وہ ذیل کے بیان سے کرتے ہیں جو "نیرنگِ خیال" کے دوسرے ایڈیشن کے آخری ورق پر چھپا تھا اور جسے بعد میں حذف کر دیا گیا :

Gems from West and East, or the Land of Fact and Fancy ; being a series of allegorical and other essays based on the 'Rambler' and 'Spectator'

and on Oriental Love by Maulvi Muhammad Husain Azad, Professor of Arabic, Government College Lahore...1880.

ہمیں یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ آزاد کے دوسرے بیانات کی طرح ، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے ، یہ بیان بھی حقیقت کو چھپانے کی بے کار کوشش ہے ۔ درحقیقت یہ جملے بطور حفظِ ماتقدم درج کیے گئے ہیں تاکہ اگر کسی وقت ان مضامین کا صحیح مأخذ معلوم ہو جائے تو وہ اپنی براءت میں ان مبہم بیانات کو استعمال کر سکیں ۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب ہماری تحقیق کو ''بے معنی'' بتانے کی بجائے "نیرنگِ خیال" اور اس کے مأخذ کا مطالعہ کرنے کی تکلیف گوارا کرتے تو ان سے یہ فاش غلطی سرزد نہ ہوتی ۔

دوسرا انکشاف جو اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے ، آغا طاہر کے ذیل کے بیان پر مبنی ہے :

''اس جلسے کے لیے سامانِ دعوت ... حضرت آزاد نے خود بہم پہنچائے تھے ۔ مگر تقدیر کے ہاتھوں اس کام کا انجام تھا کہ نہ ہوا ۔ اور یہ نامکمل دفتر خاموشی کے بستوں میں پڑے سویا کیے (اور) قضا و قدر کے ہوشیار سال نے وقت کے پانسے کو مجھ احقر کے نام زبردستی پھینک دیا ۔ افسوس ! کہ میں اس تصوّر کاری سے عاجز ہوں ۔

اگرچہ اس وقت میرے سامنے پانچ مرقعے موجود ہیں مگر میاں باوا جیسے لفظوں کے خزانے تصرّف میں کہاں ہیں کہ ان کو جگمگاؤں ۔ وہ زبان نہیں رکھتا کہ اس کی آب داری سے ان عقلی شعبدوں کو چمکاؤں ۔ وہ طرزِ بیان کہاں کہ اس کے اثر سے جادوگری بھر کر سب کو محوِ حیرت کر سکوں ... اپنی بساط کے موافق سادے جڑاؤ ، مرصّع اور پُرکار جوہر نگار زیوروں کو الٹا پلٹا ہے ، اور جہاں تک ممکن ہو سکا ، ترتیب کے شیرازے میں تالیف کیا ۔''

اس پر ڈاکٹر صاحب کی حاشیہ آرائی ملاحظہ ہو :

''... سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''نیرنگِ خیال'' کے حصّہ دوم کے

پانچ مضمون کیا واقعی آزاد کے لکھے ہوئے ہیں یا محض خاکے اور نوٹس ان کے ہیں اور ان خاکوں میں رنگ آغا طاہر نے بھرا ہے ؟ کیوں کہ آغا طاہر نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ آزاد کے فراہم کردہ سامانِ دعوت ... کو آراستہ کرنے کا کام انجام کو نہ پہنچا تھا کہ وہ حالتِ جنوں میں چلے گئے اور اس نامکمل دفتر کی تکمیل کے لیے خود انھیں تصوّر کاری سے کام لینا پڑا ... ممکن ہے کہ آزاد نے وقتاً فوقتاً ان مضامین کے کچھ خاکے بنائے ہوں اور جستہ جستہ کچھ خیالات بھی قلم بند کیے ہوں (کیونکہ حصّہ دوم کے مضامین بھی انگریزی ادب سے ماخوذ ہیں) لیکن انھیں آخری شکل نہ دے سکے ہوں، اور اس طرح یہ مضمون ادھورے رہ گئے ہوں، جنھیں آغا اشرف نے ترتیب دیتے وقت مکمل کیا ... اس لیے ''نیرنگِ خیال'' حصّہ دوم کے مرقعوں کو کامل طور پر آزاد کی تحریر قرار دینا مشکل ہے۔ اس میں آزاد و نبیرۂ آزاد دونوں کی محنت اور کاوش شامل ہے۔''

وہ بہتان طرازی، جسے آغا محمد طاہر نے دبی زبان اور مبہم الفاظ میں ادا کیا ہے، ڈاکٹر غلام حسین نے اسے مدلّل صورت میں بیان کیا ہے۔ آغا محمد طاہر کا دعویٰ بالکل بے سروپا ہے۔ اس دعوے کو سراسر غلط ثابت کرنے کے لیے صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ یہ مضامین حصہ اول کے مضامین کی طرح سراسر ترجمہ ہیں اور تمام تر آزاد کی تحریر ہیں۔ ان کا اسلوب سو فی صدی وہی ہے جو حصّہ اول کا ہے۔ آغا طاہر کے طرزِ تحریر کا نمونہ اوپر آ چکا ہے۔ وہ کتنا عامیانہ اور پُر تصنّع ہے۔ ڈاکٹر صاحب حصّہ دوم کے مضامین پر سرسری سی نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ آزاد کے اطلس و کمخواب میں آغا صاحب کے ٹاٹ کا کوئی پیوند کہیں بھی نظر آتا ہے؟ مزید ثبوت کے لیے کہ یہ مضامین تمام تر آزاد کی تصنیف ہیں، آپ ان کا آغا طاہر کے مضمون ''بقائے دوام'' سے مقابلہ کریں جو انھوں نے حصّہ دوم میں شامل کیا ہے۔ کیا آپ کو حصّہ دوم کے مضامین اور اس میں رتی بھر مماثلت نظر آتی ہے؟

پانچواں باب

آبِ حیات

(۱)

آزاد اب کچھ عرصے سے دنیائے ادب کی ایک خاصی معروف شخصیت تھے - انھیں معاشرے میں نمایاں حیثیت اور اثر و رسوخ حاصل تھا لیکن ابھی تک ان کی شخصیت پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے نہیں آئی تھی - اب وہ ایک ایسی کتاب لکھنے والے تھے جو اُن کے بڑے سے بڑے مخالف کو بھی خاموش کر دے اور اُنھیں اُردو ادب کی تاریخ میں مستقل مقام عطا کرے - یہ کتاب اُن کی مشہور تصنیف "آبِ حیات" ہے جو ۱۸۸۱ع میں شائع ہوئی -

یہ کہنا مشکل ہے کہ آزاد کے دل میں اس کتاب کی تصنیف کا خیال کب پیدا ہوا - اُردو شاعری کا تاریخی جائزہ اُن کا بہت پرانا اور محبوب موضوع رہا ہے - جب "بغاوتِ ہند" کے باعث پرانا نظام ناپید ہوگیا تو یہ شوق مقدس فریضہ بن گیا تاکہ دورِ کہن کو ادبی شکل میں حیاتِ تازہ عطا کی جائے - جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ، کچھ عرصہ انھیں حوادثِ زمانہ کے باعث سر اُٹھانے کی بھی فرصت نہ ملی لیکن جوں ہی وہ لاہور میں سکونت پذیر ہوئے اور خاطر جمع ہوئی ، ان کا ادبی ذوق و شوق پھر سے جاگ اُٹھا اور وہ اس تصنیف کے لیے سواد فراہم کرنے لگے- ۱۸۷۶ع میں انھوں نے پورا تہیہ کر لیا اور اپنے احباب اور شعرا کے اعزّا سے خط و کتابت بھی شروع کردی - اس کے بعد وہ لگاتار پانچ سال تک اس کی تکمیل میں منہمک رہے اور انتہائی عرق ریزی اور جانفشانی سے کام کیا -

یہ ایسی کتاب ہے جس سے اُردو ادب کی ایک بہت بڑی کمی پوری ہوئی- اب تک اردو میں شعرا کا کوئی باقاعدہ تاریخ وار تذکرہ مرتّب نہیں ہوا تھا -

پرانی انداز کے تذکرے تو بہت تھے ، لیکن اکثر ناتمام اور ناقص ۔ کوئی کسی عہد سے متعلق تو کوئی کسی عہد سے ۔ اکثر ایسے تھے کہ نہ ان میں تنقید یا ادب کا شائبہ تھا ، نہ کوئی انسانی دلچسپی ۔ جس قسم کی کتاب درکار تھی وہ ایک ایسا تذکرہ تھا جس میں شعرا کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی گئی ہوں ، جدید انداز میں تنقید بھی ہو اور تحقیق پر مبنی سیر حاصل اور مستند حالات بھی ہوں ۔ یہ کمی ''آبِ حیات'' نے پوری کردی ۔ ''آبِ حیات'' محض اردو شاعری کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ایک توانا ، متحرّک اور زندگی سے لبریز دستاویز ہے جو عہدِ ماضی کو از سرِ نو زندہ کرکے ہماری آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے ۔ بلامبالغہ ہمارے ادب میں ایسی اور کوئی کتاب نہیں ۔

وہ کیا مقصد تھا جس نے آزاد کو اس کتاب کی تصنیف پر آمادہ کیا ؟ اس پر دیباچے میں پوری روشنی ڈالی گئی ہے ۔ آزاد بڑے ہی پُر افسوس لہجے میں بتاتے ہیں کہ وہ لوگ جو شعرائے سلف کے متعلق معلومات کا خزانہ تھے :

''جن جوہریوں کے ذریعے سے یہ جواہرات مجھ تک پہنچے ، وہ تو خاک میں مل گئے ۔ جو لوگ باقی ہیں وہ بجھے چراغوں کی طرح ایسے ویرانوں میں پڑے ہیں کہ ان کے روشن کرنے کی یا ان سے روشنی لینے کی کسی کو پروا نہیں ۔ پس یہ باتیں کہ حقیقت میں اثبات ان کے جوہرِ کمالات کے ہیں ، اگر اسی طرح زبانوں کے حوالے رہیں تو چند روز میں صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گی ۔''

وہ مزید لکھتے ہیں :

''کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیاں بہم پہنچائیں ، انھیں بقائے دوام کے سامان ہاتھ آئیں اور اس پرنام کی زندگی سے بھی محروم رہیں ۔ بزرگ بھی وہ بزرگ کہ جن کی کوششوں سے ہماری ملکی اور کتابی زبان کا لفظ لفظ اور حرف حرف گراں بار احسان ہو ۔ ان کے کاموں کا اس گم نامی کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹنا بڑے حیف کی بات ہے ۔ جس مرنے پر ان کے اہل و عیال روئے وہ مرنا نہ تھا ۔ مرنا حقیقت میں ان باتوں کا مٹنا ہے جس سے ان کے کمال مر جائیں گے اور یہ مرنا حقیقت میں سخت غم ناک حادثہ ہے ۔''

''آبِ حیات'' پرانی صحبتوں اور وفاداریوں کی غیرفانی یادگار ہے اور اس لیے اور بھی قابلِ قدر ہے کہ اب ان کا دنیا میں کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا۔

آزاد نے یہ بھی محسوس کیا کہ پرانے تذکرے ہمارے عہد کے ذوق اور تقاضوں کے لیے موزوں نہیں، کیونکہ ان میں کوئی اصول مدِنظر نہیں رکھا گیا۔ اب شاعری کا اصولی نہج پر مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس لیے انھوں نے اس ضرورت کو پورا کرنے کی جد و جہد شروع کردی۔

وہ لکھتے ہیں:

''اس کے علاوہ نئے تعلیم یافتہ، جن کے دماغوں میں انگریزی لالٹینوں سے روشنی پہنچتی ہے، وہ ہمارے تذکروں کے اس نقص پر حرف رکھتے ہیں کہ ان سے کسی شاعر کی زندگی کی سرگزشت کا حال معلوم ہوتا ہے، نہ اس کی طبیعت اور عادات و اطوار کا حال کھلتا ہے۔ نہ اس کے کلام کی خوبی اور صحت و سقم کی کیفیت کھلتی ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے معاصروں میں اور اس کے کلام میں کن کن باتوں میں کیا نسبت تھی۔ انتہا یہ کہ سالِ ولادت اور سالِ وفات تک بھی نہیں کھلتا ... غرض خیالاتِ مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں، انہیں جمع کرکے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انہیں حیاتِ جاوداں حاصل ہو۔

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اس کتاب کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا اور اس پر بے شمار تبصرے شائع ہوئے۔ ازانجملہ ''انجمن'' اخبار مورخہ ۲۳ مئی ۱۸۸۱ء کا سنجیدہ تبصرہ شائستہ تنقید کا خاصا وقیع نمونہ ہے:

... اس کے مصنف نے اردو زبان کی تاریخ کو، جو مختلف رسالوں اور کتابوں میں بے ترتیب اور غیرمسلسل لکھی ہوئی نظر آتی تھی، اچھی طرح اور علم و زبان کے قواعد کے مطابق زنجیرہ بند کرکے لکھا ہے جس سے اس کی ترقی و تنزّل کے درجے اور حالتیں آئینہ ہوگئی ہیں۔

''بھاشا پر فارسی نے کیا اثر کیے'' اس فصل کو اس عمدگی کے ساتھ لکھا ہے جو مصنف کی عام واقفیت کی کامل گواہی دیتی ہے ، گو بعض ہندی الفاظ کی سنسکرت غلط لکھی گئی ہے ... بہرحال مولوی صاحب نے جو اردو لفظوں اور محاوروں کی اصل اور شانِ نزول لکھی ہے وہ اردو زباں دانوں کے حق میں ایسی مفید ہے کہ وہ لوگ جس قدر اس کتاب کی قدر اور مولوی صاحب کا شکریہ ادا کریں ، تھوڑا ہے ، کیونکہ یہ عمدہ ذخیرہ ان کو ایک جگہ اسی کتاب میں مل سکتا ہے ۔ اس نظر سے اس کتاب کو ان امُور کا اول ہی رسالہ کہنا چاہیے ۔ نظم اردو کی تاریخ کا وہ چربہ کھینچا ہے کہ گویا ناظموں اور ان کے قدردانوں کا جلسہ آنکھوں کے سامنے سماں باندھے کھڑا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے انگریزی دانوں کے ان خیالات میں کہ ہندوستانیوں کو کیفیت لکھنی نہیں آتی ، اس کتاب کے دیکھنے سے کمی ہونی شروع ہو جائے گی ۔

اگرچہ مولوی صاحب نے زبان کے بڑے معاون اور ستون ان شاعروں کو قرار دیا ہے اور اسی سبب سے انھی کا حال لکھا ہے ۔ ہر زبان کے ترقی دینے والے سب سے بڑھ کر عام لوگ ہیں جن کے محاوروں کو شعر میں صرف بیٹھانے سے یہ ایسا ناز کرتے ہیں ۔ البتہ جو شاعر نئے محاورے اپنے ہاں باندھ جاتا ہے یا نئے معنی لفظوں کو پہنا دے ، وہ شخص بے شک زبان کا ترقی دینے والا ہے ۔ اور یہ بات ایک ایسے آگرہ' والے میں پائی جاتی ہے جس کو مولوی صاحب نے بالکل قلم انداز کر دیا ۔ اور کیوں نہ کرتے جب چراغ تلے اندھیرا ہو ۔ مومن دہلی والے ہی شعرائے اردو کی فہرست سے خارج سمجھے گئے تو پھر میاں ''بنجارہ نامہ'' والے ، جن کے کلام کی بدولت ہزاروں آدمی روٹی کھاتا ہے ، کس گنتی میں تھے ۔

''حق یہ ہے کہ میر تقی ، سودا ، ذوق اور غالب وغیرہ شاعروں کا ایسا عمدہ اور پورا پورا حال لکھا ہے کہ جی یہی چاہتا ہے کہ اب جو کوئی کسی کا حال لکھنا چاہے وہ اس کتاب کو اپنا رہنما

بنائے جب لکھنے کو قلم اٹھائے، تاکہ اردو تذکرہ نویسوں اور تاریخ لکھنے والوں کے اوپر سے حقیقت نہ لکھ سکنے کا دھبہ کم ہوتا جائے۔

مختلف بیانات کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن خیالات کے ادا کرنے میں انگریزی داں یہ کہا کرتے تھے کہ ان کے واسطے اردو میں الفاظ نہیں، ان خیالات کو مولوی صاحب نے بغیر قید زبان ایسے ڈھنگ سے ادا کیا ہے کہ ذرا سی غور کرنے سے وہ خیالات سمجھ میں آ جاتے ہیں اور ان کا لباس کچھ بہت نیا معلوم نہیں ہوتا[۲]۔"

ادھر آزاد کے مخالف اور نکتہ چیں بھی خاموش نہیں بیٹھے تھے۔ مخالفانہ تنقید میں بجا طور پر کتاب کی دانستہ یا نا دانستہ فروگزاشتوں کی طرف توجہ دلائی گئی۔ سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ مومن دہلوی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ نیز ایک چھوٹے شاعر میر ضاحک کا تذکرہ نہیں کیا گیا جو سچ پوچھیے کچھ ایسا بے جا بھی نہ تھا۔

مومن سے اغماض نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ معترضین نے ایک ادبی مسئلے کو مذہبی رنگ دے کر شدید تلخی پیدا کی۔ اس سے بعد نقادوں کو یہ موقع ملا کہ وہ آزاد کو شیعہ ہونے کی بنا پر متعصب اور تنگ نظر قرار دیں۔ چنانچہ صادق الاخبار، مورخہ ۲۸ مارچ ۱۸۸۱ع میں جو تبصرہ شائع ہوا اس میں آزاد پر یہی الزام لگایا گیا کہ انھوں نے:

"ایک ایسے جواہر زواہر کو خزف ریزہ جان کر پھینک دیا اور اپنی کتاب 'آب حیات' میں، جو ان کے خیال میں ہوگی، دیگر شعرائے قدیم کے ساتھ نہ لکھا۔ حضرت آپ افسردہ خاطر نہ ہوں۔ اجتماع ضدین کہیں بھی ہو سکتا ہے؟ ... مومن تو نام پایا اور مذہب سنّی، معاذ اللہ۔ اور ایسے کٹّے اور ڈبل سنّی کہ اصحاب ثلثہ کرام کی تعریف و توصیف میں قصائد بھی لکھے، اور وہ ایسے دل سے لکھے کہ مقبول بھی ہوئے۔ مولوی آزاد کو کیا پڑی تھی کہ وہ ایسے جنّتی مومن کا حال زندگی لکھ کر اس کو زمرۂ استادان میں شمار کر کر آپ بھی اسی کے پیرو ہوتے اور اپنی برادری میں خارج کیے جاتے، اور اہل تشیع

کی نظروں میں سبک بنتے ۔ پس آپ صبر کریں اور تعصّب کی شان کو بغور تکتے رہیں ۔ فرمائیے تو سہی جن شعرا کا ذکر 'آبِ حیات' میں ہے ، ان میں سے کسی نے ایک رباعی بھی اصحاب ثلثہؓ کبار کی شان میں کہی ہے ؟ گو ان میں سے اکثر اہلِ سنّت ہیں ۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مومن مرحوم کو عشقِ مذہب تسنّن اس امر کا مقتضی نہ ہوا کہ وہ اس غیر کتاب میں داخل ہوتا ۔''

اس قسم کے اور تبصرے بھی اس اخبار اور ''صبحِ صادق'' میں شائع ہوئے ۔

آزاد کو ایسے اعتراضات سے بہت دکھ ہوا اور انھوں نے اپنے احباب سے ان بہتانوں کے خلاف دردمندانہ فریاد کی ۔ خوش قسمتی سے انھیں بعض احباب کی طرف سے بڑے حوصلہ افزا خطوط موصول ہوئے ۔ ان میں سے ایک حالی تھے جو مصیبت زدہ احباب کی غم گساری میں پیش پیش رہتے تھے ۔ انھوں نے لکھا :

''یہ خیال اکثر حمقا کو ہے کہ آپ نے مذہبی تعصّب کے سبب مومن کا حال نہیں لکھا ۔ مگر اس سے بڑھ کر کوئی نحیف اور پوچ خیال نہیں ہو سکتا ۔

دریا بوجودِ خویش موجے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

آپ لوگوں کی یاوہ سرائی پر کچھ التفات نہ کیجیے ۔ ''من صنّف قد استہدف'' خیال رکھیے اور اپنا کام کیے جائیے ۔ نکتہ چینوں کے خوف سے مفید کام بند نہیں کیے جا سکتے ۔ اور اگر دو نکتہ چیں ہیں تو ہزار مداح و ثناگو بھی تو ہیں ۔''[۳]

مومن کی کمی دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۸۳ع میں پوری کردی گئی ۔ طبع اول میں ان کو شامل نہ کرنے کا سبب یہ بتایا کہ وہ اس دور کے شعرا کی محفل میں موزوں نہ تھے ۔ لیکن ساتھ ہی آزاد نے یہ کہہ کر غیر شعوری طور پر اس کی تردید بھی کر دی کہ پہلے ایڈیشن کے لیے شاعر کے متعلق مواد فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ، لیکن وہ بروقت دستیاب نہ ہو سکا ۔ ہمارے نزدیک مومن کی شاعرانہ حیثیت کے متعلق آزاد کی رائے کتنی ہی محلِ نظر کیوں نہ ہو ، مومن کو نظر انداز کرنے کے وجوہ غالباً وہ نہ تھے جو آزاد کے معترضین نے بیان

کیے ہیں ۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ کچھ عرصہ پہلے آزاد نے ''شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار'' میں مومن کو جرأت اور ناسخ کے دوش بدوش جگہ دینے میں کوئی تامل محسوس نہیں کیا تھا [٤]۔

یہاں چند اور حقیقی یا قیاسی شکایات کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ مولوی عبدالحلیم شرر کو شکایت تھی کہ شعرائے لکھنو کا پورا پورا حق ادا نہیں کیا گیا [٥]۔ یہ اعتراض فی الاصل کچھ ایسا وقیع نہیں ۔ بعض نے بہادر شاہ ظفر اور الٰہی بخش معروف کے کچھ کلام کی تصنیف کا سہرا ذوق کے سر باندھنے پر بھی اعتراض کیا [٦]۔ بعض کو ذوق کی والہانہ تعریف اور غالب کا نسبتہً سرد مہری سے ذکر بھی ناگوار گزرا ۔ آج جب نئی نسل میں غالب کی تعریف و ستائش پورے عروج پر ہے ، آزاد کے خلاف یہ سب سے سنگین الزام ہے جس نے ان کی ناقدانہ حیثیت کو سخت نقصان پہنچایا ۔ ان کے علاوہ دیگر تاریخی فروگذاشتیں بھی ہیں ، جن کی طبعِ کتاب پر نشان دہی کی گئی ۔ مثلاً آزاد نے میرزا دبیر کا جو نسب نامہ بیان کیا تھا ، اس پر دبیر کے ایک شاگرد نے اعتراض کیا اور ایک رسالہ شائع کر کے مفت تقسیم کیا جس میں شاعر کے شجرۂ نسب اور قدیم شاہی دستاویزات سے مستند ثبوت فراہم کر کے آزاد کی تردید کی گئی [٧]۔

ایک اور معاصر نے اس لطیفے کی صحت پر اعتراض کیا جو انشا کے آخری ایام کے متعلق ''آب حیات'' میں درج ہے ، اور اس کے ثبوت میں انشا کے ماموں زاد نبیرہ ، [٨] مرزا اوج کی سند پیش کی ۔ اس کے متعلق بحث کا دروازہ ابھی تک کھلا ہے اور کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی [٩]۔

چھوٹے چھوٹے نقاد جو اپنی دریافتوں کا چرچا کر کے نام پیدا کرنا چاہتے ہیں ، غالب پرستار اور کٹر مذہبی افراد [١٠] اُس بدنامی کے ذمہ دار ہیں جن کا آزاد اپنی وفات کے بعد شکار ہوئے ۔ نقاد اور مورخ کی حیثیت سے ان کی شہرت گرتی چلی گئی یہاں تک کہ انھیں ادبی نیم حکیم تصور کیا جانے لگا ۔ لیکن اب تاریخ کا رخ پھر اُن کی طرف مڑ رہا ہے اور اُن کے خلوص اور دیانت پر بھروسا کیا جانے لگا ہے ۔ ''آب حیات'' کے مآخذ [١١] کا جائزہ لینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد کے پاس جو مواد تھا وہ اس کے استعمال میں بڑی دیانت داری سے کام لیتے تھے [١٢]۔ شعرا کے احباب اور عزیزوں سے جو خط انھیں موصول ہوئے ، اور جن پر ایک

حد تک انھوں نے کتاب کی بنیاد رکھی، ظاہر کرتے ہیں کہ وہ معلومات کو کس طرح بجنسہ استعمال کرتے تھے اور چھوٹی سے چھوٹی بات کی بھی درج کرنے سے پہلے کتنی چھان بین کرتے تھے۔ میر کی بد دماغی کی شہادت نہ صرف ان کے کلام سے بہم پہنچتی ہے بلکہ معاصرین کے بیانات بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس میں آزاد کے تصرّفات کو دخل نہیں۔ "آبِ حیات" میں غالب کی غزلیات کا انتخاب حالی کے مشورے سے درج کیا۔ ان میں سے ایک کے [۱۳] سوا تمام غزلیں ان کے آخری دور کی بہترین غزلیں تصور کی جاتی ہیں۔ آزاد بڑے ہی دیانت دار ادیب تھے۔ اگر ان سے غلطیاں سرزد ہوئیں، اور یقیناً ہوئیں، تو اس کی وجہ محض ان کی عقیدت تھی، یعنی والہانہ محبت، نہ کہ نفرت، ہمدردی کا فقدان یا دانستہ غلط بیانی۔ ظاہر ہے کہ انھیں ان معلومات کے بارے میں ذمہ دار نہیں گردانا جا سکتا جو انھیں دوسروں نے فراہم کیں، یا کسی بات نے غیر شعوری طور پر ان کے ذہن میں مبالغہ آمیز حیثیت اختیار کرلی۔ لطائف و ظرائف اور قصے کہانیاں دراصل ان برف کے گولوں کی طرح ہیں جو پہاڑ کے دامن پر لڑھکتے ہر طرح کی الم غلم چیزیں اپنے ارد گرد سمیٹ لیتے ہیں۔ ان کا حال بھی اساطیر یا طلسمات کا سا ہے، جن کی اصل بنیاد تو کچھ بھی نہیں ہوتی، لیکن ان پر ایسی حاشیہ آرائی ہوتی چلی جاتی ہے کہ رفتہ رفتہ رائی کا پہاڑ بن جاتا ہے۔ مگر اس معمولی رنگ آمیزی یا مبالغے سے قطع نظر، جو آزاد کی [۱۴] سرشت میں داخل ہے، ایسی کوئی شہادت نہیں ملی کہ آزاد نے اپنے مواد میں تصرّف کیا ہو۔ وہ ذاتی بغض و حسد کی بنا پر کسی کی برائی نہیں کرتے، یہاں تک کہ بعض اوقات اپنے مواد کو، خواہ وہ کتنا ہی مستند کیوں نہ ہو، کسی کے خلاف استعمال کرنے سے پرہیز کرتے ہیں [۱۵]۔ جہاں تک "آبِ حیات" کی تاریخی صحت اور اہمیت کا تعلق ہے، بہتر ہوگا کہ ہم نواب سید نصیر حسن خیال کی تصنیف "مغل اور اردو" پر ڈاکٹر عبدالحق کے تبصرے سے ایک اقتباس پیش کریں:

> "آزاد مرحوم کی 'آبِ حیات' اپنی بعض واقعاتی غلطیوں کے باوجود اردو زبان میں ایک خاص پایہ رکھتی ہے۔ تاریخ کی حیثیت سے نہ سہی، افسانے کی حیثیت سے اسے دیکھیے۔ اس کی زبان اور اس کا اسلوبِ بیان اس قدر شستہ و رفتہ، سلیس اور پاکیزہ اور دل چسپ ہے کہ ہمارے ادب میں اس کی بہت کم مثالیں ہیں۔ آزاد مرحوم کا یہ کیا

کم احسان ہے کہ اس نے سب سے پہلے تاریخِ ادب لکھنے کا ڈول ڈالا اور ہمیں یہ خیال سُجھایا۔ بے شک آزاد کی غلطیوں کو دکھائیے لیکن اس پر لعن طعن کی بوچھاڑ نہ کیجیے۔ خصوصاً ناروا اور بے جا۔ لائق مولف نے اس مرحوم کے متعلق لکھا ہے:

"آزاد مرحوم کی روح نہ شرمائے۔ افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی انشا پردازی کی دھن میں آنکھیں بند کر لیتے اور اپنے قلم کو آزاد کر دیتے۔ ہمارے آزاد اپنی قصہ گوئی میں اکثر بہت بڑھ جاتے ہیں اور ادھر اُدھر نہیں دیکھتے۔ آزاد مرحوم اپنے مورخ ہونے کے مدعی نہیں اور اس لیے وہ تاریخی غلطیاں کر جائیں تو قابلِ معافی ہیں۔ مگر تذکرے کی غلطیاں اور پھر اس طرح کی داستان سرائیاں لائقِ معافی نہیں۔"

لائق مولف، آزاد مرحوم کی جن غلطیوں سے خفا ہیں ان میں سے اکثر صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔ اس کتاب میں جن غلطیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے سوائے ایک آدھ سب صحیح ہیں"۔[16]

درحقیقت ''آب حیات'' بیک وقت بے اندازہ فکاہات اور سنجیدہ تنقید کا مجموعہ ہے جس میں شروع سے لے کر آخر تک شاید ہی کوئی بے کیف عبارت دکھائی دے۔ آزاد دہلی میں پروان چڑھے، اسی کی چہل پہل میں ان کی ابتدائی زندگی بسر ہوئی۔ انھوں نے شعرا کی باہمی چشمکوں، حریفانہ معرکوں اور دوستانہ بزم آرائیوں کی داستانیں سنی تھیں۔ پرانی بوقلموں روایات، لطائف و ظرائف اور قصے کہانیوں کا طومار، جو نسلاً بعد نسلٍ مسخ ہو کر یا حاشیہ آرائی سے کچھ کا کچھ بن کر آن تک پہنچا تھا، انھوں نے اسے اپنے ذہن میں سینت سینت کر رکھا اور پھر "آب حیات" کے اوراق میں آراستہ پیراستہ کر کے پیش کر دیا۔ اس لیے یہ کتاب حقیقی معنوں میں ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ یہ ایک مردہ، جامد و ساکت دنیا کی پرچھائیں نہیں، اس کا ہر ورق ماضی کا زندہ و دلاویز مرقع ہے۔ غالباً وہ دنیا فی الواقعہ ایسی نہ تھی لیکن اسے پیش اس انداز سے کیا گیا ہے کہ اس کے پہلو میں زندگی کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں اور اس لیے وہ سراسر حقیقت ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ ، جس میں اردو زبان کی نشو و نما اور تدریجی ارتقا کا ذکر ہے ، نہایت عالمانہ ہے ۔ آزاد پہلے شخص تھے جنھوں نے اس میدان میں قدم رکھا ۔ باوجودیکہ ان کے پاس مواد کم تھا ، پھر بھی اس مہم میں نمایاں کامیابی ہوئی [۱۷]۔ لسانیات کے بارے میں معلومات انگریزی کتابوں سے حاصل کی گئی ، لیکن ان کی توضیح و تشریح مشرقی ادب کے حوالے سے کی گئی اور جو مثالیں درج کی گئیں وہ آزاد کی اپنی دریافت ہیں اور ان کے اردو اور ہندی میں مطالعے کی وسعت کی خبر دیتی ہیں ۔ برج بھاشا کے افکار ، ذخیرۂ الفاظ اور گرامر پر فارسی اثرات کا جائزہ بھی اتنا ہی وقیع ہے ۔ جدید تحقیق سے کہیں کہیں تاریخی یا لغوی فروگذاشتوں کا پتا چلا ہے ، لیکن اصل عمارت جوں کی توں قائم ہے اور آزاد کے تبحّرِ علمی کی بیّن شہادت پیش کرتی ہے [۱۸]۔ جو بات آزاد کی تحقیق پر صادق آتی ہے وہی ان کی تنقید پر بھی صادق آتی ہے ۔ انھوں نے شعرا کے متعلق جو رائیں دی ہیں ، بڑی صائب اور پُرمغز ہیں اور انھوں نے بعد کی تنقید پر گہرا اثر ڈالا ہے ۔ وہ کبھی کبھی جذبات کی رو میں ضرور بہہ جاتے ہیں ، جیسا کہ ذوق کے حال میں ہوا ، لیکن جب وہ ایک بار سنجیدہ تنقید پر کمر بستہ ہو جائیں تو پھر وہ اپنی ساری بذلہ سنجی اور ہنسی ٹھٹھول بھول جاتے ہیں اور سنجیدگی کے عالم میں ادبی اقدار کے فہم و شعور کا پورا پورا ثبوت دیتے ہیں [۱۹]۔

"آبِ حیات" کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا ۔ ۱۸۸۳ع میں ہم آزاد کو اس کا دوسرا ایڈیشن تیار کرتے ہوئے پاتے ہیں ۔ میجر سید حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں :

میں آج کل عجب مخمصے میں پڑ گیا ... ادھر مجھے کورس وغیرہ کا مرض لگ گیا ، ادھر کالج کا تردد کہ دفعتہً معلوم ہؤا "آب حیات" اور "نیرنگِ خیال" امتحان یونیورسٹی میں داخل ہوگئی ہیں اور امتحان آغاز مئی پر ہوگا ۔ سب نے کہا کہ دونوں کو چھپوانا چاہیے ۔ تین چار سو طالب علم دفعتہً طلب گار ہوگا ۔ مجھے بھی طمع نے للچایا اور فوراً شروع کر دیا ۔ اگر نہایت کوشش ہو اور کارگر بھی ہو اور کئی چھاپہ خانوں سے کام لیا جائے تو دو مہینے چاہئیں ۔ خیر اب تو پھنس گیا ۔ دو دو ہزار چھپوانے شروع کیے ہیں [۲۰]۔ مورخہ ۱۰ فروری ۱۸۸۳ع ۔"

دوسرا ایڈیشن ۱۰ مئی ۱۸۸۳ء کو شائع ہوا۔ پہلے ایڈیشن میں جو فروگزاشتیں رہ گئی تھیں، انھیں دور کر دیا گیا۔ مومن اور ضاحک دونوں پر علیحدہ علیحدہ باب قائم کیے گئے۔ انیس اور دبیر سے متعلق فصلوں کو زیادہ سیر حاصل بنایا گیا۔ ناسخ کے حالات کو پھیلا کر پیش کیا گیا اور بعض چھوٹے چھوٹے سہو، جن کا پتا پہلے ایڈیشن کے بعد چلا، درست کر دیے گئے۔ آزاد، میجر بلگرامی کو لکھتے ہیں:

"۱۲ دن کا عرصہ ہوا کہ ایک نسخہ 'آب حیات' طبع جدید بذریعۂ عریضۂ نیاز ارسالِ خدمت کیا ہے ... کتابِ مذکور میں جابجا بہت سے مطالب زیادہ کیے ہیں مگر میر انیس مرحوم کے خاندان کا حال اور مرزا دبیر مرحوم کا حال آپ سے داد طلب ہے۔ اب کی دفعہ فہرست بھی بہ نسبت طبع اول کے مفصل تر لکھی ہے"[۲۱]۔

"آب حیات" کی تکمیل کے بعد آزاد نے "دربار اکبری" کا بیڑا اٹھایا جو ان کی سب سے ضخیم اور بوجوہ سب سے کم تسلی بخش تصنیف ہے۔ سلاطینِ ہند میں اکبر ان کا پسندیدہ فرماں روا تھا۔ آزاد، عام مسلمانوں کی رائے کے برخلاف، اکبر کو ان کے ملحدانہ عقائد کی بنا پر مرتد قرار نہیں دیتے تھے اور نہ یہ خیال کرتے تھے کہ اس نے دوسری قوموں کو بے جا مراعات دے کر اسلام کے نام کو بٹّا لگایا[۲۲]۔

ان ایام میں میجر بلگرامی کے نام لکھے گئے خطوط سے آزاد کی غیر معمولی محنت کا بھی پتا چلتا ہے۔ مکتوب مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۸۸۳ء میں وہ لکھتے ہیں:

"رات کو دس بجے میں گھر پہنچا۔ اس وقت خطوط اور کارڈوں کا انبوہ سامنے ہے۔ دل دربار میں ہے اور دو دو حرفوں میں سب کو ٹال رہا ہوں ... یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ماثر الامرا اور سوانح اکبری کسی زمانے میں دیکھی تھیں۔ یہاں تلاش تھی اور نہیں ملتی تھیں۔ چند مقاموں پر پرانی کتابوں کا پتا لگا تھا۔ ۲ دن میں بھاگا گیا اور دوڑا دوڑا آیا۔ جو کچھ ہاتھ لگا اسے دیکھتا گیا اور یاد داشتیں لیتا گیا۔ ماثر الامرا بھی مل گئی۔ شکر کا مقام ہے کہ جو کچھ میں نے دانہ دانہ اور قطرہ قطرہ کر کے جمع کیا ہے وہ ماثر الامرا سے بہت زیادہ نکلا۔ پھر

بھی حق سے گزرنا کفر ہے - ہر شخص کے حال میں تین تین چار چار نکتے مل گئے اور اچھے مل گئے - سب سے زیادہ یہ کہ اب جو ''دربار اکبری'' کا مشاہدہ کرے گا، یہ نہ کہہ سکے گا کہ آزاد کو ماٹر ہاتھ نہیں آئی [۲۳]۔''

پھر اس زمانے میں وہ شدید ذاتی پریشانیوں سے بھی دوچار تھے - چنانچہ میجر بلگرامی کو اپنے خط مورخہ ۱۸ جنوری ۱۸۸۳ع میں لکھتے ہیں :

"ایک امر واجب الاطلاع پیش آیا ہے، ذرا متوجہ ہو کر سنیے - آپ نے اخباروں میں دیکھا ہوگا کہ گورنمنٹ ، سر رشتۂ تعلیم کے بوجھ سے سبک دوش ہونا چاہتی ہے - آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ سر رشتۂ تعلیم پنجاب کا بہت سا بوجھ پنجاب یونیورسٹی اپنے سر پر رکھتی ہے - گورنمنٹ کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے - اب معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ کالج بھی یونیورسٹی کے حوالے ہو جائے گا ... سردست اس قدر تو نہ ہوگا مگر اتنا تو ضرور ہوگا کہ یونیورسٹی کے پاس کئی مسجدوں کے مُلّانے اور ہندو پنڈت نکمے بیٹھے ہیں ، طلبائے کالج کو یہ دیسی زبانیں پڑھا لیا کریں گے - کالج کے مولوی (آزاد) اور پنڈت دونوں تخفیف - تب مولوی کا کیا حال ؟ یا گورنمنٹ کوئی عہدہ دے گی - اکسٹرا اسسٹنٹی ؟ مشکل ہے - منصفی ؟ تحصیلداری ؟ شاید پنشن دے دیگی - اس میں ابھی دو برس کی کمی ہے ... اس تجویز کا عمل درآمد اپریل سے ہو جائے گا - اب خدا کی درگاہ سے امید ہے کہ تصنیفات کے لیے فرصت کا موقع ملا کرے گا [۲۴]۔"

اگلے ہفتے اسی موضوع پر انھوں نے میجر بلگرامی کو پھر لکھا :

''میں نے اپنے دل سے یہ قرار دے لیا ہے کہ اگر اکسٹرا اسسٹنٹی دی تو اختیار کر لوں گا ورنہ پنشن لوں گا - تھوڑے پر قناعت کروں گا - اپنی کتابوں کو پوری کوشش سے تیار کر کے پیش کرتا جاؤں گا [۲۵]۔''

یہ وہ زمانہ تھا جب انھیں مہاراجا جموں سے یہ پیشکش موصول ہوئی کہ وہ ایک تاریخ کی کتاب لکھوانا چاہتے ہیں ، جس میں عام سلاطین کے حالات ہوں - مگر زور اس بات پر ہو کہ سلطنت اس خاندان میں کیوں کر اور کن کن اسباب

سے آئی اور کن کن سببوں سے گئی - یہ ان کی زندگی کا بڑا نازک دور تھا اور پیشکش بڑی پُر کشش تھی - آزاد کو اپنی ہی شرائط پر آنے کی دعوت دی گئی تھی لیکن انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا - وہ میجر بلگرامی کو لکھتے ہیں :

"میری اپنی کتابیں ناتمام پڑی ہیں... اور میری جان انھیں میں لگی ہے - (میں) تصنیفات کو پورا کروں گا - اپنے لخت جگر بچوں کو نیم جان تڑپتا نہ چھوڑوں گا [۲۶]-"

اگلے تین مہینے آزاد لگا تار "دربار اکبری" پر کام کرتے رہے - اب وہ تقریباً مکمل ہو چکی تھی - وہ لکھتے ہیں :

"دربار اکبری کو لپیٹ رہا ہوں مگر دو ہی دن جم کر بیٹھا تھا کہ آنکھوں نے رنگ بدلا اور دماغ جواب دینے لگا - خیر میں نے ایک دن آرام کیا اور تخفیف معلوم ہوئی - اب آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے ... اب جو لکھنا تھا میں نے لکھ لیا اور ہر ایک حال مسلسل بھی ہو گیا - جو کام باقی ہے وہ فقط اتنا ہے کہ کہیں کوئی فقرہ بڑھا دیا ، کہیں دو کو ایک کر دیا ، کہیں کوئی لفظ بدل دیا ، کہیں پس و پیش کر دیا [۲۷]-"

جس معیار کی نظر ثانی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس کا اہتمام نہ ہو سکا - اپنے خط مورخہ ۵ جولائی ۱۸۸۷ء میں ، جو انھوں نے ایران سے واپسی پر سید ناصر نذیر فراق دہلوی کو تحریر کیا تھا ، لکھتے ہیں :

"دربار اکبری آٹھ سو صفحے کی کتاب میں نے لکھی ہے - اس میں امرائے عہدِ اکبر کے حالات اس لطف کے ساتھ بیان ہوئے ہیں جس طرح میر ، سودا ، سید انشا کے حالات آپ نے "آب حیات" میں دیکھے - یہ کتاب تیار ہے ، فقط نظر ثانی کی کسر ہے [۲۸]-"

کئی اعتبار سے "دربار اکبری" کی خصوصیات بڑی حد تک دوسری تصانیف سے ملتی جاتی ہیں - وہی والہانہ اکابر پرستی ، وہی لطائف کی بھرمار ، وہی بے تکلف ، مانوس ، باتونی انداز ، وہی ادھر آدھر کے قصے کہانیاں ، سرگوشیاں اور گریز - لیکن بعض دیگر امور میں یہ تصنیف دوسری تصانیف سے کم درجے پر

ہے - اول یہ بے حد ضخیم ہے - ۸۵۰ گنجان صفحات پر مشتمل ؛ یعنی "آب حیات" اور "سخن دانِ فارس" دونوں کو ملا کر بھی ان سے کہیں زیادہ ضخیم - اور پھر اس میں ان جیسی جاذبیت بھی نہیں - دھوم دھام ، غلغلہ آفرینی ، بہادرانہ معرکوں کا تذکرہ اس قدر کہ طبیعت جلد اکتا جاتی ہے - بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد سنجیدہ تاریخ لکھنے کی بجائے کوئی رزمیہ داستان رقم کر رہے ہیں - ایک اعتبار سے یہ کتاب اردو کی اولیات میں داخل ہے - آزاد کو جتنی دلچسپی سیاسی معاملات سے ہے اتنی ہی عمرانی ، اقتصادی اور مذہبی مسائل سے بھی ہے - اور وہ زیر نظر عہد کے ادبیات ، تفریحات ، مذہبی حالات ، ایجادات اور معاشرتی زندگی پر معلومات فراہم کرتے ہیں - قدرتی طور پر ان کا ہدفِ ملامت سب سے زیادہ متشرّع علما اور فقہا ہیں - اگر وہ ان کو ناپسند کرتے ہیں تو اس میں لاگ لپٹ کو چنداں دخل نہیں - کم از کم اس میں ستم رسیدہ شیعوں کی ہمدردی یا حمایت کا جذبہ کارفرما نہیں ، جیسا کہ بعض کا خیال ہے - آزاد ، اکبر کے بہت مداح تھے اور کبھی کبھی ان کی والہیت حد سے بھی بڑھ جاتی ہے - آزاد کی رائے میں اکبر پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے رعایا کو مکمل مذہبی اور فکری آزادی عطا کی -

آزاد نے اکبر کے مذہبی خیالات میں تبدیلی کا جو سبب بتایا ہے ، ہمیں اس سے بحیثیت مجموعی اتفاق ہے - دینِ الٰہی کوئی انانیت کا مجنونانہ خواب نہ تھا بلکہ یہ سارا دھندا علمائے شریعت کے غیر معمولی اقتدار کو توڑنے کے لیے سیاسی حکمت کے طور پر تھا - ہاں یہ بھی درست ہے کہ اکبر کو علما سے نفرت تھی ، جس کے سبب وہ تشکک کی طرف مائل ہوا اور پھر ان کی دنیاداری ، تعصّب ، ذاتی حسد اور جہالت سے متنفر ہو کر علانیہ مرتد ہو گیا -

دیگر تصانیف کی طرح "درباری اکبری" میں بھی ہم آزاد کی شخصیت کو ہر کہیں چھایا ہوا پاتے ہیں - وہ رہ رہ کر قاری سے براہِ راست گفتگو کے لیے اس کا دامن تھام لیتے ہیں - اور باتوں کے طوطے مینا بنانے لگتے ہیں تو بناتے ہی چلے جاتے ہیں - اور ان کے بیانات میں سے بعض بڑے ہی مضحکہ خیز بھی ہوتے ہیں - صرف یہی نہیں بلکہ پند و نصائح کی بوچھاڑ میں بھی کسی واعظ سے کم نہیں - ہم نے اکثر از راہِ تفنّن یہ سوچا ہے کہ اگر اس کتاب کا عنوان "دربار اکبری ، مذہبی رواداری کی وکالت یا شیعہ سنی نزاع پر مبسوط بحث" رکھا جاتا

تو کیسا رہتا ۔ کیا یہ عنوان زیادہ مناسب یا کم از کم زیادہ جامع اور مانع نہیں ؟

"مکتوبات آزاد" سے واضح شہادت ملتی ہے کہ انھوں نے ''دربار اکبری'' کی تصنیف میں کس قدر محنت شاقہ صرف کی ۔ اس سے ان کی صحت پر ، جیسا کہ انھوں نے خود بیان کیا ہے ، شدید اثر پڑا ۔ "آب حیات" کے بعد وہ تھک کر چور ہوگئے تھے ۔ ''دربار اکبری'' پر غیر معمولی محنت ، "تخفیف'' کا اندیشہ ، نصابات کی تیاری اور سرکاری فرائض نے ان کی صحت کو گھن لگا دیا ۔ ''سیر ایران" تو خیر آن کے دلی ذوق و شوق کا نتیجہ تھی لیکن اس نے ان کی رہی سہی قوت جسمانی بھی سلب کرلی ۔ ''دیوان ذوق'' کی ترتیب ، جس کا بیڑا انھوں نے ایران سے واپسی پر آٹھایا تھا ، اور بھی جان لیوا ثابت ہوئی اور وہ اس کا بوجھ برداشت نہ کر سکے ۔ بے شک آن کا عرصہ دراز تک فتور دماغی کا شکار رہنا افسوس ناک ہے لیکن سچ پوچھیے تو یہ قدرت کی طرف سے آن کے جسمانی و ذہنی آرام و سکون کی واحد تدبیر تھی ۔ وہ آرام و سکون جس سے آن کی ان تھک طبیعت ہمیشہ ابا کرتی رہی ۔

* * *

حوالے اور حواشی

۱- نظیر اکبر آبادی جس کی بعض نظمیں میراثی اور گداگر گا کر کسبِ معاش کرتے ہیں -

۲- چ - ن - لام ، از نظام الدین ، دہلی -

۳- مکتوبات آزاد ، ص ۲۴۶ -

۴- نیرنگِ خیال ، حصہ اول ، ص ۹۸ -

۵- اردو شاعری کا نیا دبستان ، ص ۱۷ — ۱۲ -

۶- ایک جدید ادیب نے اس اتہام کو جس شکل میں پیش کیا ہے ، اس کے لیے ملاحظہ ہو حکیم آغا جان عیش پر مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون (مضامینِ فرحت ، جلد دوم ، ص ۱۶۶ — ۱۷۰) جس میں مصنف نے آغا جان عیش کے بارے میں آزاد کی غلط بیانیوں پر روشنی ڈالی ہے -

۷- اردو شاعری کا نیا دبستان (عبدالقادر) ص ۴۵ -

۸- ایضاً - نیز ملاحظہ ہو "گل رعنا" ص ۲۵۸ -

۹- آزاد نے یہ لطیفہ نواب سعادت یار خان رنگین کی سند پر پیش کیا ہے جو شاعر کے گھرے دوست تھے - مگر مرزا اوج تسلیم کرتے ہیں کہ انشا نے نواب سعادت یار خاں کو ناراض کیا تھا جس نے ان کی نقل و حرکت پر پابندیاں عائد کر دی تھیں - (دیکھیے گلِ رعنا ، ص ۲۵۸) -

۱۰- آزاد نے مرزا جان جاناں مظہر پر امرد پرستی کا الزام لگا کر متشرع لوگوں کو سخت رنجیدہ کیا تھا - ملاحظہ ہو : آب حیات، ص ۱۳۹- ۱۴۰-

۱۱- ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۶ -

۱۲- ایضاً

۱۳- دیکھیے مکتوبات آزاد ، ص ۳۴۷ - ۳۴۹ -
۱۴- دیکھیے باب ۹ ، حصہ ۴ -
۱۵- ملاحظہ ہو غالب کے متعلق مولوی ذکاء اللہ کا خط ، ضمیمہ ۵ -
۱۶- ملاحظہ ہو رسالہ اردو ، بابت جنوری ۱۹۳۴ع -
۱۷- ملاحظہ ہو حالی کا تبصرہ ''آبِ حیات'' پر ، "مقالات حالی" ص ۱۴۵ -
۱۸- حال ہی میں آردو زبان کی اصل اور نشو و نما پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے - ملاحظہ ہو "پنجاب میں آردو" از پروفیسر شیرانی اور "دکن میں آردو" از مولانا نصیرالدین ہاشمی - لیکن آزاد نے آردو کی اصل کے بارے میں جو مجموعی نتیجہ نکالا ہے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا - وہ لکھتے ہیں : ''ورنہ جو نظم و نثر کی مثالیں بیان ہوئیں ، ان سے خیال کو وسعت دے کر کہہ سکتے ہیں کہ جس وقت مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہوگا ، اسی وقت سے ان کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر شروع کردیا ہوگا - چندکوی کا کلام مل گیا - اس میں الفاظ موجود ہیں - محمود کے وقت کی نظم یا نثر مل جائے تو اس میں بھی ضرور ہوں گے -'' (پہلا باب ، ص ۲۱) -

۱۹- آزاد کی تنقیدی لغزشوں میں سے ایک انشا کی ''لاآبالیانہ'' شاعری کی تعریف ہے - لیکن سب سے عجیب اور ناقابلِ فہم ولی کی شاعری کا جائزہ ہے - لکھتے ہیں : ''ان کی علمی تحصیل کا حال ہماری لاعلمی کے اندھیرے میں ہے - کیونکہ اس عہد کی خاندانی تعلیم اور بزرگوں کی صحبتوں میں ایک تاثیر تھی کہ تھوڑی نوشت و خواند کی لیاقت بھی استعداد کا پردہ کھلنے نہ دیتی تھی - چنانچہ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قواعدِ عروض کی طرح زبان عربی سے بھی ناواقف تھے -"

جہاں تک علمِ عروض کا تعلق ہے ، آب حیات میں منقولہ غزلوں میں کوئی عروضی سقم نظر نہیں آتا - رہا عربی کا علم تو جس شخص نے ذیل کے اشعار کہے ہوں وہ عربی زبان سے بے بہرہ نہیں ہو سکتا :

حفظ کرنے کوں مصطفے رو کوں
فیہ خیراً و حافظاً پایا

مصحف رخ ترا ہے صورت فجر
مجھ کوں "والنجم اذا ہوی" کی قسم

چہرۂ گل رنگ و زلف موج زن خوبی منن
آیت جنّات تجری تحتہا الانہار ہے

اے ولی ترک کر یہ حرف دراز
کہ ہے خیرالکلام قلّ و دل

الٰہی دل اُپر دے عشق کا داغ
یقیں کے نین میں سٹ کحل مازاغ

۲۰- مکتوبات آزاد ، ص ۵۲ -

۲۱- ایضاً ، ص ۶۷ - ۶۸ -

۲۲- آزاد کا شہنشاہ اکبر کے لیے والہانہ ذوق و شوق ، تمام تر نہ سہی ، بڑی حد تک ، شیعہ اقلّیت کے مِلّی احساس کا نتیجہ تھا - ہندوستان کے شیعہ قرونِ وسطیٰ میں مذہبی غلّو کا شکار تھے اور انھوں نے سنی علماء و فقہا کے ہاتھوں بڑی اذیتیں اٹھائی تھیں - اکبر ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے علماء کے جبر و تشدّد کا مزا چکھا اور اتنی ہمت پیدا کر لی کہ ان کا زور توڑ دیا - آزاد شیعہ تھے اور اکبر کے اسی طرح مداح تھے جس طرح ابتدائی دور کے عیسائی قسطنطائین کے -

۲۳- مکتوبات آزاد ، ص ۳۶ - ۳۷ -

۲۴- ایضاً ، ص ۴۶ - ۴۸ -

۲۵- ایضاً ، ص ۵۱ -

۲۶- ایضاً ، ص ۶۳ -

۲۷- ایضاً ، ص ۶۸ - ۶۹ -

۲۸- ایضاً ، ص ۱۸۳ - ۱۸۴ -

چھٹا باب

سیرِ ایران

(۱)

آزاد کا سفرِ ایران ان کی زندگی کا واحد واقعہ ہے جس کے حالات انھوں نے خود مختصراً قلم بند کیے ہیں ۔ ان کا ارادہ تھا کہ رسالے کی شکل میں اس سفر کی مکمل روداد پیش کریں ۔ لیکن دوسرے زیادہ اہم امور ، بالخصوص دیوان ذوق کی ترتیب نے انھیں مہلت نہ دی ۔ موجودہ باب زیادہ تر اس رسالے پر مبنی ہے جسے آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد نے "سیرِ ایران[1]" کے نام سے ترتیب دیا ہے ۔

ایران کی سیر و سیاحت آزاد کا پرانا خواب تھا ۔ یہ سفر انھوں نے ادبی حج کے طور پر اختیار کیا جس کے اغراض و مقاصد پر رسالہ مذکور میں تفصیلاً بحث کی گئی ہے :

''بندہ آزاد خانماں برباد تباہیِ دہلی کے بعد کئی سال تک سرگرداں پھرتا رہا ۔ جب کئی برس کے بعد قسمت نے قرار پکڑا اور اتنی فرصت ملی کہ اپنے حال پر افسوس کروں تو سب سے زیادہ افسوس مجھے اس کتب خانے کا تھا جو دو پشت سے میرے بزرگوں نے جمع کیا تھا اور میں نے بھی ہمیشہ اس کے بڑھانے اور آراستہ کرنے کی کوشش کی تھی ۔ یہ رنج بردم تازہ ہوتا تھا کیونکہ ہر وقت ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی ، اور یونیورسٹی بھی کسی کو کوئی کتاب نہ دیتی تھی[2] ۔ کیونکہ نہ تو اسے کسی سے مروت تھی اور نہ کسی قسم کی آمد ۔ بعض دفعہ ہر روز ایک نہ ایک نئی کتاب کی ضرورت

پڑتی تھی اور وہ بھی نہ ملتی تھی ... اسی رنج میں خدا سے التجا کی کہ اگر مجھے وسعت ملے تو ایک کتب خانہ نظر گاہ خاص و عام میں آراستہ کروں ... کہ کسی قسم کے ضرورت مند کو کسی بد دماغ سے التجا کرنے کی ضرورت نہ پڑے ۔ الحمدللہ کہ روز بروز کچھ نہ کچھ صورت بنتی گئی ۔ اس عالم میں میں نے انتظام یہ رکھا کہ جو کچھ خدا دیتا، کم اس میں سے خرچ کرتا، باقی جمع کرتا تھا ۔ خانہ بربادوں کی طرح گذران کرتا تھا اور اپنے مبارک ارادے سے خانۂ دل کو روشن کرتا تھا ۔ مجھے یہ بھی خیال آتا تھا کہ میری کئی عمر کی کمائی بھی اس مراد کو پورا نہ کرے گی ۔ اس لیے میں سوچتا تھا کہ جو کتابیں اس ملک میں نایاب ہیں وہ عرب اور ایران میں ارزاں ملیں گی، اس لیے ایک سیاحت ان ملکوں کی کرنی چاہیے ۔

انھیں دنوں تقدیر سے مجھے چند دل شکن صدمے پہنچے، جن میں سے سخت صدمہ ایک جوان بیٹی کی موت تھی [۳]۔ جو حقیقت میں سات بیٹوں سے گراں بہا تھی ۔ وہ میری تصنیفات میں میرا داہنا ہاتھ تھی ۔ اس کے مرنے سے میرا دل ٹوٹ گیا اور تصنیفات کا قلم دان اُلٹ گیا ۔ یہاں تک کہ اکثر ہوش مندوں کو جنون کا شبہ ہوا ۔ پٹیالہ اور لاہور میں اس کا چرچا بھی ہوا ۔

جب سفر کی خبر مشہور ہوئی تو اکثر خویش و احباب نے لکھا کہ صدمے اور ضعف نے آپ کی جان کو دبا لیا ہے ... اور سفر دور کا ہے ۔ خالی گھر ہے، لڑکا نوکری پر ہے، ہمیشہ کون دوست خبر گیری کرتا ہے ۔ بعض اشخاص نے روکا بھی ۔

میں نے جو ضرورتیں تھیں بیان کیں ۔ انھوں نے کہا درست درست، لیکن تنہائی کسی طرح اجازت نہیں دیتی ۔ میں نے کہا ... پہلے بھی تو کئی سفر تنہائی میں کیے ہیں، ان میں بے سامانی تھی [۴] ... انھوں نے کہا وہ عالمِ جوانی تھا ... اب صدمہ ہائے عظیم سے دل ٹوٹ رہا ہے اور پھر آخرِ عمر ۔ خدا نے ہر طرح آسائش کے سامان دیے ہیں، آرام کرنا چاہیے ۔"

مگر آزاد اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم رہے ۔ ان کا ایمان تھا کہ انہیں ملکی مفاد کی خاطر تمام خطرات اور دشواریوں کا سامنا کرنا چاہیے ۔ وہ جانتے تھے کہ فارسی کا مطالعہ روز بروز کم ہوتا جاتا ہے ، لیکن عام گرم جوش انسانوں کی طرح وہ یقین رکھتے تھے کہ اس میں پھر دلچسپی پیدا ہوگی اور اسے پہلے کی طرح عروج حاصل ہوگا ۔

آزاد ۲۳ ستمبر ۱۸۸۵ع کو لاہور سے بذریعہ ریل کراچی روانہ ہوئے ، جہاں وہ اپنے ایک شاگرد کے یہاں کوئی دس دن ٹھیرے ۔ اور پھر ۲ ۔ اکتوبر کو اریبیا نام جہاز پر سوار ہوکر ۱۲ ۔ اکتوبر کو بوشہر جا پہنچے ۔

انھوں نے تیسرے درجے میں سفر کیا ۔ وہ دوسرے درجے کے مصارف برداشت کر سکتے تھے مگر ان کی حب الوطنی نے کہا کہ "اتنے روپے جمع کرکے کتابیں لو تو ایک خانہ الماری کا آباد ہوتا ہے ۔ اس لیے تکلیف مجھے آرام معلوم ہوئی ۔"

ہمیں آزاد کے سفرِ ایران پر تفصیلی نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کن کن مشہور شہروں میں گئے ، کن کن درگاہوں ، مقبروں اور روضوں کی زیارت کی یا یادگاروں کو دیکھا ۔ اس کے اظہار کی بھی ضرورت نہیں کہ وہ کن کن لوگوں سے ملے اور کون کون سی کتابیں خریدیں ۔ آٹھویں دہائی کا ایران آج کل کے ایران سے بہت مختلف تھا ۔ یہ بہ مشکل قرونِ وسطیٰ کی فضا سے ابھر رہا تھا اور آج کل جو سہولتیں اور آسائشیں سفر کو خوش گوار بنا دیتی ہیں ، یعنی ریلیں ، موٹریں ، ہوٹل ، ریستوران وغیرہ ، ان کا اس زمانے میں نام و نشان تک نہ تھا ۔ پھر کفایت شعاری کے تقاضے روپے پیسے سے آرام و آسائش حاصل کرنے کی نسبت کہیں زیادہ تھے ۔ آزاد نے قرونِ وسطیٰ کے یورپین فضلا کی طرح سفر کرنا مناسب سمجھا اور اسی پر اکتفا کیا کہ جو بھی کچا پکا سالن روٹی انڈے وغیرہ کسی گاؤں یا پڑاؤ میں مل جائیں ، غنیمت ہیں ۔ آزاد کی من چلی طبیعت بے آرامیوں پر غالب آئی :

چون عشقِ حرم باشد ، سہل است بیابان ھا

آزاد کو اپنی ان تکالیف میں بھی مزا آتا تھا ۔ ان کا ذوق و شوق بے پایاں تھا ۔ اور اگرچہ انہیں گاہ بگاہ صعوبتوں کا سامنا تھا لیکن دل بستگی اور لطف اندوزی

کے سامان بھی بہت عام تھے ۔ ان کا دل یہ دیکھ کر اچھل اچھل پڑتا تھا کہ کس طرح چھوٹے چھوٹے ہشاش بشاش بچے "فارسی بولتے تھے جیسے ہزار داستاں ، اور اس خوش ادائی سے بات کو ادا کرتے تھے کہ میں منہ دیکھتا رہ جاتا تھا ۔"

وہ بڑے ہی جذباتی اور تشکّر آمیز انداز میں ایران کے مشاہیر اور رؤسا کی مہمان نوازی ، خوش خلقی ، شائستگی اور علم دوستی کا ذکر کرتے ہیں جن کے یہاں وہ مہمان ٹھیرے ۔ بہ حیثیتِ مجموعی ان کا ایران میں قیام بڑا ہی خوشگوار رہا ۔ ان میں فارسی ادب کا رچا ہوا ذوق تو تھا ہی اس لیے ایران کی خوبصورتی ، تہذیب و شائستگی اور دل آویز نظاروں سے انھیں کیف و سرور حاصل ہوا ۔ لیکن بعض اوقات ان کے تصورات چکنا چور ہو کر بھی رہ جاتے ۔ خصوصاً جب سنہرے روپہلے خوابوں کے شاندار محلوں کی بجائے انھیں حقیقت کے بے کیف اور مایوس کن مناظر کا سامنا ہوتا ۔ انھوں نے اپنی چشمِ تصور میں سعدی اور حافظ کی زاد بوم شیراز کے سہانے مناظر کے کیا کیا طلسم نہیں باندھے تھے ۔ لیکن جب انھیں خیاباں خیاباں ارم کی بجائے کچے گھروندے اور بھرے ُپرے گلی کوچوں کے بجائے بے رونق کوچے اور ویرانی و انحطاط کی روکھی پھیکی اصلیت نظر آئی تو وہ دل مسوس کر رہ گئے ۔ آئیے ہم ان کی اپنی زبانی یہ احوال سنیں :

"شیراز کے دیکھنے کا ارمان تھا ، ایک عمر کے بعد خدا نے پورا کیا ۔ اللہ اللہ ! خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کا پیارا وطن جس پر وہ لوگ تعریفوں اور دعاؤں کے پھول چڑھائیں ۔ اس کے دیکھنے کا ارمان کیوں نہ ہو ۔ میں نے دیکھا اور تعجب کے ساتھ دیکھا ۔ کیوں کہ جس شیراز پر نورانی بزرگوں نے نور برسائے تھے اس کی رونق و آبادی ان کے ساتھ ہی رحلت کر گئی ۔ اب بڑی بڑی وسیع اور بلند پرانی مسجدیں اور کہنہ مدرسے گرے پڑے کھڑے ہیں اور بنانے والوں کی ہمتوں پر دلائل پیش کرتے ہیں ۔"

یہی ویرانی کا سماں انھیں دیگر مقامات پر بھی دکھائی دیا :

"دامغان کو اس سے بھی بدتر حالت میں پایا ۔ شاہ رود بدترینِ بدتر ۔ شاہ رود سے داہنے ہاتھ ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر شہر بسطام ہے جو کبھی حضرت بایزید بسطامی کا وطن تھا ۔ نام کی محبت نے ادھر

کھینچا ۔ فقط ایک گاؤں باقی رہ گیا ہے ۔ سبزوار فقط بزرگوں کی زیارت گاہ باقی رہ گئی ۔ نیشاپور کا بڑا خیال تھا ، اس پر رونا آیا ، تمام خرابی اور کھنڈر پڑے تھے ۔"

ھرات سے مشہد کو جاتے وقت انھیں ایک شدید حادثہ پیش آیا جس سے انھیں جان کے لالے پڑگئے ۔ رات میں سفر کرتے وقت ایسی اونگھ آئی کہ وہ اونٹ سے سر کے بل نیچے گر پڑے ، جس سے چھاتی ، کمر اور شانوں پر سخت چوٹیں آئیں ۔ رات بھر لحاف میں لپٹے پڑے رہے ۔ قافلے والوں نے انھیں رسیوں سے اونٹ کی پیٹھ پر کس کر باندھ دیا تاکہ وہ پھر نیچے نہ گر پڑیں ۔ آزاد لکھتے ہیں :

"سب کو خیال تھا کہ مر کر رہ جائے گا ۔ صبح کے قریب منزل پر پہنچ کر رسّا کھولا اور مجھے آواز دی ۔ میں نے کہا "تو کیستی ؟" شتربان نے نام لیا ، مجھے گودی میں اتارا اور بستر پر لٹا دیا ۔ تین دن عجیب حال رہا ۔ کھانسا بھی دکھ دیتا تھا ۔"

واپسی کے وقت آزاد کو یہ شوق چرایا کہ وہ افغانستان کے راستے سے آئیں تاکہ مسافت کم ہو جائے ۔ یہ فیصلہ بہت منحوس ثابت ہوا ۔ اول تو راستے میں انھیں وہ حادثہ پیش آیا جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے ۔ اس کے علاوہ افغانوں کے تشکیکِ مزاج اور ہر بات کرید کرید کر پوچھنے کے باعث انھیں سخت کوفت ہوئی ۔ لوگوں نے سفر کی غرض و غایت کے متعلق سوالات پوچھ پوچھ کر ان کا ناک میں دم کر دیا ۔ ایران میں آزاد نے جس آرام و آسائش سے سفر کیا اس کے برعکس یہاں خطرے ہی خطرے تھے، لہذا یہاں انھیں اس غیر مہمان نواز ملک میں ایسے واقعات پیش آئے جو ستم ظریفی سے خالی نہ تھے ۔ مثال کے طور پر ایک پُر لطف واقعہ ملاحظہ ہو :

"میرے پاس پکانے کا سامان نہ تھا اس لیے بہت سی روٹیاں پکوا کر ساتھ لے لی تھیں ۔ وہ پانچویں دن سڑ گئیں ۔ انھیں سکھایا ۔ ایک جگہ گدھا پانی میں بیٹھ گیا ، وہ بھیگ گئیں ۔ جہاں موقع ملا پھر پکوائیں اور دس دس پندرہ پندرہ دن کی سوکھی پانی کے گھونٹوں سے کھائیں ۔"

افغانوں کی غیر مہمان نوازی اور شک کا کرشمہ ملاحظہ ہو :

"جو سب سے بڑی مشکل تھی وہ یہ تھی کہ بچے سے لے کر بوڑھے تک

اور بہادر سپاہی سے لے کر بڑھیا عورت تک ہر شخص سوال کرتا تھا اور سوال میں سوال کرتا تھا ۔ پھر آنکھیں بدلتا تھا اور کہتا تھا کہ کہاں سے آئے ہو ؟ کیوں آئے ہو؟ کس راستہ آئے ہو؟ کیا لائے ہو؟ اتنی کتابیں کیوں لائے ہو ؟ انھیں کیا کرو گے ؟ یہ کیا کیا کتابیں ہیں ؟ کس کس علم کی کتابیں ہیں ؟ تم اس راستے کیوں آئے ؟ یہاں کیوں بیٹھے ہو ؟ کس راستے جاؤ گے ؟ اس راستے کیوں نہیں جاتے ؟ الٰہی تیری پناہ ! ناک میں دم آ جاتا ۔ جل جل جاتا اور کچھ نہ کر سکتا ۔ ہزار رحمت ہے ملک ایران پر کہ مہینوں وہاں رہا ، جابجا پھرا اور سب سے ملا جلا ، ہر قسم کی بات پوچھتا تھا اور لکھتا تھا ۔ وہ بتاتے تھے اور خوش ہوتے تھے ۔ کسی بات کا شبہ دل میں نہ لاتے تھے ۔"

قندھار میں بھی ایسا ہی ماجرا پیش آیا ۔ آزاد کچھ ایسے شگفتہ مزاج تو تھے نہیں ۔ اس جرح سے تنگ آ گئے اور ایک دن تو سچ مچ آپے سے باہر ہو گئے :

''دو شخص بازار میں ملے اور یہی سوال کیا ۔ میں نے کہا "از ہند آمدہ ام ، باز بہ ہند میروم" پھر پوچھا "چرا آمدی ؟" مجھے بھی غصہ آ گیا ۔ میں نے کہا ''تو بگو کہ چرا می‌پرسی ۔" ایک نے میرا بازو پکڑ کر کہا ''نمی دانی ما می‌توانیم ترا بگیریم و پیش امیر ببریم ۔ تو جاسوسِ فرنگ ہستی ۔'' میں نے کہا "خیلے خوب ! ماہی گوئیم ، امیر صاحب ! مسافر ہستیم ، بہ ملک شما آمدیم ، نمکِ شما خوردیم ، آرام یافتیم ، دعا می کنیم ، می رویم ۔ اینہا ہستند کہ حالا بہ خیرخواہیِ شما دم مے زنند ۔ فوجِ فرنگ می آید در او میروند ۔ نوکری می کنند ۔ یک تخم مرغ بہ چہار آنہ و یک ماکیاں بہ دو روپیہ می فروشند ۔ باز وقتیکہ ایوب خان می آید ، بہ کفر شما فتویٰ می نویسند ۔'' یہ سن کر ایک نے دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا ''گم کنید ۔'' مجھ سے کہا ''برو برو !'' ایک اور شخص سامنے سے آتا تھا ۔ مجھے ٹال کر اس سے بات کرنے لگے ۔ میں نے ہنس کر کہا ''حالا اینہم بفرمائید کہ اسمِ شریفِ شما چیست ؟'' غصہ ہو کر کہا ''برو برو ، بابا برو ۔'' میں نے

اصرار کیا تو نام بتائے۔ خدا جانے صحیح تھے یا غلط تھے۔ میں نے کہا ''شما بکدام محلہ می نشینید ؟'' اس تیسرے شخص نے آن سے پوچھا ''ایں چہ بلا است ؟'' پہلے نے کہا ''چہ بگویم ، ہماں خرس است کہ من سی گذارم او نمی گذارد۔''

آزاد ۲۴ جولائی ۱۸۸۶ع کو واپس لاہور پہنچے۔ ان کے ساتھ کتابوں اور مخطوطات کا انبار تھا۔ اسی شام ان کے صحیح سلامت واپس آنے پر انجمن ہال میں ایک جلسۂ تہنیت منعقد ہوا۔

(۲)

ایران سے واپس آئے تو ان کی عمر تقریباً ۶۰ سال کی تھی۔ صحت بہت بگڑ چکی تھی مگر ان کی محنت اور جفا کشی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ تین سال لگاتار اپنی ناتمام کتابوں پر دیوانہ وار کام کرتے رہے۔ پھر ان پر آہستہ آہستہ دیوانگی مسلط ہوتی گئی اور جلد ہی آن کے دل و دماغ پر تاریکی چھا گئی۔

یہ عالم کوئی بیس برس قائم رہا۔ اس کے دوران میں آزاد اپنے کتب خانے کی کسی حسد پیشہ عاشق کی طرح رکھوالی کرتے رہے۔ وہ لگاتار لکھتے بھی رہے۔ ایسی باتیں جن کا نہ معنی نہ مطلب۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۰ع میں ان کی شمع حیات گل ہو گئی۔ آزاد کو بھاٹی دروازے کے باہر شیعوں کے قبرستان ''کربلا گامے شاہ'' میں دفن کیا گیا۔ ان کے فرزند نے قبر پر سنگِ مرمر لگوایا اور مزار پر چھوٹا سا گنبد بھی تعمیر کیا۔

* * *

حوالے اور حواشی

۱- یہ کتاب، رسالے اور اُس لکچر پر مشتمل ہے جو آزاد نے ایران سے واپسی پر ۲۴ جولائی ۱۸۸۶ع کو انجمن ہال میں دیا تھا۔

۲- پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ابتدا سر ڈونلڈ میکلوڈ کی کوئی دو ہزار کتابوں سے ہوئی جنھیں یونیورسٹی کالج نے ۱۸۷۲ع میں صاحب موصوف سے دو ہزار پانچ سو روپے میں خریدا۔ آغاز اچھا تھا لیکن عرصہ گزر گیا اس میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ۳۰ سال بعد جب مسٹر ولنر اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل اور یونیورسٹی کے رجسٹرار ہوئے تو کتب خانے کا اثاثہ گھٹ گھٹ کر دو الماریوں تک محدود ہو گیا۔ اگلے ۳۰ سال اس کی توسیع و ترقی بڑی حد تک مسٹر ولنر کی مسلسل اور سرگرم جدو جہد کا نتیجہ تھی۔ (اے ہسٹری آف دی یونیورسٹی آف دی پنجاب، ص ۱۳۱)۔

۳- امۃ السکینہ جس کی شادی خلیفہ سید محمد کاظمی ممبر لیجس لیٹو کونسل پٹیالہ سے ہوئی تھی۔ جہاں تک کوائف سے پتا چلتا ہے، وہ بڑی ہی قابل خاتون تھیں۔ مولوی خلیل الرحمٰن، آزاد کے اپنے ہی قول کی بنا پر لکھتے ہیں کہ آزاد نے ان کی بعض تحریریں معمولی رد و بدل کے بعد اپنی تحریروں میں شامل کر لی تھیں اور کئی تبصرے، جو آزاد کے نام سے شائع ہوئے، درحقیقت انھی کے قلم سے تھے۔

۴- غدر کے بعد آزاد کے ادھر آدھر مارے مارے پھرنے کی طرف اشارہ ہے۔

ساتواں باب

آزاد بحیثیتِ شاعر

جس شاعری کا ۱۸۷۴ع میں اس شد و مد اور اتنی بلند توقعات کے ساتھ آغاز کیا گیا تھا وہ پیدائش ہی سے بے جان نکلی ۔ تنقیدی دنیا (یا کم از کم اس کا وہ حصہ جو کچھ اہمیت رکھتا ہے) مدت ہوئی اس پر فاتحہ پڑھ چکی ہے ۔ پیشہ ور نقادوں اور طلبائے ادب کے سوا آج کوئی بھی آزاد کا حسن و عشق سے آزاد کلام نہیں پڑھتا ، اور وہ بھی بطورِ فرض نہ کہ برائے تسکینِ ذوق ۔ معاصرین کے اندازے بسا اوقات غلط ہوتے ہیں اور بعد کی نسلیں انھیں درست کرتی ہیں ، لیکن جہاں تک آزاد کی شاعری کا تعلق ہے ، اس معاملے میں اخلاف بڑی حد تک اسلاف ہی کے فیصلے سے متفق ہیں ۔

ذیل میں کلامِ آزاد کا ازسرِ نو جائزہ لیا جاتا ہے ۔ ہمارا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ آزاد کے معاصرین اپنی کھلم کھلا مخاصمت اور متاخرین اپنی خاموش بے اعتنائی میں کہاں تک حق بجانب تھے ۔

اس ضمن میں یہ یاد رکھنا ازبس ضروری ہے کہ بیانیہ اور وصفیہ شاعری کے جانچنے کے اصول غنائیہ شاعری کے اصولوں سے مختلف ہیں ۔ بیانیہ اور وصفیہ شاعری نثر کے بہت قریب ہے ۔ اس میں تخئیل اور جذبے کا وہ زور نہیں ہوتا جو عموماً غنائیہ منظومات میں پایا جاتا ہے ۔ ایک کامیاب مثنوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ دل چسپ ہو ، اسلوب سلجھا ہوا ، سادہ اور رواں ہو ، موضوع میں کسی قسم کا تجاوز یا انحراف نہ ہو اور شاعر دائیں بائیں دیکھے بغیر آگے بڑھتا چلا جائے ۔ علاوہ ازیں اس میں غیر ضروری آرائش و زیبائش بھی نہ ہو تاکہ قاری کی توجہ نفسِ مضمون سے ہٹ کر ضمنی یا فروعی کوائف میں نہ لگ جائے ۔ اوپر کہا گیا ہے کہ بیانیہ اور وصفیہ شاعری کا دل چسپ ہونا ضروری ہے ۔ دل چسپی سے مراد

یہ ہے کہ داستان یا موضوعِ سخن قاری کے دل و دماغ پر پوری طرح چھا جائے ۔ اور جیسا کہ اُوپر بتایا گیا ہے ، جہاں تک ممکن ہو ، زبان میں کوئی ایسی لغزش یا نقص نہ ہو جس سے قاری اور شاعر میں ہم آہنگی یا رفاقت کا سلسلہ معطل یا منقطع ہو جائے ۔ لہٰذا ہمیں آزاد کی مثنویوں میں غزل کے محاسن کو تلاش نہیں کرنا چاہیے ، بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں کس حد تک کامیاب ہوئے ۔

آزاد کی مثنویوں کے مطالعے سے پہلی بات جو قاری محسوس کرتا ہے ، یہ ہے کہ ان میں سے چند ایک اپنے طرزِ تخیّل میں مضامینِ ''نیرنگِ خیال'' سے گہری مماثلت رکھتی ہیں ۔ ''نیرنگِ خیال'' کے انشائیے تمثیل پر مشتمل ہیں ۔ ان میں مصنف کسی علمی یا سماجی مسئلے پر غور کرتا ہوا سو جاتا ہے ، اور وہی مجرّد خیالات جو اس کے پیشِ نظر تھے ، انسانی روپ دھار کر اس کے سامنے اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں ۔ پھر کسی خارجی عمل کی دخل اندازی سے وہ بیدار ہو جاتا ہے اور وہیں مضمون ختم ہو جاتا ہے ۔ آزاد کی مثنوی ''خوابِ امن'' ، ''دادِ انصاف'' ، وداعِ انصاف'' ، ''گنجِ قناعت'' اور ''مصدرِ تہذیب'' کم و بیش اسی قبیل کی چیزیں ہیں ۔ اور ان میں اور ''نیرنگِ خیال'' کے مضامین میں صرف یہ فرق ہے کہ اول الذکر نثر میں ہیں اور مؤخرالذکر کلامِ موزوں میں ۔ ان مثنویوں کے موضوع فکری ہیں ۔ ان کا تعلق ذہن سے ہے ۔ ان کے مطالعے سے مطالب تو ذہن نشین ہو جاتے ہیں لیکن قاری کے جذبات و احساسات یا متخیّلہ کو تحریک نہیں ہوتی ۔ یہ تحریک حسنِ بیان سے بھی ہو سکتی تھی لیکن یہ مثنویاں حسنِ بیان سے معرّا ہیں ۔ علاوہ ازیں رسمی تکنیک کی تکرار سے ، جس کا ذکر اُوپر آ چکا ہے ، ان کا لطف اور بھی جاتا رہتا ہے ۔

مثنوی 'صبحِ اُمید' کا آغاز قدرتی مناظر سے ہوتا ہے ۔ یہ منظرکشی تمام تر مصنوعی ہے ۔ شاعر کے سامنے کوئی خاص منظر نہیں اور وہ پہاڑ ، دریا ، سبزہ ، درخت ، پھل پھول جیسے پیش پا افتادہ اجزا سے ایک مرکب مرقّع تیار کر دیتا ہے ۔ یہ اجزا آپس میں پیوست ہو کر ایک وحدت میں تبدیل نہیں ہو پاتے ، بلکہ جُوں کے تُوں الگ تھلگ پڑے رہتے ہیں ۔ آزاد کے اس قسم کے مناظر سراسر مصنوعی ہیں اور ہر قدم پر ان کی تفصیلات میں کھینچ تان کا احساس ہوتا ہے ۔

تین مثنویاں ایسی بھی ہیں جن کے چند مقامات ان کی شخصیت کے مظہر ہیں۔ یہاں وہ اپنے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اور یہ مقامات دل چسپی سے خالی نہیں۔ جیسا کہ ایک آگے آنے والے باب میں بیان کیا جائے گا، آزاد گندم نما جو فروش علما اور مذہبی پیشواؤں سے سخت چڑ تھی۔ ان کی مثنوی ''داد انصاف'' میں جب ان کا ذکر آتا ہے تو نظم میں جان پڑ جاتی ہے۔ ذیل کے اشعار ان طبقات کی پردہ دری کرتے ہیں:

زمرۂ علم میں کچھ اور بھی اشخاص آئے
زہد و تقویٰ و ارادت سے بہ اخلاص آئے

بسکہ وابستۂ طاعات و عبادات تھے وہ
خلق میں قبلۂ حاجات و مرادات تھے وہ

فکر نے مکر کی تصویر بنایا تھا انھیں
خرقہ پوشی نے مرقع میں سجایا تھا انھیں

دیتے جاروب سر خاک تھے جامے اُن کے
چھتریاں سر پہ لگاتے تھے عمامے اُن کے

سب کے سب ہاتھوں میں تسبیحیں ہلاتے آئے
عرض حال اپنے وظیفوں میں سناتے آئے

کیا پیری نے تھا روشن رُخ نورانی کو
اور نشان سجدے کے چمکاتے تھے پیشانی کو

پارسائی کے یہ دعوے تھے زمانے میں انھیں
تا بہ دربار بھی سو عذر تھے آنے میں انھیں

تھے مگر اس پہ بھی اک ایک سے آگے جاتے
اور یہ کہتے سُوے دربار تھے بھاگے جاتے

کہ زمانے کا کوئی لطف نہ پایا ہم نے
اور کچھ آرام نہ دنیا کا اُٹھایا ہم نے

آئے دنیا کے نہ افسون فسانہ میں کبھی
اور ہوئے عیش سے واقف نہ زمانہ میں کبھی

لیکن جب انصاف نے انھیں بغور دیکھا تو :

مکر و تزویر ہوئے اُڑ کے ہوائی سارے
دکھل گئے زہد و خدائی و ریانی سارے

یہ جو کہتے تھے کہ دنیا سے ہمیں کام نہیں
بلکہ عورت کا کبھی ہم نے سنا نام نہیں

یاں جو دیکھا تو حریفِ مے و مینا نکلے
ان کے پہچاننے والے بھی وہیں آ نکلے

یعنی کچھ عورتیں کرتی ہوئی زاری دوڑیں
نان و نفقہ کی طلب‌گار بچاری دوڑیں

بچے کچھ کہتے ہوئے دوڑے کہ بابا بابا !
پر یہ شرمائے کھڑے تھے کہ کہیں کیا بابا

اس مثنوی میں انھیں اپنے کم ظرف نکتہ چینوں کے خلاف بھی دل کی بھڑاس نکالنے کا خوب موقع ملتا ہے :

علم کی ذیل میں کچھ لوگوں نے آنا چاہا
بزمِ اعزاز میں رنگ اپنا جمانا چاہا

سندِ علم تو کچھ رکھتے نہ تھے ساتھ اپنے
خونِ معنی سے تھے البتہ بھرے ہاتھ اپنے

قتلِ مضموں تھا زمانے میں فقط کام ان کا
نکتہ چینی سے تھا مشہورِ جہاں نام ان کا

الغرض بڑھ کے وہ جس دم سرِ دربار آئے
لوگ انھیں دیکھتے ہی جوش میں اک بار آئے

اور چلّائے کہ ہے علم سے کیا کام انھیں
مشغلے اور ہی کچھ ہیں سحر و شام انھیں

کوئی تصنیف ہو ان کی تو دکھا دیویں ذرا
ہو جو تقریر کا دعویٰ تو سنا دیویں ذرا

اور یہ کی عرض کہ لکھنا تو نہیں جانتے ہم
پر مٹانے میں ہیں آندھی کو بھی کم جانتے ہم

یہی باعث ہے کہ فرصت نہیں اک آن ہمیں
اس مرض نے ہے نہایت کیا حیران ہمیں

ورنہ تصنیف کریں ہم تو وہ تصنیف کریں
کہ اُسے آپ بھی گر دیکھیں تو تعریف کریں

سن کے اس بات کو اک قہقہہ سارا سب نے
اور کہا کاغذوں پر کرکے اشارہ سب نے

کیا خرافات اُٹھا لائے ہو ، لے جاؤ انہیں
اور کبھی برسرِ دربار نہ پھر لاؤ انہیں

مثنوی ''ابرِ کرم'' اور ''زمستان'' محسوسات سے تعلق رکھتی ہیں اور جہاں کہیں منظرنگاری کی گئی ہے وہاں نظم کا معیار بلند ہوگیا ہے ۔ مثنوی ''ابرِ کرم'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو :

چلنا وہ بادلوں کا زمیں چوم چوم کر
اور اُٹھنا آسماں کی طرف جھوم جھوم کر

بجلی کو دیکھو ، آئی ہے کیا کوندتی ہوئی
سبزے کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روندتی ہوئی

مستی سے جھومنا وہ جوانانِ باغ کا
جھک جھک کے لینا ہاتھ سے گل کے ایاغ کا

سبزے کے عکس سے در و دیوار سبز سبز
سیراب باغ و دشت تو کہسار سبز سبز

ان سبز سبز کیاریوں پہ دل ہیں لوٹتے
طوطی برنگِ طائرِ بسمل ہیں لوٹتے

شبنم عجب بہار ہے اپنی دکھا رہی
موتی بکھیرتی ہے ، جواہر لٹا رہی

سبزے کے برگ برگ میں موتی جڑے ہوئے
شاخ و شجر تمام مرصّع کھڑے ہوئے

پتوں پہ آب و رنگ سے مینا نگار ہیں
ٹپکے اگر ہوا سے تو ہیرے کا ہار ہیں

شبنم کا جوش گر یہی طوفان اُٹھائے گا
ہیرا چمن کی اوس پہ الماس کھائے گا

لو بادل اب گرجتے ہوئے سر پہ آ گئے
اور شامیانے شرق سے تا غرب چھا گئے

کیا مست آیا جھوم کے سرشار ابر ہے
برسے گا آج خوب دھواں دھار ابر ہے

آیا اُمنڈ گھمنڈ کے عجب دھوندو کار ہے
نو دن کی گر لگاوے جھڑی تو بہار ہے

بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں
اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں

وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلک رہے
وہ کیاریاں بھری ہوئی تھالے چھلک رہے

آبِ رواں کا نالیوں میں لہر مارنا
اور روئے سبزہ زار کا دھو کر سنوارنا

گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے
اور گرجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے

ہر جا پہ طائرانِ چمن غول غول ہیں
آپس میں بول بول کے کرتے کلول ہیں

املی کے اک درخت پہ جھولا پڑا ہوا
اور ساتھ اس کے آم کا ٹپکا لگا ہوا

جھولوں میں تو جوان ہیں پینگیں چڑھا رہے
اور بجتے آم کے ہیں پپیہے بجا رہے
ساون کے گیت اُٹھا رہے طوفاں دلوں میں ہیں
پردیسیوں کی یادوں سے ارماں دلوں میں ہیں
ہر تان میں ملار کی مستی کا شور ہے
بادل گرج کے پردے میں دیتا ٹکور ہے

ان اقتباسات میں کئی ایسے اشعار بھی ہیں جن میں تصنّع سے کام لیا گیا ہے اور ان کی وجہ سے نظم کا مجموعی تاثر کمزور پڑ جاتا ہے۔ لیکن اگر بہترین اشعار کا انتخاب کیا جائے تو موسمِ برسات کی ایک عام تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد میں تنقیدِ ذات کی اہلیت کم تھی اور وہ اکثر اپنے کلام کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر رہتے تھے۔

قاری کچھ یوں محسوس کرتا ہے کہ مثنوی 'زمستان' میں جو مناظر پیش کیے گئے ہیں ان کا ہمارے ملک سے کوئی خاص تعلق نہیں، خصوصاً اُن حصوں کا جو یہاں نقل کیے جا رہے ہیں۔ اس معمّے کا حل یہ ہے کہ یہاں آزاد اپنے وسطِ ایشیا کے مشاہدات قلم بند کر رہے ہیں۔ یہ مشاہدات بعینہ وہی ہیں جن کی "سخن دانِ فارس" میں عکاسی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

ایک جھوکا جو ترے حکم کا آ جاتا ہے
تو نباتات کا سب رنگ بدل جاتا ہے

زرد ہو جاتے ہیں سب دشت سے کوہسار تلک
کوہ سے کاہ تلک، باغ سے اشجار تلک

عقل حیراں ہے کہ یہ سونا بکھیرا کس نے
آبِ زر رُوے نباتات پہ پھیرا کس نے

بعض اشجار پہ ہے حکم بہت سخت آتا
پتے پتے کو جلاتے ہوئے یک لخت آتا

دل میں ہر برگ کے یوں آگ لگا دیتا ہے
جس طرح سے کوئی تانبے کو تپا دیتا ہے

پر ترے حکم کے جھونکے میں سوا تیزی ہے
کہ نباتات پہ طوفانِ بلا ریزی ہے

برگ دیکھو تو ہیں سب جھڑ کے سرِ خاک پڑے
اور شجر سب ہیں برہنہ تہِ افلاک کھڑے

دفعۃً پیرِ سحر سانس ہے بھرتا ایسا
یا زمانے پہ وہ کچھ سحر ہے کرتا ایسا

کہ جہاں آنکھوں میں ہو جاتا ہے یک بار سفید
دشت و کہسار سے لے تا در و دیوار سفید

ابر کی طرح بخارات کا گھر کر آنا
برف کے پردے میں وہ روئی دُھنکتے جانا

ہلکے ہلکے کبھی مکڑی کے ہیں جالے اُڑتے
اور ہوا میں ہیں کہیں روئی کے گالے اُڑتے

جا بجا آبِ رواں چلنے سے ہیں تھم جاتے
اور سرچشمہ میں شیشے کی طرح جم جاتے

جو شجر گلشنِ ہستی میں برہنہ تھے کھڑے
یا کہ پتوں کا بڑھائے ہوئے گہنا تھے کھڑے

شجرِ نورِ سرِ طور نظر آتے ہیں
سربسر غیرتِ بلّور نظر آتے ہیں

ہے گزر جب کہ ترا جانبِ دریا ہوتا
اک طلسمات کا گویا ہے تماشا ہوتا

ایسا تُو حکمت و جادو سے جاتا ہے اُسے
سربسر تختۂ الماس بناتا ہے اُسے

کاروانوں کی براہیں ہیں قطاریں جاتیں
جس طرح دشت میں ہرنوں کی ہیں ڈاریں جاتیں

پل میں بے کشتی و پُل پار اُتر جاتے ہیں
سفری سیکڑوں بے لاگ گزر جاتے ہیں

رُوے دریا پہ گزر مثلِ نظر ہوتا ہے
ایسے جاتے ہیں کہ دامن نہیں تر ہوتا ہے

ان مناظر کا اقتباساتِ ذیل سے مقابلہ کیجیے :

''اتنے میں ہوا جاڑے کی سواری لائی ۔ سنسانے چلنے لگے ۔ دیکھتے دیکھتے کیا باغ ،کیا جنگل ، تمام درخت زرد ہوگئے اور زردی بھی وہ کہ گویا عالم زعفرانی ہوگیا ۔ اور بعض درختوں کے پتے تو سر تا پا ایسے سرخ ہو جاتے ہیں جیسے تپایا ہوا تانبا ۔''

''دریاے جیحوں رستے میں ملا ۔ اس پار سے آس پار ایک تختہ آئینے کا تھا ۔ شتری اور اسپی قافلے پیادہ اور سوار برابر چلے جاتے تھے ... چیونٹیوں کی سی قطار عجب بہار دیتی تھی ۔''

یہاں ان دونوں اقتباسات کا اشعارِ بالا سے تقابلی مطالعہ بے جا نہ ہوگا ۔ اس میں شک نہیں کہ مندرجہ بالا اقتباس آزاد کی شاعری کا ایک کامیاب نمونہ ہے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ ہموار نہیں ۔ آزاد بحیثیت شاعر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں اور اگر دو تین قدم سیدھے پڑتے ہیں تو ایک آدھ ٹیڑھا بھی پڑ جاتا ہے ۔ اس کے برعکس نثر کے اقتباسات میں کوئی جھول نہیں ۔ بلکہ ان میں خود اعتمادی ، زور ، بے ساختہ پن اور اعلیٰ درجے کی اثر آفرینی ہے ۔

اس مثنوی میں ایک اور مقام بھی قابلِ ذکر ہے ۔ ہمارا اشارہ اس ٹکڑے کی جانب ہے جہاں شاعر برف سے ڈھکے پہاڑوں اور بڑے بڑے تودوں میں انسانی ، حیوانی یا جنّاتی مخلوقات کے نقوش محسوس کرتا ہے ۔ تعجب کی بات ہے کہ شیکسپیر کے ہاں بھی ہمیں اسی نوعیت کا ایک مرقع ملتا ہے ۔ یہاں اگر آزاد اختصار سے کام لیتے تو مضمون پُرلطف ہو جاتا ۔ آزاد لکھتے ہیں :

جب کہ ہوتا ہے گزر جانبِ کہسار ترا
فنِ صنعت ہے وہاں اور کچھ اے بار ترا

اک طلسمات کا عالم ہے دکھاتا جاتا
صورتیں برف میں کیا کیا ہے بناتا جاتا

اژدہا دامنِ کہسار میں سوتا ہے ابھی
برف کا اسپِ سبک خیز بھی ہوتا ہے ابھی

ہے کہیں دیو کی تصویر نمودار کھڑی
اور پری ہے پرِ پرواز سے تیّار کھڑی

چیتا کہتا ہے کہ میں جست ابھی کر جاتا ہوں
اور ہرن کہتا ہے میں چوکڑی بھر جاتا ہوں

برف کا بیل کہیں سر ہے جھکائے بیٹھا
اور کہیں اونٹ ہے گردن کو اُٹھائے بیٹھا

شیر وابستۂ زنجیر بناتا ہے وہیں
اور کبھی فیل کی تصویر بناتا ہے وہیں

کبھی انسان کبھی حیوان بنا دیتا ہے
اور کبھی صورتِ شیطان بنا دیتا ہے

اور شیکسپیر :

Sometime we see a cloud that's dragonish ;
A vapour sometime like a bear or lion,
A tower'd citadel, a pendant rock,
A forked mountain, or blue promontory
With trees upon't.

آخر میں ہم قاری کی توجہ آزاد کی ایک غیرمعروف نظم "جغرافیے کی پہیلی" کی جانب منعطف کرانا چاہتے ہیں ۔ یہ نظمِ معرّا کی ایک کامیاب مثال ہے جس میں درمیانی وقفے سے مصرع کو دو برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ ابتدا میں قاری کو احساس نہیں ہوتا کہ نظم غیرمقفلی ہے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں شعر کے آخر میں وقفہ نہیں ، بلکہ خیال بیت کی حدود عبور کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اسی طرح قاری بھی بلا توقف آگے نکل جاتا ہے ۔ یہاں شعری اکائی شعر یا بیت نہیں بلکہ بند ہے ۔ جب ہم اس نظم کو پڑھتے ہیں تو سوچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اگر آزاد نے اس قسم کی نظموں میں طبع آزمائی

کی ہوتی تو آج انھیں اردو نظم کی تاریخ میں بحیثیتِ موجد ایک مستقل مقام حاصل ہوتا :

ہنگامۂ ہستی کو گر غور سے دیکھو تم
ہر خشک و ترِ عالم صنعت کے تلاطم میں
جو خاک کا ذرہ ہے یا پانی کا قطرہ ہے
حکمت کا مرقّع ہے جس پر قلمِ قدرت
انداز سے جاری ہے اور کرتا ہے گل کاری
اک رنگ کہ آتا ہے سو رنگ دکھاتا ہے
اور دیکھنے والوں کی آنکھیں تو کھلی ہیں پر
خرمہرۂ رنگیں یا بلّور کے ٹکڑے ہیں
ہر لحظہ و ہر ساعت قدرت کے تماشے ہیں
عالم میں پڑے ہوتے پر اُن کو نہیں پروا
ہرگز کہ یہ سب کیا ہے اور ہے تو سبب کیا ہے

اردو شاعری کے مصلح کی حیثیت سے آزاد کے پیش نظر دو باتیں تھیں : جدّتِ معنی اور اصلاحِ بیان ۔ جہاں تک بیان کا تعلق ہے وہ شاعرانہ زبان اور تشبیہات اور استعارات کو ، جو غزل گوؤں کے ہاں پٹ پٹا کر ناکارہ ہو چکے ہیں ، ترک کرنے کے حامی تھے ۔ اس لحاظ سے بطور شاعر آزاد کو نمایاں کامیابی نہیں ہوئی ۔ کیونکہ جونہی کوئی عاشقانہ لے چھڑ جاتی ہے ، وہ غیرشعوری طور پر اسی پرانی ڈگر کی طرف نکل جاتے ہیں ۔ یہ بات ان چند مثالوں سے ظاہر ہے :

اک گل عذار سامنے سرگرمِ ناز ہے
اور جام دے رہی نگہِ نیم باز ہے

پیدا ہوئے نئے نئے روشن ضمیر ہیں
نکلے نئے ستارے سرِ چرخِ پیر ہیں

سنگِ مرمر کی لبِ آب جو اک سِل ہے پڑی
اس پہ اک رشک پری ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی

نوجوانانِ چمن بزم سجاتے ہی نہیں
فرش گلہائے بہاری کا بچھاتے ہی نہیں
سرکشی سروِ سرافراز دکھاتے ہی نہیں
سینہ زوری کے بگولے ادھر آتے ہی نہیں

زلف سنبل کی سیہ تھی پہ سیاہ کار نہ تھی
خم تو تھے اس میں مگر پیچ سے خم دار نہ تھی
سرِ شمشاد کا طُرہ وہاں طرّار نہ تھا
شوخیِ چشم سے نرگس کو سروکار نہ تھا

مستی سے جھومنا وہ جوانانِ باغ کا
جُھک جُھک کے لینا ہاتھ سے گل کے ایاغ کا
بجلی کبھی نگہِ فتنہ ساز سے
کرتی نقابِ ابر میں چشمک ہے ناز سے

ناگاہ ایک آئی پری زاد سامنے
کی رمز گل سے بلبلِ رنگیں کلام نے

اس فروگذاشت میں آزاد اکیلے نہیں ۔ درحقیقت زبانِ شاعری کی اصلاح کا معاملہ نہایت پیچیدہ ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے غیر معمولی قابلیت ، بالغ نظری ، اور احتیاط کی ضرورت ہے ۔ اکثر شعرا کا پانی یہیں مرتا ہے ۔ جدید اردو شاعری میں ایک حالی ہی ایسے شاعر ہیں جنھوں نے "مسدس" اور دیگر نظموں میں غزل کی زبان کو استعمال نہیں کیا اور بچ بچا کر نکل گئے ہیں ۔ اقبال کی زبان بیشتر غزل کی زبان ہے ۔ بہت سے جدید شعرا بھی ہیں جنھیں ماضی کی اقدار سے بغاوت کا دعویٰ تو ہے لیکن اپنی نظموں میں اکثر بلاتکلف غزل ہی کی زبان

استعمال کر جاتے ہیں ۔

آخر میں ہمیں یہ کہنا ہے کہ آزاد طبعاً شاعر نہ تھے ۔ یہاں شاعری سے مراد کلام موزوں ہے ۔ ورنہ آزاد کی نثر میں بار بار ایسے مقام آتے ہیں جہاں شاعری کی روح رواں دواں نظر آتی ہے ۔ تعجب کی بات ہے کہ نظم کے ضوابط جو شعرا کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں ، آزاد کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے بجائے پابندِ سلاسل کر دیتے ہیں ۔ آزاد کو اس امر کا خود بھی احساس تھا ۔ لکھتے ہیں "میں نثر کے میدان میں بھی سوار نہیں ، پیادہ ہوں اور نظم میں خاک افتادہ ، مگر سادہ لوحی دیکھو ، ہر میدان میں دوڑنے کو آمادہ ہوں ۔"

آزاد کی زندگی میں شاعری ایک سانحے کی سی حیثیت رکھتی ہے اور ان کا ادبی مقام متعین کرنے کے لیے ان کی نثر ہی کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے ۔

* * *

آٹھواں باب

آزاد بحیثیتِ انسان

(۱)

انیسویں صدی کا نصفِ ثانی برّعظیم پاک و ہند کی تاریخ میں معاشرتی اصلاح کا دور ہے ۔ اس زمانے کے قریب قریب تمام اہم مصنّف معاشرتی اصلاح کے علم بردار ہیں ۔ اس لحاظ سے آزاد کا مزاج اپنے دور کے عام مزاج سے بالکل مختلف تھا ۔ بے شک انھیں یہ احساس تھا کہ ہندوستان کا معاشرتی نظام اصلاح طلب ہے ، لیکن انھوں نے کبھی بھی علی گڑھ تحریک کے اربابِ قلم کی طرح اصلاح کی ناگزیر ضرورت بہ شدت محسوس نہیں کی ، اور اس مختصر مدت کو مستثنٰی جانتے ہوئے جب وہ ''انجمن پنجاب'' کے معتمد تھے ، انھوں نے معاشرتی اصلاح میں کوئی دل چسپی نہیں لی ۔

آزاد نے اس مذہبی احیا کے والہانہ ذوق و شوق سے بھی کوئی دل بستگی ظاہر نہیں کی جو انیسویں صدی میں برّعظیم کے ادبا کی ایک نمایاں خصوصیت تھی ۔ اس لحاظ سے وہ اپنے دور کے عام رجحان سے الگ تھے ۔ وہ ادیب اور صرف ادیب تھے اور ان کی دنیا تمام تر ادب ہی کی دنیا تھی ۔

(۲)

آزاد مذہباً شیعہ تھے ۔ ان کا میلان ، جیسا کہ ان کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے ، رواداری کی طرف تھا اور ان کی نظر میں مذہب ، اہلِ بیت کے ساتھ محبت اور تعظیم و تکریم کی صورت میں بدل چکا تھا ۔ ان معنوں میں وہ بے حد مذہبی

آدمی تھے - لیکن آن کے نزدیک مذہب کے معنی دوسرے مدرسہ ہائے فکر سے نفرت اور دوسرے قائدین کی توہین نہ تھے - ان کی رائے میں مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور اس کی روح رواداری ہے - ذیل کی تحریر آن کے مسلک کی آئینہ دار ہے :

"مذہب کے معاملے میں ایک میرا خیال ہے ، خدا جانے احباب کو پسند آئے یا نہ آئے - ذرا خیال کرکے دیکھو ! اسلام ایک ، خدا ایک ، پیغمبر ایک - سنّی اور شیعہ کا اختلاف ایک منصبِ خلافت پر ہے جس کے واقعے کو آج کچھ کم ۱۳ سو برس گزر چکے ہیں - وہ ایک حق تھا کہ سنّی بھائی کہتے ہیں جنھوں نے لیا حق لیا - شیعہ بھائی کہتے ہیں کہ نہیں ، حق اوروں کا تھا ، ان کا نہ تھا - اگر پوچھیں کہ انھوں نے اپنا حق آپ کیوں نہ لیا ؟ جواب یہی دیں گے کہ صبر کیا اور سکوت کیا - تم لینے والوں سے لے کر اس وقت دلوا سکتے ہو ؟ نہیں - لینے والے موجود ہیں ؟ نہیں - طرفین میں سے کوئی ہے ؟ نہیں - اچھا جب یہ صورت ہے تو آج ۱۳ سو برس کے بعد اس معاملے کو اس قدر طول دینا کہ قوم میں ایک فسادِ عظیم کھڑا ہو جائے ، چار آدمی بیٹھے ہوں تو صحبت کا مزا جاتا رہے ، کام چلتے ہوں تو بند ہو جائیں ، دوستیاں ہوں تو دشمنی ہو جائیں ، دنیا جو مزرع الاخرۃ ہے ، اس کا وقت کارہائے مفید سے ہٹ کر جھگڑے میں جا اُلجھے ، قوم کی اتحادی صورت ٹوٹ کر چند در چند نقصان گلے پڑ جائیں - یہ کیا ضرور ہے - بہت خوب ، تم ہی حق پر سہی - لیکن اُنھوں نے سکوت اور صبر کیا - پس اگر ان کے ہو تو تم بھی صبر اور سکوت ہی کرو - زبانی بد گوئی اور بد کلامی کرنی اور بھٹیارنیوں کی طرح لڑنا کیا عقل ہے اور کیا انسانیت ہے ؟ کیا تہذیب ہے ؟ کیا حسنِ خُلق ہے ؟

"۱۳ سو برس کے معاملے کی بات ایک بھائی کے سامنے اس طرح کہہ دینی جس سے اس کا دل آزردہ بلکہ جل کر خاک ہو جائے ، اس میں خوبی کیا ہے ؟ میرے دوستو ! اول ایک ذرا سی بات تھی - خدا جانے کن کن لوگوں کے جوشِ طبع اور کن کن سببوں سے

تلواریں درمیان آ کر لاکھوں خون بہہ گئے - خیر ، اب وہ خون خنک ہو گئے - زمانے کی گردش نے پہاڑوں خاک اور جنگلوں مٹی ان پر ڈال دی - ان جھگڑوں کی ہڈیاں اکھیڑ کر تفرقہ کو تازہ کرنا اور اپنائیت میں فرق ڈالنا کیا ضروری ہے ...

"محبت تم جانتے ہو کیا شے ہے ؟ ایک اتفاق پسند ہے - تمھیں ایک شے بھلی لگتی ہے اور دوسرے کو بھلی نہیں لگتی - اسی طرح بالعکس - کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جو چیز تمھیں بھاتی ہے وہی سب کو بھائے ؟ یہ بات کیوں کر چلے گی ؟ ابوالفضل ہی نے ایک جگہ کہا ہے ، اور کیا خوب کہا ہے ، کہ جو شخص تمھارے خلاف رستہ پر چلتا ہے ، یا حق پر ہے یا ناحق پر - اگر حق پر ہے تو احسان مند ہو کر پیروی کرو - ناحق پر ہے تو یا بے خبر ہے یا جان بوجھ کر چلتا ہے - بے خبر ہے تو اندھا ہے ، واجب الرحم ہے ، اس کا ہاتھ پکڑو - جان بوجھ کر چلتا ہے تو ڈرو اور خدا سے پناہ مانگو - غصّہ کیا اور جھگڑنا کیا ...

"ہم سب ایک ہی منزلِ مقصود کے مسافر ہیں - اتفاقاً گزرگاہ دنیا میں یک جا ہو گئے ہیں - رستے کا ساتھ ہے - بنا بنایا کاروان چلا جاتا ہے - اتفاق اور ملنساری کے ساتھ چلو گے ، مل جل کر چلو گے ، ایک دوسرے کا بوجھ اٹھاتے چلو گے ، ہمدردی سے کام بٹاتے چلو گے تو ہنستے کھیلتے رستہ کٹ جائے گا - اگر ایسا نہ کرو گے اور ان جھگڑالوؤں کے جھگڑے تم بھی پیدا کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے - آپ بھی تکلیف پاؤ گے ، ساتھیوں کو بھی تکلیف دو گے - جو زندگی خدا نے دی ہے بد مزہ ہو جائے گی !-"

(۳)

آزاد کو اس ارضی زندگی سے گہری دل چسپی تھی اور ان کی تمام تر توجّہات کا مرکز یہی تھی - انھیں دوزخ اور جنّت سے انکار نہ تھا - لیکن

انھوں نے جہنم کے عذاب اور جنّت کی راحتوں کو حیاتِ دنیوی سے غیر متعلق تصور کرتے ہوئے نظر انداز کر رکھا تھا - وہ انھیں قرونِ وسطیٰ کے روحانی نظام کا جز خیال کرتے تھے جو دورِ حاضر کے لیے موزوں نہیں تھا - چنانچہ "نوطرزِ مرصّع" میں لکھتے ہیں :

تبدیل جب کہ نور سے رنگِ سحر ہوا
اک مدرسہ کے آگے سے اس کا گزر ہوا
تھا پاس اک خرابہ مسجد پڑا ہوا
مُلّا تھا اس میں برسرِ منبر چڑھا ہوا
تھا ہر طرف کو دامنِ تقریر کھینچتا
اور دوزخ و بہشت کی تصویر کھینچتا
حور و قصور پر تھا دلوں کو لبھا رہا
دوزخ دکھا کے خلقِ خدا کو ڈرا رہا
تھے لوگ اس کی باتوں پہ مدہوش ہو رہے
اور معتقد تھے سب ہمہ تن گوش ہو رہے
دیکھا جو نوجوان کو اس مردِ پیر نے
اپنی لکیر پیٹی پرانے فقیر نے
یعنی کہ آؤ خلد کا نقشہ دکھائیں ہم
بیٹھو کہ تم کو عرش کے اوپر اُڑائیں ہم
بولا جوان کہ اب وہ زمانے گزر گئے
وہ رات ہو چکی ، وہ فسانے گزر گئے

(۴)

آزاد کو ان سماجی طفیلیوں ، یعنی فقرا اور علما ، سے بھی کوئی عقیدت نہ تھی جو مرشدانِ روحانی بن کر جہلا کو اپنی اغراض کا آلہ کار بناتے ہیں -

لالہ دنی چند کے نام آن کا ایک بڑا دل چسپ خط ہے ۔ لکھتے ہیں :

"ایک اور مجتہد صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں ۔ میں تو ان کے ڈر کے مارے نواب صاحب کے ہاں شملہ سے آ کر نہیں گیا ۔ میرے نزدیک بہ نسبت ان لوگوں کے کہ جہاں جائیں دو وقتہ تر نوالے پلاؤ قورمہ کے کھاتے ہیں اور گٹھڑیاں باندھ باندھ نقد و جنس لے جاتے ہیں ، وہ دلی کے تباہی زدہ زیادہ تر استحقاق رکھتے ہیں کہ نہ کوئی انھیں دیتا ہے ، نہ کوئی ان میں سے مانگ سکتا ہے ، اور سینکڑوں فاقے گزر جاتے ہیں ۲۔"

مذہبی امور میں آزاد تقلیدِ محض کے قائل نہ تھے ۔ وہ روشن خیال تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ ادارے انسانوں کے لیے ہیں ، نہ کہ انسان اداروں کے لیے ۔ ان کے نزدیک فقہ یا شریعت کا مقصد فقط انسانوں کی خوشنودی اور بہبودی ہے ۔ اس سلسلے میں ان کا آخری فیصلہ عقل و دانش کی بات ہی کو سند مانتا ہے ۔ "دربارِ اکبری" کے یہ الفاظ قابلِ توجہ ہیں :

"مجتہد کا یہی کام نہیں کہ آیت یا حدیث یا کسی فقہ کی کتاب کے معنی بتا دے ۔ کام اس کا یہ ہے کہ جہاں صراحۃً آیت یا حدیث موجود نہیں یا کسی طرح کا احتمال ہے ، یا آیتیں یا حدیثیں بظاہر معنوں میں مختلف ہیں ، یہ وہاں ذہنِ سلیم کی ہدایت سے استنباط کر کے فتویٰ دے ۔ جہاں دشواری پیش آئے وہاں مصالحِ وقت کو مدِ نظر رکھ کر حکم لگائے ۔ آیت و حدیث عین مصالحِ خلق اللہ ہیں ۔ ان کے کاموں کو بند کرنے والی یا آن کو حد سے زیادہ تکلیف میں ڈالنے والی نہیں ہیں ۳۔"

دوسرے مذاہب کی طرف آزاد کا رویہ روادارانہ تھا اور ان کی نظر متحدہ ہند پر مرکوز تھی ۔ اس لیے اکبر کا عہد ، جس میں ہندو اور مسلمان بہت قریب ہوگئے تھے ، (اتنے کہ پہلے یا بعد میں کبھی نہیں ہوئے) تاریخِ ہند میں ان کی نظر میں اسلام کا سنہری دور تھا ۔ ہندوؤں میں آن کو راجہ مان سنگھ خاص طور پر پسند تھے :

"راجہ مان سنگھ ! اخلاق تاریخ میں تمھارا نام سنہری حروف میں

قیامت تک روشن رہے گا۔ اخلاق اور بے تعصبی تمہارے مبارک نام پر ہمیشہ پھول اور موتی برسائے گی۔ تمہارا سر ایسے پھولوں کے ہاروں سے سجا ہے جن کی مہک قیامت تک دماغِ عالم کو معطّر رکھے گی۴۔''

آزاد کی رائے میں مان سنگھ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے مذہب پر سختی سے قائم رہتے ہوئے، مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کیے رکھا۔ آزاد اس کے قائل تھے کہ بعض اخلاقی اوصاف اسلام اور ہندو مت میں مشترک ہیں اور حقیقی پرہیزگاری انھی اوصاف کو ترقی دینے میں مضمر ہے۔

(۵)

آزاد کو ادب سے بے حد لگاؤ تھا جو مرورِ وقت کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ تحقیق کا شوق اور کتابوں سے لگاؤ ان کی سیاحتِ ایران اور میجر بلگرامی کے ساتھ خط و کتابت سے پوری طرح آشکار ہے۔ مگر سچ پوچھیے تو ان کا دلی ذوق و شوق اس کھلی چٹھی میں جھلکتا ہے جو انھوں نے "آبِ حیات" کے خیرمقدم پر شائع کی۔ بہت کم تحریریں ایسی ہیں جن میں ادب اور خدمتِ خلق کا جذبہ اس شدت سے نمایاں ہوا ہو:

''اردو اور انگریزی کے متعدد اخبار میری نظر سے گزرے جن کے عالی وقار ایڈیٹروں نے اور سخن شناسوں نے میری ناچیز تصنیف یعنی ''تذکرۂ آبِ حیات'' پر ریویو لکھے ہیں۔ ان میں دیکھتا ہوں کہ بعض میرے مقدّس بزرگ ہیں، بعض مکرّم و معظّم مخدوم ہیں، اکثر میرے بڑے پیارے دوست ہیں۔ حقِ شکریہ کیوں کر ادا کروں۔ ہاں حق یہی ہے کہ اپنی تمام کوشش، تمام طاقت، تمام وقت بلکہ اپنی جان و مال کو اپنے پیارے ہم وطنوں کے کام پر قربان کر دوں۔ اور جو خیالات صلاح و اصلاح اور تہذیب و تعلیم کے رکھتا ہوں انھیں لکھوں اور پھیلاؤں کہ عالمِ طالب علمی سے یہی میرا ارادہ اور دلی آرزو تھی۔

مجھے یاد ہے ، اور میرے ہم درس بھائیوں کو یاد ہوگا ، کہ جب دہلی کالج مرحوم زندہ تھا اور میری تحصیل اس کے دامن تربیت میں پرورش پا رہی تھی تو ڈاکٹر سواٹ[٦] صاحب کمشنر مدارس کلکتہ سے تشریف لائے ۔ جب کالج میں آئے تو میری جماعت کا بھی جزوی سا امتحان لیا اور ہر طالب علم سے پوچھا کہ تم مدرسے سے نکل کر کیا کرو گے ؟ ایک ایک نے اپنا خیال بیان کیا ۔ اے میرے پیارے اہل وطن ! تمہارے آزاد کی زبان سے اس وقت بھی یہی لفظ نکلا کہ تحصیل علوم کروں گا اور جو کچھ خیالات ہیں یا ہوں گے انھیں اہل وطن میں پھیلاؤں گا ۔ جب سے اب تک مجھ پر اور میری طبیعت پر ہزاروں انقلاب گزر گئے ، مگر الحمد للہ وہ ارادہ بدستور قائم ہے اور خدا کا شکر کرتا ہوں کہ قائم رہے ... دنیاوی ترقیوں نے بہت شان دار آرائش و آسائش کے درجے پیش قدم دکھائے مگر اسی ارادے کی محبت تھی جس نے تعلیم کے سلسلے سے مجھے نہ نکلنے دیا اور ہرگز کسی ملکی یا مالی عہدے کی طمع دامن گیر نہ ہوئی ... اکثر ذوق و شوق کا وقت تھا کہ سوسائٹیوں اور کمیٹیوں کے مضامین لکھنے میں اڑ گیا ۔ بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سررشتۂ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا ۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے انھوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی ۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا ۔ پھر انھیں بار بار کاٹنا اور بنانا ، لکھنا اور مٹانا ۔ بڈھا ہو کر بچہ بننا پڑا ۔ پھرتے چلتے ، جاگتے سوتے بچوں ہی کے خیالات میں رہا ۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے ۔ خیر ، میرے پیارے اہل وطن ! تمھاری خدمت نہ کی ، تمھارے بچوں کی خدمت کی ۔ مگر کاش وہ دن جو میری عمر کی فصل بہار تھی ، طبیعت جوان تھی ... ان تصانیف میں خرچ ہوتے جن سے میرے دل کے ارمان نکلتے ۔ ملک کی صلاح و اصلاح ہوتی ، گورنمنٹ کے مقاصد پورے ہوتے ۔ تمھاری نظر سے گزرتے ، تم خوش ہوتے اور میرا دل خوش ہوتا ۔ لیکن بندگی

بے چارگی - آخر نوکر تھا - وہ نہ کرتا تو کیا کرتا - اے اہل وطن ! میں اس حال میں بھی تمھیں بھولا نہیں - جو وقت نوکری کے کام سے خالی پاتا تھا ، اس میں آرام نہ کرتا تھا - بہت کم سوتا تھا - اپنی معلومات کو اور جو اس سے خیالات پیدا ہوتے تھے ، لکھتا تھا اور رکھتا جاتا تھا - اسی میں سے یہ اوراق پریشاں نکالے اور "آب حیات" کا جام بنا کر تمھاری ضیافت طبع کے لیے حاضر کیا - اب افسوس ہے اور افسوس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ میں تھک گیا اور ہاتھ پاؤں میں سکت نہ رہی - دل و دماغ فرسودہ ہوگئے - اب مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا - آخر کہاں تک ؟ محنت کی بھی حد ہوتی ہے - کتنی کتابیں اور رسالے ہیں مگر مسوّدے دھرے ہیں - کئی ناتمام پڑے ہیں - بہت سے خیالات دل کے دل میں گرہ ہیں - اتنی طاقت نہیں کہ نکل سکیں ...

ہاں خدا میں سب قدرت ہے - وہ چاہے تو اب بھی سب کچھ ہو سکتا ہے - اے پروردگار ! دنیا کے لوگ تجھ سے دنیا کی نعمتیں : دولت ، حشمت ، منصب و جاگیر ، ملک املاک کیا کیا کچھ مانگتے ہیں اور 'تو دیتا ہے - تیرا آزاد تجھ سے یہی مانگتا ہے اور تو اسے یہی دے دے - تیرے آگے کیا بڑی بات ہے - اس وقت یہ مقام لکھ رہا ہوں ، خلق خدا پڑی سوتی ہے اور آدھی رات بج رہی ہے - کیا عجب ہے کہ دعا قبول ہوئی ہو - آمین ثم آمین [۱۷]"

(٦)

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ آزاد بڑے کینہ پرور اور متعصّب شخص تھے ، لیکن اس کی تائید نہ ان کی تصانیف سے ہوتی ہے اور نہ خطوط سے - یہ سوے ظن ''آب حیات'' کی بعض تحریروں پر مبنی ہے جنھیں تعریض پر محمول کیا گیا - آزاد کی ''آب حیات'' میں بیان کردہ آراء اگرچہ درست ہیں لیکن ان پر ان لوگوں نے 'برا مانا جو بعض شعرا کے شدّت سے مدّاح تھے - اس کے معنی

یہ نہیں کہ آزاد کسی بات کا بُرا نہیں مناتے تھے یا اپنے دکھوں اور تکالیف کی شکایت نہیں کرتے تھے - اُنھیں زندگی میں کتنی ہی مایوسیاں پیش آ چکی تھیں ، جن میں اصلاحِ شاعری کی تحریک کی شدید مخالفت بھی شامل تھی - اُنھوں نے تو یہ سمجھ کر اس میدان میں قدم رکھا تھا کہ اس سے نیک نامی حاصل ہوگی مگر ہوا یہ کہ انھیں تضحیک اور سبّ و شتم کا نشانہ بننا پڑا جس سے ان کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا - ایسے تلخ تجربات انسان کے مزاج پر اچھا اثر نہیں ڈالتے - اس لیے آزاد کا یہ خیال بے جا نہ تھا کہ ان کی ناکامی کا سبب منظم حاسدانہ مخالفت کے سوا اور کچھ نہیں -

پھر بھی آزاد بدمزاج اور حسد کیش نہ تھے - اُن کے کردار میں دو باتیں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں - ان کی سادہ مزاجی اور حسّاس طبیعت - جو کچھ اُن کے دل میں ہوتا تھا جھٹ زبان پر آ جاتا تھا - وہ شاذ و نادر "پہلے بات تولو پھر بولو" کے مقولے پر عمل کرتے تھے - اُن کی پسند اور اُن کی نفرت دونوں میں تندی و تیزی تھی ، اس لیے دونوں میں شدت ہی شدت ، مبالغہ ہی مبالغہ آ گیا - وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتے - اُن میں اور دوسرے لوگوں میں ، جو شدتِ غضب میں بھی ضبط قائم رکھتے ہیں ، یہ فرق نہیں تھا کہ آزاد اُن سے زیادہ شوریدہ مزاج تھے - جب ہم کسی شخص کی بُرد باری کی تعریف کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ کم حسّاس ہے - بلکہ صرف یہ کہ وہ اپنے آپ پر قابو رکھتا ہے اور تحمّل سے کام لیتا ہے - آزاد مغلوب الوجدان تھے - اُن کے جذبات ان رکاوٹوں کو توڑ پھوڑ کر ، جو عقل اور فہم و فراست کو حائل کرتے ہیں ، باہر نکل جاتے - چنانچہ ہم ان کے جذبات کو ایسے مواقع پر بھی مشتعل ہوتے دیکھتے ہیں جب ان کا کوئی جائز موقع و محل نہیں ہوتا - جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے ، وہ بعض اوقات دوسروں کے متعلق بڑی سخت باتیں بھی کہہ جاتے تھے - لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی خُو بُری ہے - زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ انھیں اپنے آپ پر اختیار نہ تھا -

بسا اوقات وہ اپنی طبیعت کا بوجھ یوں ہلکا کرتے ہیں جیسے وہ کوئی بڑی جابر و قاہر ہستی ہیں اور اپنے بداندیشوں اور نکتہ چینوں کو اپنی قہرمانی اور

آتش غیظ و غضب کا تختۂ مشق بنا سکتے ہیں ۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

آ جاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں
کرتا ہے اس کو خرچ عُدو کے علاج میں

کہہ جاتا صاف دشمنِ بدبیں پہ چوٹ ہے
اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے

کھوٹا اگر زباں کا ہے دل کا کھرا تو ہے
اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے[8]

یا پھر ان کا اپنے قلم سے یہ خطاب ملاحظہ ہو :

تُو جوانی میں مری تیغِ شرربار رہا
کرتا اعدائے بداندیش کو فی النار رہا[9]

جب ہم آزاد کے ہاں جذبات کا یہ ہیجان دیکھتے ہیں تو یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان کی تصانیف میں کون سا ایسا مرحلہ ہے جہاں دشمنِ بدبیں کو تیغِ شرر بار سے فی النار کیا گیا ہو ۔ جہاں تک ہمیں علم ہے ، اس کی ایک مثال بھی نہیں ۔ یہ محض ان کا ایک داخلی ردِ عمل ہے جسے خارج میں صورت پذیر ہونے کا موقع نہیں ملا ۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جب ہم عالمِ حقیقت میں کسی ارادے یا خواہش میں ناکام رہتے ہیں تو عالمِ خیال میں داخل ہو کر نامساعد حالات اور ناکامیوں کو کامرانیوں میں تبدیل کر کے اپنا بوجھ ہلکا کرتے ہیں ۔ آزاد کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے ۔ وہ بھی داخلی سطح پر اپنا بدلہ چکاتے ہیں ۔ ایسے مواقع پر آزاد وہ نظر نہیں آتے جیسے کہ سچ مچ وہ تھے ، بلکہ یہ ان کا وہ روپ ہے جیسا وہ اپنے آپ کو تصوّر کرتے تھے اور عالمِ خیال میں جانتے تھے ۔

غرض آزاد سیدھے سادے ، جذباتی انسان تھے ۔ انھیں اپنے دشمنوں اور حریفوں سے اتنا ہی بغض یا نفرت تھی جتنی دوسروں کو ہو سکتی ہے ۔ ان میں سیّد احمد خاں یا حالی کا سا ضبط اور اعتدال نہ تھا ۔ ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ انھوں نے اپنے مخالفین کو بد بیں ، ناہنجار ، بد اطوار ، نا بکار ، بد اندیش اور

فی النار جیسے الفاظ سے یاد کیا ہو ، یا اس قسم کے کوسنے زبان پر لائے ہوں :

"اے خدا — اپنی قدرت سے اسے مبتلائے آلام کر اور اس کے شیشۂ دل کو پارہ پارہ کردے ۱۰۔"

آزاد کو اپنی اس کمزوری کا خود بھی احساس تھا اور کبھی کبھی اسے شعوری سطح پر وہ محسوس بھی کرتے تھے - وہ اپنی غصیلی طبیعت سے باخبر تھے - یہ اُن سطور سے ظاہر ہے جو اُنھوں نے شیخ عبدالقادر بدایونی کے متعلق تحریر کی ہیں - چنانچہ لکھتے ہیں :

''قباحت یہ تھی کہ جس طرح طبیعت میں جوش تھا اسی طرح زبان میں زور تھا - اس واسطے ایسے موقع پر کسی دربار اور کسی جلسے میں بغیر بولے رہا نہ جاتا - اس عادت نے مجھ ناقابل کی طرح ان کے لیے بھی بہت سے دشمن بہم پہنچائے ۱۱۔''

اس غیر شعوری اعتراف سے ان کے تند و تیز جذباتی مزاج کے متعلق کوئی شک باقی نہیں رہتا - اسی آتش نوائی کا نتیجہ تھا کہ وہ دوسروں کی مخالفت مول لیے بغیر نہ رہ سکتے - خان زمان علی خان شیبانی کے حال میں وہ ہمیں بڑی رازداری سے ایک پتے کی بات بتا جاتے ہیں :

''آزاد بھی ایسے ہی بےلیاقت ، بد اصالت حاسدوں کے ہاتھ سے داغ داغ بیٹھا ہے - پھر بھی شکر ہے کہ 'روسیاہی سے محفوظ ہے اور خدا محفوظ رکھے - یہ نا اہل خود کچھ نہیں کر سکتے ، اوروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور مورچے باندھتے ہیں - موقع پاتے ہیں تو افسروں سے لڑاتے ہیں - خیر آزاد بھی پرواہ نہیں کرتا - اپنے تئیں خدا کے اور انھیں زمانے کے حوالے کرتا ہے - ان کے اعمال ہی آن سے سمجھ سمجھا لیتے ہیں ۱۲۔''

(۷)

بلاشبہ آزاد طبعاً خوددار تھے اور غلامانہ ذہنیت اور خوشامد پرستی کی

مذمت کرتے تھے - ۱۸۶۴ع کے بعد انھوں نے کوئی قصیدہ نہیں لکھا - کہتے ہیں :

''مرثیہ خوانی اور تاریخیں لکھنی ، جو کہ شیوۂ قدیم ایشیا کا ہے ، یہ تو مجھے پسند نہیں - اب اس کا زمانہ گزر گیا ۱۳-''

جب سر سالار جنگ فوت ہوئے تو گو وہ ان کا تہہ دل سے احترام کرتے تھے ، پھر بھی ان کا مرثیہ لکھنے سے انکار کردیا - صرف اتنا کیا کہ ان کے نام پر "دربار اکبری" کو معنون کرنا منظور کر لیا -

اور وہ اس دوسری قسم کے قابلِ معافی تملق کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ بڑے بڑے لوگوں کو اپنی تصانیف کے اعزازی نسخے پیش کیے جائیں - "آب حیات" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو میجر سید بلگرامی نے انھیں مشورہ دیا کہ کچھ اعزازی نسخے باہر کے لوگوں کو بھیج دیں - انھوں نے جواب میں لکھا :

''جن جن نسخوں کے لیے آپ نے ارقام فرمایا ہے ، بے شک حصولِ مقاصد اور مطلب براری کا رستہ یہی ہے ، مگر کیا کروں ، طبیعت ایسی واقع نہیں ہوئی - میں ہمیشہ یک رُخ بازی کھیلا ہوں اور خدا چاہے تو یہی چال چلوں گا - جیت ہار خدا کے ہاتھ میں ہے ۱۴-''

بعد میں جب انھوں نے دو نسخے حضور نظام کو ارسال کیے تو میجر صاحب کو لکھا :

''غالباً آپ کو بھی لکھ چکا ہوں ، دو نسخے بذریعہ رجسٹری آپ کے بھائی صاحب کی خدمت میں بھیج دیے ہیں ... کسی قسم کی طلب یا امید نہیں - فقط اتنی خوشی مطلوب ہے جو ہر مصنّف کو اپنے کلام کے پھیلانے میں ہوتی ہے ۱۵-''

ڈاکٹر لائٹنر سے ان کی شکر رنجی کا سبب معلوم کرنا دشوار ہے - سبب کچھ بھی ہو ، آزاد نے اس معاملے میں بڑے وقار سے کام لیا اور پنجاب یونیورسٹی کے اس ڈکٹیٹر کو راضی کرنے کی کوشش نہیں کی - ۴ اپریل ۱۸۷۶ع کو وہ لالہ دُنی چند کو لکھتے ہیں :

"میرا حال یہ ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب آئے تو میں ان سے کالج ہی میں ملا - استقبال کو اسٹیشن پر نہیں گیا - دوسرے دن گھر پر بھی

جا کر مل آیا ۔ اس دن سے پھر گھر پر نہیں گیا اور طریقہ یہی رکھا ہے کہ گھر پر بے بلائے نہ جانا اور زیادہ اختلاط نہ بڑھانا ۔ ابھی تک تو وہ بھی سیدھے سیدھے چلے جاتے ہیں ، میں بھی چلا جاتا ہوں ، آگے کا خدا مالک ہے [۱۶]۔''

اسی زمانے کا ڈاکٹر لائٹنر کے نام ایک خط ہے ۔ اس میں بھی وہی استغنا اور بے نیازی نظر آتی ہے :

''جناب من ! خدا بہتر جانتا ہے کہ میں نے جس کام کو چھوڑا ہے ، دشمنوں کے ہاتھ سے مجبور و ناچار ہو کر چھوڑا ہے کہ وہ میری عداوت کے سبب سے آپ کے کاموں کو خراب کرتے ہیں ۔ اس معاملے میں بھی یہی حال ہے ۔ اگر آپ ان شیطنتوں کو روک سکیں تو میں بھی خدمت کے لیے حاضر ہوں اور اگر آپ مجبور ہیں تو مجھے معاف رکھیے۔ البتہ اگر حضور بیچ میں ہوں اور بطور اپنے نج کے مجھے کام دے دیں تو اس سے مجھے کچھ عذر نہیں ۔ اور کمیٹی سے تعلق پیدا کرنا فدوی نہیں چاہتا [۱۷]۔''

(۸)

جہاں تک ہم اندازہ لگا سکتے ہیں ، اس الزام میں جو عموماً آزاد پر عائد کیا جاتا ہے ، کوئی صداقت نہیں کہ وہ بخیل تھے ۔ بعض لوگ محض زر اندوزی ہی کے لیے روپیہ جمع کرتے ہیں ۔ اس کے برعکس بعض کسی معاملے میں کفایت سے کام لیتے ہیں تو کسی میں حد سے زیادہ مُسرف نظر آتے ہیں ۔ آزاد کا سب سے بڑا شوق فراہمیِ کتب تھا ، اور وہ اس بات کو ذرا بھی نہیں چھپاتے کہ گھریلو اور دوسری ضرورتوں پر خرچ کرنے میں جز رسی سے کام لیتے ہیں تاکہ اپنی چہیتی چیزوں پر زیادہ صرفہ کر سکیں ۔

یہ بھی درست ہے کہ کفایت شعاری کا یہ شوق ان کے لیے مصیبت کا باعث بھی ہوا اور انھیں بعض اوقات نقصانات برداشت کرنے پڑے ۔ بنگلا ایوب شاہ میں رہائش اختیار کرنے سے پہلے وہ عموماً غربا کے محلّوں میں چھوٹے چھوٹے مکانات

میں رہتے تھے - چنانچہ بار بار کی نقلِ مکانی سے بعض بیش بہا کتابیں ضائع ہو جاتی[۱۸] تھیں - لیکن یہ گھاٹے کا سودا بھی اسی "شوقِ فضول" کے سبب سے تھا -

آزاد معاملات کے افادی پہلو کو نسبتہً زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اگر کبھی کھلے دل سے خرچ کرنے پر اتر بھی آتے تو وہ بھی اس کاروباری احساس کے تحت کہ یہ سودا آگے چل کر ان کے لیے منفعت بخش ثابت ہوگا - "سیرِ ایران" میں اس قسم کے بعض واقعات درج ہیں :

"مجھے طہران میں ٹھیرنے کی بڑی ضرورتیں دو تھیں ؛ اول کتابیں ، دوسرے تحقیقاتِ الفاظ - اور ان کاموں کے لیے جس قدر توقف ہو ، تھوڑا تھا - شوق کی پیاس کسی طرح نہ بجھتی تھی ... تین مہینے بڑی کوشش سے کام میں مصروف رہا ، (تب) میں گھبرایا کہ رخصت تھوڑی رہ گئی ، اور رخصت ہو بھی تو اڑھائی روپیہ روز کٹ رہا ہے [۱۹]-"

اور :

"غرض پانچ دن وہاں رہ کر دس کی جگہ بارہ روپے کرایہ دیے اور کوئٹہ کو روانہ ہوا ، کیونکہ جانتا تھا کہ اڑھائی روپیہ روز کٹ رہا ہے [۲۰]-"

اس قسم کے انکشافات ، اور وہ بھی بر سرِ عام ، آزاد کی کفایت شعاری ہی پر نہیں بلکہ ان کی سادہ مزاجی پر بھی روشنی ڈالتے ہیں -

آزاد کی طبعی انسانیت اس واقعے سے ظاہر ہے کہ ایک شخص غلام نبی نے ان سے "الف لیلہ" مستعار لی اور پھر بہانہ کردیا کہ گم ہوگئی ہے - بہت کچھ حیلے حوالوں کے بعد اس نے اس کی قیمت دینے کا اقرار کیا - اس سلسلے میں آزاد نے اپنے ایک دوست کو تحریر کیا :

"غلام نبی صاحب کہتے ہیں کہ کتاب 'الف لیلہ' فارسی ، بازار میں نہیں ملتی مگر قیمت دیتے ہیں - میں نے اس معاملے میں بہت سوچا - ان کا اصل مطلب یہ معلوم ہوا کہ راقمِ آثم قیمت کتاب کی لیتے ہوئے شرمائے - حال یہ ہے کہ کتاب مذکور بمبئی میں سوداگروں کے پاس موجود ہے - وہ چاہتے تو منگا سکتے تھے - چنانچہ ایک سوداگر کی فہرست ارسال خدمت ہے ... اسے دیکھ کر آپ کو بھی ان کی بہانہ جوئی

میں کچھ شبہہ نہ رہے گا - اور یقین ہوگا کہ اسی طرح میری کتاب بھی کہیں نہیں گئی ، انھی کے پاس موجود ہے - پس ایسے آدمی کو خالی چھوڑتے ہوئے ہرگز غیرت گوارا نہیں کرتی - انھوں نے مجھے بلکہ آپ کو بھی دق کردیا - انھیں خالی چھوڑنا گویا اس جرم کی تعلیم دینی ہے [۲۱]-"

کچھ دیر بعد آزاد کو پتا چلا کہ اس کا قیاس درست تھا - انھیں ایک کتب فروش سے معلوم ہوگیا کہ غلام نبی نے ''الف لیلہ'' دے کر اس سے قرآنِ مجید کا ایک نسخہ لے لیا ہے اور دکاندار نے "الف لیلہ" ایک خریدار کو چار روپے میں بیچ دی ہے - مزید یہ بھی پتا چلا کہ غلام نبی نے اسے بعد میں ۱۹ روپے پیشگی دیے تاکہ اس کے لیے بمبئی سے "الف لیلہ" کا ایک نسخہ منگوایا جائے - باقی ماجرا آزاد کی اپنی زبانی سنیے :

''جس پیرائے میں اس نے یہ ذکر کیا اس سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت انیس روپے کا داغ نہایت تکلیف دینے والا ہے ، خصوصاً آج کے زمانے میں اور وہ بھی ایک ۲۵ - ۳۰ روپے کے نوکر کو - اس تقریر نے میرے دل پر بھی پُر درد اثر کیا اور میں نے کہہ دیا کہ یہ روپے تم واپس کردو اور کہہ دو کہ بس کتاب مجھے پہنچ گئی ... آپ نے جس قدر توجہ فرمائی اس کا دل سے شکر گزار ہوں ... اور وہ کلفت و پریشانی جو میری اثنائے تحریرات میں ایک بندۂ خدا کو لاحق ہوئی اس کا اس سے بھی عذر کرتا ہوں ... میں منشی صاحب کے دعوے سے دست بردار ہوا - اب صرف خدا سے دعویٰ ہے جس کا خزانہ بے شمار ہے اور کتب خانہ بے تعداد ہے - اور یقین واثق ہے کہ وہ دے گا اور ضرور دے گا اور بہت زیادہ دے گا -''

آزاد زیادہ ملنسار نہ تھے لیکن اگر فریقِ ثانی کی طرف سے برابر کوشش ہوتی تو گھل مل بھی جاتے تھے- ان کے احباب کا حلقہ جتنا محدود تھا اتنا ہی مدّاحوں کا حلقہ وسیع تھا - ۱۸۸۰ع کے بعد جب اُن کی دھاک بیٹھ چکی تھی ، ان کے پاس کثیر تعداد میں ملاقاتی آیا کرتے تھے - عزیز ترین احباب میں سید احمد خاں ، مولوی نذیر احمد ، منشی ذکاء اللہ اور حافظ کریم بخش تھے - ان احبابِ خاص کی

موجودگی میں بعض اوقات ان کی یاد داشت کے دروازے کھل جاتے اور وہ بیتے دنوں کے تذکرے میں منہمک ہو جاتے ۔ طبیعت کا شگفتہ پہلو منشی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد (بالخصوص ثانی الذکر) کی صحبت میں ظاہر ہوتا ۔ ایسے موقعوں پر وہ ایک دوسرے کو شوخ و شنگ القابات سے نوازتے ۔ حالی کے ساتھ انجمن کی معتمدی کے دوران میں شکر رنجی رہی ، لیکن ان سے کھلا عناد نہ تھا ۔

(۹)

اوپر جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ زیادہ تر آزاد کی اپنی تحریروں سے ماخوذ ہیں ۔ آزاد کا یہ داخلی روپ ہے ۔ وہ بڑی حد تک خود کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے اور اسی شبیہ کو پسند کرتے تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ دوسرے بھی انھیں اسی طرح دیکھیں اور جانیں ۔ لیکن بسا اوقات کسی شخص میں بہ حیثیت انسان اور ادیب کے بہت فرق ہوتا ہے ۔ یہی نہیں ، ممکن ہے ایک روپ دوسرے روپ کا بالکل الٹ ہو ۔ اس لحاظ سے ہماری دانست میں ایک ہی بات قابلِ بحث ہے ، اور وہ ہے آزاد کا مذہبی مسلک ۔ اپنی نگارشات میں وہ فرقہ وارانہ رواداری کے حامی نظر آتے ہیں ، لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رواداری پر اُن کے لمبے چوڑے وعظ محض دکھاوا ہی تھے ۔ کیا آزاد کی رواداری محض ڈھونگ ہے ؟ کیا یہ وہی مسکراہٹ ہے جو فوٹو کھنچواتے وقت ہم فوٹوگرافر کے کہنے پر اپنے چہرے پر طاری کر لیتے ہیں ؟ ہمیں اس رائے کے قبول کرنے میں تامّل ہے ۔ پھر بھی ہم اکثر سوچتے ہیں کہ کہیں یہ مذہبی رواداری محض آزاد کے فہم و شعور کی آواز تو نہیں ، جو اُن کے تحت الشعور کے ساتھ دست و گریباں ہے ؟ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ نخوت پر زور شور سے آوازے کسنے والے طبعاً نخوت پرست ہوتے ہیں ۔ بعض لوگ جو دوسروں کی انسانیت کا پردہ چاک کرتے ہیں دراصل اپنا ہی پردہ چاک کرتے ہیں ۔ اگر یہ استدلال ذرا بھی صحیح ہے تو یہ قیاس کچھ ایسا بعید از امکان بھی نہیں کہ آزاد کی طبیعت کا ایک حصہ دوسرے کے ساتھ محوِ کشمکش تھا ۔ ان کا شعور اس بات کو رد کر دیتا تھا جسے ان کا لاشعور قبول کرتا تھا ۔ اس بات کا علمِ نفسیات کی مدد سے بھی دو ٹوک فیصلہ ممکن نہیں کیونکہ اس کے لیے معاصرانہ شہادت درکار ہے ۔ یہاں بھی سوانح نگار کے لیے یہ احتیاط تو بہرحال لازم ہے کہ

جو شواہد دستیاب ہوں ان کی اچھی طرح چھان بین کرے اور پھر حقیقت کا سراغ لگائے۔ اگر آزاد سنّیوں کے مخالف تھے، جیسا کہ اکثر بیان کیا جاتا ہے، تو سنّی بھی ان کی طرف اسی قسم کے تعصّب سے کام لیتے تھے۔ جس بات کو وہ فرقہ وارانہ تعصّب قرار دیتے تھے، ہو سکتا ہے وہ محض عام انسانی ردِ عمل کے سوا کچھ نہ ہو۔

آزاد کے معاصر ان کی وسیع المشربی کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ جو لوگ اُن کو اچھی طرح جانتے تھے وہ انھیں اس خوبی سے متّصف کرنے کو تیار نہ تھے۔ یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں کہ جب ہم نے مولوی خلیل الرحمان سے اس بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے فوراً آزاد کی وسیع المشربی سے انکار کر دیا اور انھیں متعصّب ہی قرار دیا۔ لیکن ہمیں اس رائے کے قبول کرنے میں اس لیے تامّل ہے کہ خود مولوی خلیل الرحمان کا رویہ بھی شیعوں کے ساتھ دوستانہ نہیں تھا، بلکہ بہت حد تک معاندانہ تھا۔ ہو سکتا ہے وہ آزاد کو معروضی طور پر دیکھنے کی بجائے اپنی ذات کی عینک سے دیکھ رہے ہوں۔

آزاد کو شیعیّت کے ساتھ بے حد لگاؤ تھا۔ چنانچہ وہ کبھی "یا علی" یا "اللہ و علی" کے بغیر لکھنا شروع نہیں کرتے تھے۔ ممکن ہے ان کا یہ رویہ "۷۸۶" لکھنے والوں کی طرح ہو کہ نہ صرف راسخ العقیدہ مسلمان، بلکہ اکثر نام کے مسلمان بھی، رسمی طور پر اپنی ہر تحریر یا خطوط کو اس سے سجا لیتے ہیں۔ تاہم اس قسم کے بظاہر معمولی اور اضطراری افعال بھی انسان کی باطنی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں اور انھیں محض رسمی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ آزاد جب بھی کسی اجنبی شیعہ سے ملتے تو ان کا دل بلّیوں اُچھل پڑتا اور وہ اس کا بڑی ہی محبت سے ذکر کرتے۔ اس میں بھی کلام نہیں کہ ایرانی بڑے ہی خلیق اور خوش خلق لوگ ہیں۔ انھوں نے سفرِ ایران کے دوران میں آزاد کی بڑی آؤ بھگت کی اور انھیں ذرا بھی اداس نہیں ہونے دیا۔ لیکن آزاد نے جو اُن کی بے انتہا تعریف کی ہے، کیا اس کا سبب ایک حد تک یہ نہیں کہ وہ بھی شیعہ تھے اور آزاد بھی؟ اس کے برعکس افغانستان میں اُن کو جو نا گوار باتیں پیش آئیں، ان کا سبب بھی کیا ایک حد تک وہ خلیج نہ تھی جو سنیّوں اور شیعوں کے درمیان حائل تھی؟ ہو سکتا ہے آزاد نے شیعوں کی طرح ارکان و رسوم کی پیروی کی ہو،

جس نے انھیں "غیر مہمان نواز" افغانوں کی ہمدردی کے دائرے سے خارج کر دیا ہو۔ یہ سارے امکان خارج از بحث نہیں، تاہم اس بارے میں کافی معلومات دستیاب نہیں، اس لیے اس سلسلے میں قطعی فیصلہ دشوار ہے۔

(۱۰)

جہاں تک حالی کے ساتھ راہ و رسم کا تعلق ہے، آزاد کا کمزور ترین پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ ادبی حلقوں میں حالی کی تعریف آزاد کو ہرگز نہیں بھاتی تھی اور وہ دل مسوس کر رہ جاتے تھے۔ بالخصوص اس لیے کہ نقادانِ سخن حالی کی تعریف کچھ ایسے انداز میں کرتے تھے کہ اس سے بالواسطہ آزاد کی تنقیص کا پہلو نکلتا تھا۔ "مسدس" کی اشاعت پر حالی کی شہرت ایک ایسا کڑوا گھونٹ تھا جو آزاد کے گلے سے نہیں اتر سکا۔ جب بھی "مسدس" کا نام لیا جاتا، آزاد غصے کے مارے تلملا اٹھتے۔ جب مسٹر ایچ۔ ایل اوگیرٹ گورنمنٹ کالج کی تاریخ مرتب کر رہے تھے، کالج کے ایک سابق طالب علم نے انھیں اپنی چند یادداشتیں فراہم کیں جن میں ایک لطیفہ یہ بھی تھا:

"ان دنوں انجمن ہال میں ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا ... جہاں حالی شاعری میں آزاد کے حریف تھے۔ پروفیسر آزاد کبھی ان کے کمال کے معترف نہ ہوئے ... کچھ سال بعد جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو میرے ہاتھ میں "مسدس حالی" کا ایک نسخہ تھا۔ آزاد نے دیکھتے ہی یہ فقرہ چت کیا "ارے، تم یہ کتاب پڑھ رہے ہو! اگر مٹھائی کی ضرورت تھی تو کسی حلوائی کے یہاں گئے ہوتے۔ سلونی چیز درکار تھی تو نان بائی کے پاس جاتے۔ لیکن تم تو کسی بھٹیارے کے پاس جا نکلے۔ ایسی روکھی پھیکی شاعری پڑھنے سے کیا فائدہ ؟[۲۲]"

آزاد کو کیا خبر تھی کہ ان کے یہ الفاظ، جو بخل آمیز ہونے کے علاوہ نا مناسب بھی تھے، حیطۂ تحریر میں آ جائیں گے اور جو کوئی انھیں پڑھے گا وہ انھیں آن کے شایانِ شان نہ سمجھتے ہوئے اظہار افسوس کرے گا۔

سچ یہ ہے کہ حالی سے دشمنی آزاد کی طبیعت کا جزو بن چکی تھی۔ یہاں ہمیں

ایک اور لطیفہ بھی یاد آتا ہے جس کا تعلق ان کے تحت الشعور سے ہے - دیوانگی کے ایام میں ان کے اقربا نے بدیں خوف کہ وہ کہیں سچ مچ ''دربار اکبری'' کا مسوّدہ ضائع نہ کر دیں ، آسے ان کے کتب خانے سے چوری چوری نکال لیا - جب انہیں اس کی گم شدگی کا علم ہوا تو آپے سے باہر ہوگئے - بار بار حالی کو سخت سست کہتے اور پکار پکار کر کہتے کہ وہی حالی ح - زادہ میرا مسوّدہ چرا کر لے گیا ہے - اس موضوع پر ڈاکٹر عبدالحق کی تصریحات بھی قابلِ غور ہیں - لکھتے ہیں :

''آزاد مرحوم تو ان کا (حالی) نام تک سننے کے روادار نہ تھے- اس معاملے میں ان کی طبیعت کا رنگ بعینہ ایسا تھا جیسا سوت کا ہوتا ہے - لاہور میں کرنیل ہالرائیڈ کی زیرِ ہدایت جو جدید رنگ کے مشاعرے ہوئے ان میں ان دونوں نے طبع آزمائی کی - "برکھا رُت'' ''حبِ وطن'' "نشاط امید" اسی زمانے کی نظمیں ہیں - مولانا کی ان نظموں کی جو تعریف ہوئی تو یہ امر حضرت آزاد کی طبعِ نازک پر گراں گزرا - اس وقت سے ان کا رخ ایسا پھرا کہ آخر دم تک پھانس نہ نکلی [۲۳]۔''

(چند ہم عصر)

* * *

حوالے اور حواشی

۱- دربار اکبری ، ص ۳۸۲ - ۳۸۴ -

۲- مکتوبات آزاد ، ص ۱۲۱ - ۱۲۲ -

۳- دربار اکبری ، ص ۳۹ -

۴- ایضاً ، ص ۵٦٦ -

۵- ایضاً ، ص ۵٦٦ -

٦- ڈاکٹر فریڈرک جان موآٹ ایم ۔ ڈی ، ایل - ایل - بی ، فرسٹ فزیشن میڈیکل کالج ، کلکتہ -

۷- مکتوبات آزاد ، ص ۱۸۸ - ۱۹۴ -

۸- مجموعۂ نظم آزاد ، چوتھا ایڈیشن ، ص ۴۲ -

۹- ایضاً ، پہلا ایڈیشن ، ص ۱۱۷ -

۱۰- دربار اکبری -

۱۱- ایضاً ، ص ۴۲۰ -

۱۲- ایضاً ، ص ۲۲۴ - ۲۲۵ -

۱۳- مکتوبات آزاد ، ص ۵۸ -

۱۴- ایضاً ، ص ۷۰ - ۷۱ -

۱۵- ایضاً ، ص ۷۳ -

۱٦- ایضاً ، ص ۱٦۱ -

۱۷- ایضاً ، ص ۲۰۸ -

۱۸- مکتوباتِ آزاد ، ص ۱۹۶ -

۱۹- سیرِ ایران ، ص ۳۶ -

۲۰- ایضاً ، ص ۵۴ -

۲۱- مکتوباتِ آزاد ، دیکھیے خطوط بنام محمد دین ، ص ۹۴ - ۱۰۲ -

۲۲- ایچ - ایل - او - گیرٹ : تاریخِ گورنمنٹ کالج لاہور ، ص ۳۱ -

۲۳- عبدالحق : چند ہم عصر -

نواں باب

ذہنی ساخت

(۱)

آزاد کے شعور کی سب سے اہم خصوصیت ان کا ماضی سے لگاؤ ہے ۔ ان تمام رشتوں کے باوجود جو انھیں دورِ جدید سے وابستہ کرتے ہیں ، وہ طبعاً قرونِ وسطٰی ہی کے دل دادہ تھے ۔ اگر تحریکِ علی گڑھ کے اکابر رہنما سیّد احمد خاں ، شبلی ، حالی جدید وضع کے نمائندہ ہیں تو آزاد ماضی کے پرستار ہیں اور اسی کے کیف و رنگ کی عکاسی کرتے ہیں ۔

ممکن ہے یہ رائے آزاد کی معاشرتی اور ادبی اصلاحات اور سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے ، جن کا پہلے ذکر آ چکا ہے ، حقیقت سے بعید معلوم ہو ، پھر بھی یہ ایسی بیّن حقیقت ہے جسے پیشِ نظر رکھنا لازم ہے ، تاکہ ہم آزاد کی ذہنی ساخت کو کما حقہ سمجھ سکیں ۔ وہ اپنے ہم عصر ادبا کی طرح اپنے عہد کی پیداوار ہونے کے باوجود بعض امور میں ان سے مختلف ہیں ۔ دوسرے ادیب اپنے عہد کے ذہنی رجحانات کو حقیقت کی روشنی میں دیکھتے ہیں ۔ اس کے برعکس آزاد کی جبّلت کا ریشہ ریشہ ماضی میں کچھ اس طرح پیوست ہے کہ ان کے عہد کا تنقیدی رجحان ان کی ماضی کے ساتھ رومانی دلبستگی سے دست و گریباں ہے ، اور ان دونوں میلانات میں سے قطعی طور پر رومانیت کا پلہ بھاری ہے ۔ آزاد کبھی اپنے جذبات اور شعور کے تقاضوں میں توازن پیدا نہ کر سکے ۔ اس لیے ان کی طبیعت کا ایک حصّہ دوسرے حصّے کے خلاف برسرِ پیکار ہے ۔ دورِ جدید میں اس قسم کے عدمِ توازن کی ایک مثال سرشار ہے جس کی طبیعت کا لا ابالیانہ پن بیسویں صدی کے تنقیدی مزاج سے آمیز ہے ۔

آزاد ہیں تو جدید لیکن ایک گونہ فرق کے ساتھ ۔ ان کے شعور کو نئے نظام کی تمکنت نے پوری طرح مسخّر کر لیا تھا ، لیکن ان کے جذبات ، جو شعور سے کہیں زیادہ قوی ہیں ، حال کو بے کیف سمجھ کر رد کر دیتے ہیں ۔ دورِ جدید کی خشک وضعی ماضی کی دل فریبیوں کو اور بھی پُرکشش بنا دیتی ہیں ۔ نتیجہ یہ ہے کہ آزاد یوں تو بڑے طمطراق سے دورِ جدید کے دوش بدوش چلتے ہیں ، لیکن ان کے احساسات ، جو حال میں نشو و نما نہیں پاتے ، انھیں برابر ماضی کی طرف کھینچتے رہتے ہیں ۔

اس لحاظ سے آزاد کی طبیعت دو رُخی ہے ۔ وہ زیادہ تر رومانیت کی دنیا میں آباد رہتے ہیں ۔ ان کے ذہن میں قرونِ وسطیٰ کا مثالی تصوّر پوری طرح رچا ہوا ہے ، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اس بنیادی رومانیت پر تنقیدی رجحان جو نئے ماحول کی پیداوار تھا ، غالب آ گیا ۔ اس دو روئی کا نتیجہ یہ ہے کہ آزاد ایک ہی سطح پر قائم نہیں رہ سکے ۔ وہ دو دنیاؤں میں ڈانواں ڈول رہتے ہیں : کبھی رومانی ، کبھی تنقیدی ۔ ابھی شعور کے زیرِ اثر پرانے نظام سے آمادۂ پیکار ، ابھی احساسات کا پلہ بھاری ہونے پر ماضی کی خواب نما دنیا سے کیف اندوز ۔ ان دونوں محوروں میں سے جذبات کا محور یقیناً زیادہ مضبوط ہے ۔ شعور کی حیثیت دشمن کے علاقے میں ایک مخدوش چوکی جیسی ہے جس پر عجب نہیں جذبات کی یورش کسی وقت بھی قبضہ کر لے ۔

(۲)

نقّاد کی حیثیت سے آزاد کی سب سے نمایاں خصوصیت ماضی سے والہانہ محبت ہے ۔ ماضی کی بڑائی اور اس کی اچھائی ان کے لیے جزوِ ایمان ہے ۔ اس کا رنگ روپ ، اس کے ملبوسات ، اس کی دوستیاں ، دل داریاں ، رفاقتیں ہمیشہ ان کے دل و دماغ پر چھائی رہتیں ۔ جس جس انداز سے وہ ماضی کا والہانہ محبت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں ، وہ اردو میں اپنی مثال آپ ہے ۔ جب وہ پرانے استادوں کا ذکر کرتے ہیں تو الفاظ ان کے منہ میں رس گھولتے جاتے ہیں ۔ بے شک ماضی میں نقائص بھی تھے مگر آزاد ان پر زور نہیں دیتے ۔ وہ انھیں نظرانداز کر دیتے ہیں ، یا انھیں بھی عہدِ رفتہ کی کشش کا جزو خیال کرتے ہیں ۔

آزاد کی رومانیت کے سوتے تلاش کرنا مشکل نہیں - وہ مغلیہ تہذیب و تمدن میں اس درجہ ڈوبے ہوئے تھے کہ ان کے لیے نئی فضا میں رچ جانا محال تھا - انھوں نے اپنی زندگی کے اثر پذیر ایام دہلی میں بسر کیے تھے - وہ بزم ہائے رنگا رنگ جن میں انھوں نے دن گزارے تھے ، حسن و نفاست کی تصویر بن کر سامنے آتی تھیں - وہ نئی دنیا جس میں انھوں نے جنگِ آزادی کے بعد اپنے آپ کو پایا تھا ، ان کی حسّاس طبیعت کو ، جس کی جڑیں ماضی میں پیوست تھیں ، تسکین دینے سے قاصر رہی - یہی بھرپور احساس تھا جس نے نگاہوں سے اوجھل دنیا کو طلسمی رنگ دے دیا - آزاد کو اس کا اعتراف بھی ہے اور ''آبِ حیات'' میں جابجا اس کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں - وہ فرماتے ہیں :

''بات یہ ہے کہ ہم لوگ اس زمانے کے لیے بالکل اجنبی ہیں - نئی روشنی والے کہتے ہیں کہ روشنی نہیں ، روشنی نہیں - جناب رغمی اور بندۂ آزاد کی نگاہوں سے کوئی دیکھے کہ دنیا اندھیر ہے [۱]:''

سراغِ یک نگاہِ آشنا از کس نمی یابم
جہاں چوں نرگستاں بے تو شہر کور می باشد

اور یہ کہ :

''میرے دوستو ! پرانے وقتوں کی دوستیاں کچھ اور ہی دوستیاں تھیں - آج تمھارے روشنی کے زمانے میں اُن کی کیفیت بیان کرنے کو لفظ نہیں ملتے ، جن سے ان خیالوں کا دلوں میں عکس جماؤں[۲] -''

آزاد ایک اُجڑی ہوئی دنیا کے باسی تھے - ان کی بے اطمینانی کا اصل سبب پرانی محفلوں کو دیکھنے کی حسرت ہے جسے دورِ جدید کی فضا پورا نہ کر سکی -

اس سے ظاہر ہے کہ آزاد کا ماضی کو مثالی رنگ میں دیکھنا کسی مبہم جذباتی لگاؤ کا نتیجہ نہ تھا اور نہ ہی من گھڑت رومانی طلسم - وہ دراصل ان کا نئے دور کی سردمہری اور روکھے پھیکے پن کے خلاف اخلاقی اور جمالیاتی ردِعمل تھا - یہ ردِعمل انھیں اس کیف و رنگ اور شعریت کی طرف لے گیا جس میں ان کے شباب نے پرورش پائی تھی - لہٰذا نئے دور کی پُرتصنّع فضا ان کے دل میں ولولہ پیدا کرنے سے قاصر رہی -

ماضی کی سحر آفریں فضا کا اثر ناپید ہو جانے کے احساس میں دہلی کے کتنے ہی لوگ آزاد کے شریک تھے ۔ مسٹر سی ۔ ایف ۔ اینڈریوز کی تصنیف "ذکاء اللہ آف دہلی" جن لوگوں کی نظر سے گزری ہے، وہ اس رومانی طلسم کے پارہ پارہ ہونے کا بخوبی اندازہ کر سکیں گے ۔ انگریزی تسلّط کے ابتدائی زمانے میں دہلی کا نقشہ کھینچتے ہوئے مسٹر اینڈریوز لکھتے ہیں :

"شہر کی عام خوش حالی کے باعث اکثر لوگ بالعموم بڑے آرام و آسائش سے زندگی بسر کرتے تھے ۔ تیوہار عام تھے اور انھیں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا ۔ آئے دن جلوس نکلتے تھے ... گلی کوچوں میں شہریوں کا آپس میں میل ملاپ اور خلا ملا بڑا ہی پُر لطف تھا ۔ اس میں بڑی ہی رنگا رنگی اور دل آویزی تھی ... جن گھوڑوں پر امرا سوار ہو کر گزرتے تھے، وہ بڑی ہی زرق برق آرائشوں سے مزیّن ہوتے تھے ۔ آئے دن شہسواروں کے دستے، جن کے گھوڑے طنطنہ آفریں گھنگھروؤں اور بیش بہا ساز و سامان سے آراستہ ہوتے، خوب آن بان دکھاتے ۔ جس شخص کی زبانی مجھے یہ باتیں معلوم ہوئیں، اس کا کہنا تھا کہ آپ انھیں کہنے کو یونہی اوپری چمک دمک کے بے ہنگم تماشے کہہ لیجیے، لیکن ہم لوگ، جو اُس وقت لڑکے بالے تھے، ان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے [۳]۔"

پرانی دہلی کا تذکرہ ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے :

"مزید براں مجھے جو معلومات بہم پہنچیں ان سے میں اس دل چسپی کا اندازہ کرسکتا ہوں جو اُن پرانے وقتوں میں زندگی کی بوقلموں گہما گہمی سے پیدا ہوئی ہوگی ۔ ایک ایسی سرزمین میں جہاں سورج آب و تاب سے چمکتا ہے، قدرت خود ایسے شوخ اور جاذبِ نظر رنگوں کا تقاضا کرتی ہے جو نگاہوں کو مسحور کر دیں ۔ وہاں مرد و زن کو ایسی چیزوں کی اُسی طرح احتیاج ہوتی ہے جس طرح آب و نان کی، کیونکہ مشرق میں تخیّل کی شوریدگی بھی قدرتی طور پر اپنی تسکین چاہتی ہے ۔ غالباً مسٹر ٹاؤن سنڈ میریڈتھ نے اپنی تصنیف "یورپ اینڈ ایشیا" میں کہا ہے کہ کہر آلود شمالی خطوں سے جو تہذیب گرم سیر خطوں

میں منتقل کی گئی ہے ، اس کی رُکھائی بڑی حد تک اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ ہندوستان جیسے ملک میں نمو پذیر نہیں ہو سکی - یہ جلوس وغیرہ ... زندگی کو ایسی گہما گہمی عطا کرتے تھے جو معاشرے کے لیے غیرمعمولی اہمیت رکھتی تھی ... علاوہ ازیں یہ زندگی کو زیادہ صحت مند اور زیادہ خوش گوار بننے میں مدد دیتی تھی[٤]-"

اس تنقید میں کافی صداقت ہے - انگریزی راج عوام کے تخیّل کو اس طرح مسحور نہیں کر سکا جس طرح اس سے پہلے مغلِ اعظم نے کیا تھا - پرانے نظام کے کیف و رنگ اور اس کے پُرشکوہ جلوسوں نے عوام کو واقعی اپنا گرویدہ بنا لیا تھا - موجودہ نظام میں کارپردازی زیادہ لیکن دل کشی کم ہے - آج زندگی زیادہ خاموش ، متین اور حقیقت پسند بن گئی ہے - جدید اثرات نے رفتہ رفتہ ہمیں فہم و شعور کی سردمہری اور خشک کاروباری معاملات کا عادی بنا دیا ہے - آزاد کی دنیا جذبات کی دنیا تھی - ان کا دل پرانے زمانے کی گرم جوشی ، شگفتہ طبعی ، پاسِ ادب ، خوش اخلاق اور ریتوں رسموں کا دل دادہ تھا - اس لیے اگر انھیں اپنا عہد روکھا پھیکا نظر آیا تو یہ چنداں تعجب خیز نہیں - آزاد کو ان لوگوں اور رسموں کی یاد ستاتی تھی جن کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اب ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا تھا :

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی ، تصویر نظر آئی

یہ ہیں وہ دل آویز خواب جو آزاد کے ذہن پر برابر چھائے رہے ، جیسا کہ انھوں نے خود بھی کہا ہے :

''آزاد تو پرانی لکیر کا فقیر ہے - بڈھوں کی باتیں یاد کرتا ہے اور وجد کرتا ہے[٥]-''

اس سلسلے میں سطورِ ذیل پر نظر ڈالیے جن سے ان کی ماضی سے دل بستگی اور دورِ کہن کی سرگرمیوں میں دل چسپی کا اندازہ ہوتا ہے :

''دیکھو ! جلسہ مشاعرے کا امرا اور شرفا سے آراستہ ہے ۔ معقول معقول بڈھے اور جوان برابر لمبے لمبے جامے ، موٹی موٹی پگڑیاں باندھے بیٹھے ہیں ۔ کوئی کٹار ہی باندھے ہے ، کوئی سیف لگائے ہے ۔ اور بعض وہ کہن سال ہیں جن کے بڑھاپے کو سفید ڈاڑھی نے نورانی کیا ہے ۔ بعض ایسے ہیں کہ عالمِ جوانی میں اتفاقاً ڈاڑھی کو رخصت کیا تھا ، اب کیوں کر رکھیں کہ وضع داری کا قانون ٹوٹتا ہے ۔ اس پر خوش مزاجی کا یہ عالم ہے کہ ان کے بڑھاپے کی زندہ دلی سے آج نوجوانوں کی زندہ دلی پانی پانی ہوتی ہے ۔ ان شوخیوں سے انھیں کچھ اور مطلب نہیں ، یہ مطلب ہے کہ اپنے اوپر آپ ہنسیں اور اوروں کو خوش کریں [۶]۔''

اسی طرح یہ نقشہ بھی ملاحظہ ہو :

''ایک پل کی پل آنکھیں بند کرو اور تصوّر کی آنکھیں کھول دو ۔ دیکھو ! وہی محمد شاہی عہد کے کہن سال درباری لباس پہنے بیٹھے ہیں ، اور باوجود اس متانت اور معقولیت کے مسکرا مسکرا کر آپس میں اشعار پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں ۔ کیا ان پر تمھیں پیار نہ آئے گا ؟ کلام کی تاثیر بیٹھنے دے گی ؟ محبت کا جوش ان کے ہاتھ نہ چومے گا ؟[۷]''

آزاد میں یہ نادر صلاحیت ہے کہ جس فریبِ تصوّر میں وہ خود مبتلا ہیں ، قارئین کو بھی اس میں مبتلا کردیتے ہیں ۔ اور جب ہم انھیں اپنے من کی ترنگ میں دہلی اور لکھنؤ کے بیتے سموں کے نقشے کھینچتے دیکھتے ہیں تو ان کے والہانہ ذوق و شوق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ حالانکہ اگر وہ اپنے ہم عصر حالی کی طرف رجوع کرتے ، جنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں عہدِ ماضی کا بڑی احتیاط سے مطالعہ کیا ہے ، تو انھیں اگلے وقتوں کے صاحبانِ عالی شان کے متعلق اپنے نقطۂ نظر میں تبدیلی کرنی پڑتی ۔

آج کل جب ہمارے حقیقت پسند تاریخ داں آزاد کی زبانی سلف کی اس شد و مد سے تعریف سنتے ہیں تو وہ اس طفلانہ حرکت پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگر آزاد میں یہ بے پناہ ذوق و شوق نہ ہوتا تو وہ اس طرح ماضی کے شوخ اور جان دار مرقعے نہ کھینچ سکتے اور نہ قدیم شاعری کا اتنی خوش اسلوبی سے تذکرہ کر سکتے۔ درحقیقت یہی ولولہ اور سرمستی بحیثیتِ نقّاد آزاد کا بہترین جوہر ہے۔

(۳)

آزاد کے بے انتہا جوش و خروش کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے سلف کی ہر بات قبول کر لیتے ہیں اور پیشِ نظر مواد کو تنقیدی نظر سے نہیں دیکھتے۔ وہ ماضی پر فریفتہ ہیں اور اس کی جو چیز بھی پیش کی جائے اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں اور بڑے شوق سے قبول کر لیتے ہیں۔ "آبِ حیات" میں ایک دو ہی لطائف ایسے ہوں گے جن کی صحت پر انھیں شبہ گزرا ہو، ورنہ بیسیوں صریحاً بے سر و پا قصے کہانیاں ایسی ہیں کہ اگر ان پر ذرا بھی کڑی نظر ڈالی جائے تو ان کا پول کھل جاتا ہے۔ مگر آزاد کا ان ڈھکوسلوں کو قبول کر لینا اسی مخصوص رویے کا نتیجہ ہے، ناقدانہ تحقیق کا رویہ نہیں۔

(۴)

آزاد کی رومانیت کا ایک نتیجہ غیر شعوری طور پر ان کی مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی ہے۔ جیسا کہ بیجٹ نے کہا ہے "عوام کے فیصلوں میں ضرور کچھ نہ کچھ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ دل چسپ واقعات اور بھی دل چسپ بنا دیے جاتے ہیں اور نرم و گداز افسانے اور بھی نرم و گداز[۸]۔"

"آبِ حیات" میں یہ عمل پورے زور سے کارفرما نظر آتا ہے۔ میر کی بد دماغی، سودا کی ہجو نگاری، ناسخ کا اکھڑ پن، سب کو بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا ہے۔ بعض حکایات کو سچا تسلیم کرنا خاصا دشوار لگتا ہے اور یہ

مبالغہ تخیّل کے بے تحاشا بھڑک اُٹھنے کا نتیجہ ہے - حقیقت یہ ہے کہ ہم جتنا جذبات کے زیرِ اثر ہوں گے ، اتنا ہی ہر بات کو بے سوچے سمجھے قبول کرلیں گے اور مبالغہ آرائی پر آمادہ ہوں گے - بعض نقّادوں کی رائے میں آزاد نے محض بغض و حسد کی بنا پر بعض شعرا کا مرتبہ گھٹا کر پیش کیا ہے - ایسی آرا کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں - ''آبِ حیات'' میں اکابر پرستی کا جو جذبہ کارفرما ہے ، وہ خود ہی ان کی تردید کے لیے کافی ہے - آزاد کے ہاں افراط و تفریط رومانی ترنگ کا نتیجہ ہے - ہمیں یہ بات پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ان کا نقطۂ نظر نہ اخلاق ہے نہ تنقیدی - یہ ایک ایسے ناظر کا نقطۂ نظر ہے جو جوش و جذبہ سے سرشار ہے - آزاد کی حیثیت بعینہ اس لڑکے کی سی ہے جو انتہائی ذوق و شوق اور جوش و خروش سے اپنے یا کسی اور کے کارنامے کا نقشہ کھینچ رہا ہو - اس میں لازماً زیبِ داستاں کو دخل ہوگا - ایسے لڑکے کو یہ الزام دینا کہ وہ قصداً مبالغہ آرائی سے کام لے رہا ہے ، درست نہیں - اسی طرح جب ہم آزاد کو سلف کی بوالعجبی ، تلوّن مزاجی ، خود بینی یا بلند ظرفی کی مثالیں دیتے ہوئے پاتے ہیں تو اسے کسی بد نیتی پر محمول کرنا ناروا ہوگا - آزاد جن لوگوں کو ہیرو یا شیطان بناتے ہیں ان کے محاسن و معائب کو یکساں طمطراق سے پیش کرتے ہیں - وہ ان کی پوچ اور جلی کٹی پھبتیوں اور ہجوؤں پر چٹخارے لیتے ہیں اور ان کے لڑائی جھگڑوں پر خوش ہو کر تالیاں بجاتے ہیں - جیسا کہ ہم نے اُوپر کہا ہے آزاد کی مثال ایک ہونہار لڑکے کی سی ہے جو کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو ، آخر لڑکا ہی ہے - آزاد کے مشاہدے کی تازگی کسی وقت بھی کم نہیں ہوتی - آخری دم تک ان میں بچے کی سی بھولی بھالی ، حیرت آمیز تازہ نگاہی برقرار رہتی ہے - اس رویے کا اخلاق سے کوئی سروکار نہیں ، یہ سراسر رومانی ہے -

(۵)

آزاد محض رومان پرست نہیں ، وہ مداح اور نقّاد بھی ہیں - یہی وجہ ہے کہ رومانیت کی رَو میں بہتے ہوئے انھیں بارہا یہ ضرورت پیش آتی ہے کہ کسی شخص کی خاص طور پر وکالت یا معذرت کریں ، یا اس کے قصور کو کم کرکے دکھائیں - جب ان کی تنقیدی حِس جاگ اٹھتی ہے تو وہ ممدوح کی کمزوریوں کا

بھی برملا اعتراف کرتے ہیں ، لیکن یہ اعتراف بالعموم فکر ثانی کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ اپنی اخلاقی یا تنقیدی کوتاہی کا احساس انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی تلافی کریں ۔ سودا کے بارے میں مندرجہ ذیل تحریر سے ظاہر ہے کہ ذوق و شوق ، تحسین و آفریں اور نقد و نظر کس طرح یکے بعد دیگرے تیزی سے رونما ہو رہے ہیں :

''گرمیِ کلام کے ساتھ ظرافت جو ان کی زبان سے ٹپکتی ہے ، اس سے صاف ظاہر ہے کہ بڑھاپے تک شوخیِ طفلانہ ان کے مزاج میں امنگ دکھاتی تھی ۔ مگر ہجووں کا مجموعہ ، جو کلیات میں ہے ، اس کا ورق ورق ہنسنے والوں کے لیے زعفران زار کشمیر کی کیاریاں ہیں ۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت کی شگفتگی اور زندہ دلی کسی طرح کے فکر و تردد کو پاس نہ آنے دیتی تھی ۔ گرمی اور مزاج کی تیزی بجلی کا حکم رکھتی تھی ۔ اور اس شدّت کے ساتھ کہ نہ کوئی انعام اسے بجھا سکتا تھا ، نہ کوئی خطرہ اسے دبا سکتا تھا ۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ ذرا سی ناراضگی میں بے اختیار ہو جاتے تھے ۔ کچھ اور بس نہ چلتا تھا ، جھٹ ایک ہجو کا طومار تیار کر دیتے تھے ۔

غنچہ نام ان کا غلام تھا ۔ ہر وقت خدمت میں رہتا تھا اور ساتھ قلم دان لیے پھرتا تھا ۔ جب کسی سے بگڑتے تو فوراً پکارتے "ارے غنچہ لا تو قلم دان ۔ ذرا میں اس کی خبر تو لوں ۔ یہ مجھے سمجھا کیا ہے ۔" پھر شرم کی آنکھیں بند اور بے حیائی کا منہ کھول وہ بے نقط سناتے تھے کہ شیطان بھی امان مانگے ۔

عربی اور فارسی دو ذخیرہ دار اردو کے ہیں ۔ ان کے خزانوں میں ہجووں کے تھیلے بھرے ہیں مگر اس وقت تک اردو کے شاعر صرف ایک دو شعروں میں دل کا بخار نکال لیتے تھے ۔ یہ طرز خاص کہ جس سے ہجو ایک موٹا ٹہنا اس باغِ شاعری کا ہو گئی ، انھیں کی خوبیاں ہیں ۔ عالم جاہل ، فقیر امیر ، نیک بد کسی کی ڈاڑھی ان کے ہاتھ سے نہیں بچی ۔ اس طرح پیچھے پڑتے تھے کہ انسان جان سے بیزار ہو جاتا تھا ؟۔''

آزاد کی اکابر پرستی کی مثالیں جابجا ملتی ہیں ۔ جب ان پر جوش و خروش غالب آتا ہے تو وہ باتیں کرتے کرتے دفعتہً خود سامنے آ جاتے ہیں اور سلسلۂ بیان کو توڑ کر اپنے ہیرو کے اوصاف بیان کرنے لگتے ہیں ، اس ڈراما نگار کی طرح جو تمثیل کی پیش کش کے دوران میں اپنے خیالات واضح کرنے کے لیے لپک کر خود سٹیج پر نمودار ہو جائے ۔ حیرت یہ ہے کہ بعض اوقات بڑی معمولی سی باتیں ان کو تعریف پر آمادہ کر دیتی ہیں ۔ مثال کے طور پر وہ صرف اتنا بتا دینے پر اکتفا نہیں کرتے کہ آبرو ، مضمون اور یک رنگ اپنی غزلیں تصحیح کے لیے احباب کو بھیج دیتے تھے ، بلکہ اس سے ایک عام نتیجہ بھی اخذ کرتے ہیں ، خواہ اس کا کوئی منطقی جواز نہ ہو ۔ وہ مسلسل تین فصلوں میں جدید لوگوں کے خلاف ادبائے سلف کے گن گاتے ہیں ۔ شاہ مبارک کو لیجیے :

''باوجودے کہ بڈھے شاعر اور پرانے مشّاق تھے مگر خانِ آرزو کو اپنا کلام دکھا لیتے تھے ۔ دیکھو اس زمانے کے لوگ کتنے منصف اور طالبِ کمال تھے [۱۰]!''

اس کے بعد مضمون کی باری آتی ہے :

''اس زمانے کے لوگ کس قدر منصف اور بے تکلف تھے ۔ باوجودے کہ مضمون سن رسیدہ تھے اور خانِ آرزو سے عمر میں بڑے تھے ، مگر انہیں غزل دکھاتے تھے اور اصلاح لیتے تھے [۱۱]۔''

اور پھر غلام مصطفٰی یکرنگ کو یوں سراہتے ہیں :

''لیکن یہ لوگ با انصاف ہوتے تھے اور ہر کام کے حسن و قبح کو خوب سمجھتے تھے ۔ باوجود اس کہن سالی اور کہنہ مشقی کے ، آخر عمر میں کلام اپنا مرزا جانِ جاناں مظہر کو بھی دکھاتے تھے [۱۲]۔''

لطف کی بات یہ ہے کہ جہاں وہ شاہ مبارک کے انکسار کی تعریف کرتے ہیں ، وہاں آبرو اور مرزا جانِ جاناں مظہر کی لمبی چوڑی جنگ پر کچھ بھی نہیں کہتے ۔ حالانکہ جس شعر میں یہ واقعہ درج ہے ، اس کے آخر میں فحش لفظ انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ جگہ خالی چھوڑ دیں [۱۳] :

اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ ظاہر ہے ۔ آزاد ماضی کا صرف روشن پہلو دیکھتے

ہیں ، خواہ اس کی آب و تاب اپنے ہی حسنِ نظر کا فریب ہو ۔ وہ اپنے روسانی مشرب کے باعث تصویر کا تاریک پہلو دیکھنے سے کتراتے ہیں ۔

اس سے بھی زیادہ عمومی وہ نتیجہ ہے جو مضمون کی خادمہ کے متعلق لطیفے سے اخذ کیا گیا ہے ۔ یہ لطیفہ ، جیساکہ آزاد نے بیان کیا ہے ، انھوں نے ذوق سے سنا تھا ۔ خادمہ کی حاضر جوابی میں کوئی غیرمعمولی بات نہیں ۔ بفرضِ محال یہ واقعہ درست بھی ہو ، اگرچہ ایسا نظر نہیں آتا ، پھر بھی یہ حاضر جوابی آزاد کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہے اور وہ خواہ مخواہ دہلی اور اس کی عظمتِ رفتہ کو والہانہ جوش و خروش کے ساتھ خطاب کرنے کے بعد ایک فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں :

''دیکھو ! ایسی ایسی باتیں اس زمانے میں کس قدر عام تھیں کہ بڑھیاں عورتیں اور ماماٰئیں ان سے نکتے اور لطیفے پیدا کرتی تھیں ۔ اب اللہ ہی اللہ ہے [۱٤]۔''

تاباں اور مظہر کا معاملہ اس رجحان کی ایک اور مثال ہے ۔ بحیثیت مورخ اپنے فرائض انجام دینے سے پہلے آزاد معذرت کرتے ہیں اور احتراماً کلمہٗ حق زبان پر نہیں لاتے [۱۵]۔

اسی طرح میر کی بد دماغی اور سنک کو عالی دماغی کہہ کر ٹال دیا گیا ہے ۔ اگرچہ سچائی پھر بھی ظاہر ہو ہی جاتی ہے اور ہر لطیفہ افشائے راز کرتا چلا جاتا ہے ۔ مصحفی کی ابتدائی تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"تعجب ہے ان لوگوں سے جو شکایت کرتے ہیں کہ پہلے بزرگوں کی طرح اب لوگ صاحبِ کمال نہیں ہوتے ۔ پہلے لوگ جو کتاب دیکھتے تھے تو اس کے مضمون کو اس طرح دل و دماغ میں لیتے تھے جن سے ان کے اثر دلوں میں نقش ہوتے تھے ۔ آج کل کے لوگ پڑھتے بھی ہیں تو اس طرح مضمون سے عبور کرتے ہیں کہ بکریاں ہیں کہ باغ میں گھس گئی ہیں ۔ جہاں منہ پڑ گیا ایک بکتہ بھی بھر لیا ۔ باقی کچھ خبر نہیں ۔ ہوس کا چرواہا ان کی گردن پر سوار ہے ۔ وہ دبائے لیے جاتا ہے ۔ یعنی امتحان پاس کرکے ایک سند اور کوئی نوکری لے کر بیٹھ رہو ۔ اور افسوس یہ ہے کہ کوئی نوکری

بھی نصیب نہیں [16]۔"

سودا کے متعلق فرماتے ہیں :

"اس لکھنے سے مجھے اظہار اس امر کا منظور ہے کہ ہجو ہماری نظم کی ایک خاردار شاخ ہے جس کے پھل سے پھول تک بے لطفی بھری ہے اور اپنی زمین اور دہقان دونوں کی کثافتِ طبع پر دلالت کرتی ہے ۔ چنانچہ اس میں بھی مرزا رفیع مرحوم سب سے زیادہ بدنام ہیں ۔ لیکن حق یہ ہے کہ ان کی زبان سے جو کچھ نکلتا تھا باعث اس کا یا فقط شوخیِ طبع یا کوئی عارضی جوش ناراضی کا ہوتا تھا ۔ اور مادۂ کثافت فقط اتنا ہوتا تھا کہ جب لفظ کاغذ پر آ جاتے تو دل صاف ہو جاتا تھا [17]۔"

مگر جو اقتباس پیش کیا گیا ہے وہ اس رائے کی تائید نہیں کرتا ۔ پتے کی بات آخر میں آتی ہے :

"ہمارا زمانہ ایسے مہذب اور شائستہ لوگوں سے آراستہ ہے جو لفظ ہجو کو گالی سمجھتے ہیں مگر دلوں کا مالک اللہ ہے ۔"

یا پھر سودا کے متعلق وہ مشہور حکایت لیجیے جس میں میر درد انھیں ایک مذہبی مجلس میں مدعو کرتے ہیں اور وہ انتہائی اکھڑپن سے جواب دیتے ہیں :

"صاحب ! مجھے یہ نہیں بھاتا کہ سو کتّوے کائیں کائیں کریں اور بیچ میں ایک پنڈا بیٹھ کر چوں چوں کرے [18]۔"

یہاں بھی کہنے کی بات آزاد کے تبصرے میں کہی گئی ہے ۔ ان کے الفاظ میں :

"اس زمانے کے بزرگ ایسے صاحب کمالوں کی بات کا تحمّل اور برداشت کرنا لازمۂ بزرگی سمجھتے تھے ۔"

یہاں سودا کے ناشائستہ اوضاع و اطوار آزاد کو ، جو بہرحال سلف کے پُرجوش مداح ہیں ، یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ میر درد اور دوسرے لوگوں کی تعریف کریں ، کیونکہ انھوں نے ایک جوہرِ قابل کی نازیبا حرکت پر بردباری سے کام لیا ۔ صرف یہی نہیں ، بلکہ اس تعریف میں بلاشبہ نئے زمانے کے طور طریق پر

بالواسطہ تعریض بھی پنہاں ہے - زیادہ لطف کی بات آزاد کا بھولا پن ہے - وہ یہ ساری باتیں بڑی ہی نیک نیتی سے لکھتے چلے جاتے ہیں -

ایسی مثالوں میں شک و شبہ کا شاید ہی احتمال ہو - آزاد دورِ کہن کے پُرجوش مداح ہی نہیں ، اس کے اولوالعزم مجاہد بھی ہیں - وہ فریقِ مخالف کے بت خانوں پر پتھراؤ کیے بغیر اپنے ادبی خداؤں کو سجدہ نہیں کر سکتے -

سکاٹ کی رومانیت پر بحث کرتے ہوئے والٹر بیجٹ لکھتا ہے :

"بس ایک ہی بات سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ رومانوی فریب کس قدر شدید ہوتا ہے - موجودہ معاشرے کے برعکس قرونِ وسطیٰ کے نظام کے حق میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے ... لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس زمانے میں آرام و آسائش اتنے ہی عام تھے جتنے آج ہیں ... سب سمجھ دار لوگ جانتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں ضرور آرام کا فقدان ہوگا - ان دنوں اچھی غذا ملنے میں دشواری تھی - چھوٹی چھوٹی باتوں کے اہتمام میں بھی شدید مشکلات سدِ راہ تھیں اور آسودگی نسبۃً کم تھی - کون ہے جو ان بنیادی امور کو ، جن پر یہ رائے مبنی ہے ، سکاٹ سے بہتر جانتا ہو ؟ مگر جو نقشہ وہ پیش کرتا ہے ، اس سے اس آگاہی کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا - انجان ناظر اس سے یہی تاثر لے کر اٹھتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں آسائش اتنی ہی عام تھی جتنی آج ہے - اور جنگ و جدل کی گرم بازاری انھیں اور بھی دل چسپ بنا دیتی تھی - ہم یہ نہیں کہتے کہ سکاٹ کے ناولوں میں یہ سبق برملا دیا جاتا ہے - اس کے برعکس ان میں کئی ایسے حقائق کی توضیح بھی پائی جاتی ہے جن سے سمجھ دار قاری غربت کی پستی اور بربریت کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے لیکن سرسری مطالعہ کرنے والے ، خصوصاً نو عمر لوگ ، اس قسم کی کم نمایاں باتوں کو محسوس نہیں کر پاتے - ان پر رومانویت کا احساس غالب رہتا ہے - اور گو سکاٹ میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ دوسرے پہلو کو بھی پوری وضاحت سے دیکھ سکے ، پھر بھی وہ زیادہ تر اس دل آویز فریب میں ہی مبتلا رہنا پسند کرتا ہے [۱۹]-"

یہی بات آزاد پر بھی صادق آتی ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے کتنے ہی تاریک پہلو ہیں جن پر ان کی نظر جاتی ہی نہیں۔ فقط ''آب حیات'' ہی کو غور سے پڑھا جائے تو عہدِ ماضی کی کتنی ہی خرابیاں از خود سامنے آ جاتی ہیں۔ مثلاً آزاد کے زمانے میں اہلِ ادب کی آزادی اور پرانے زمانے میں ان کی دست نگری؛ انشا کا خوشامد درامد کرکے بادشاہ سے روپیہ بٹورنا اور لکھنو میں ان پر آن کے مربّی کی گوناگوں پابندیاں؛ ایک تیز طبع حریف کی آمد پر مصحفی کے وظیفے میں تخفیف اور اس کی نظم میں شکایت؛ پوچ اور بیہودہ ہجویں؛ شعرا اور ادبا کی باہمی رقابتیں؛ اوباشانہ زندگی اور معاشرے کا سوقیانہ رنگ —— آزاد ان میں سے کوئی بات بھی ٹک کر نہ دیکھ سکے، کیونکہ ان پر رومانیت چھائی ہوئی تھی۔ ان معدودے چند لمحات کو چھوڑتے ہوئے، جب شعور کے بیدار ہونے پر ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ ماضی کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کا رویّہ تمام تر رومانی ہی رہتا ہے۔

آزاد کا سنہری دور ان کے اپنے معاصرین کی تنقیدی نظروں میں کیسا لگتا تھا؟ اس کا اندازہ حالی کی مسدس، سر سید کے مضامین اور مولوی ذکاء اللہ کی ''تاریخِ ہند'' سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں صرف ''آبِ حیات'' پر حالی کے تبصرے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کیا اس دوستانہ تبصرے سے زیادہ آزاد کے محبوب دور کی پردہ دری ممکن ہے؟ حالانکہ اس کا سارا مواد ''آبِ حیات'' ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس دورِ انحطاط کا ذکر کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

''بہادر شاہ اول کے عہد سے لے کر بہادر شاہ ثانی کے اخیر وقت تک کہ سلطنتِ مغلیہ کے عین تنزّل کا زمانہ ہے، تقریباً ڈیڑھ سو برس ہوتے ہیں۔ اس عبرت انگیز زمانے کے ایک خاص عالم کی تصویر جیسی اس تذکرے میں نظر آتی ہے، صفحاتِ تاریخ اس سے معرّا ہیں ... اکثر مقامات پر ان کو پڑھ کر بے اختیار جی بھر آتا ہے اور زمانۂ گذشتہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے ... عالی خاندان مٹتے ہیں اور پست بلند ہوتے ہیں۔ امیر زادے منصب اور خدمت سے مایوس ہو کر پیشہ یا مزدوری اختیار کرتے ہیں۔ بعضوں کا دل دنیا سے سرد ہو جاتا ہے اور وہ لباسِ فقر پہن کر کوئی تکیہ آباد کرتے ہیں۔ جن

فلک زدہ خاندانوں کو تلاشِ معاش میں رئیسوں اور دولت مندوں کے دروازے جھانکنے پڑتے ہیں وہ عجب کش مکش میں مبتلا ہیں۔ ضرورت اور کفالت یہ کہتی ہے کہ پیٹ کے لیے تمام مکروہات کو گوارا کیجیے مگر خاندانی غیرت، جو ابھی تک طبیعتوں سے بالکل نیست و نابود نہیں ہوئی، ناگوار باتوں پر تحمّل نہیں کرنے دیتی۔ جن کے باپ دادا دربارِ شاہی کے رکنِ رکین تھے ان کی اولاد بادل شاہ اور شاہ نسیم کے تکیوں میں دھونی رمائے بیٹھی ہے ... جن لوگوں کا استقلال مہماتِ ملکی میں صرف ہوتا تھا ان کی نسلوں کا استقلال اب خالی پھیکی وضع داریوں میں صرف ہوتا ہے۔ میر صاحب با ایں ہمہ تقدس بی نورن کی چوکھٹ کو ایک دفعہ روز سلام کر آتے ہیں.... امرا کی شعلہ مزاجی سے اہلِ کمال کو مسخرگی اختیار کرنی پڑتی ہے اور وہ اپنا تمام علم و فضل اور ذہن و جودت اسی میں صرف کرتے ہیں ... غرض کوئی ایسی چیز نہ تھی جو شعرا کے خیالات کو تہذیب و شائستگی کی طرف کھینچتی۔ بلکہ دائیں بائیں تمام اسباب ایسے جمع تھے جو شاعروں کو بھاٹ اور مسخرے بنانے والے یا مرضِ مالیخولیا میں مبتلا کرنے والے یا باہمی رشک و حسد کے باعث تھے۔ شعرا کو جن امیروں کے ہاں تعلق ہوتا تھا وہ یا تو علم و فضل اور مذاقِ سخن سے عاری یا عیش و نشاط میں منہمک ہوتے تھے اور اس لیے ان کو سنجیدہ خیالات کبھی پسند نہ آتے تھے۔ بلکہ ہنسی اور چہل کی باتوں پر ہر طرف سے قرار واقعی داد ملتی تھی۔ ایسا ہی حال شاعروں کا تھا کہ وہاں بھی فحش اور بے حیائی یا کسی کی ہجو پر جس قدر تحسین و آفریں کا غل ہوتا تھا اس کا عشرِ عشیر بھی ایک متین اور سنجیدہ کلام پر نہ ہوتا تھا۔ پھر چونکہ شعرا کے قدر دانوں کا قحط تھا، اگر کسی کو قسمت سے کوئی ٹھکانا مل جاتا تو وہ اس کو ایک فوزِ عظیم جانتا اور دوسرے شاعر کا وہاں رنگ نہ جمنے دیتا تھا۔ اس بنا پر شاعروں میں باہم چشمک رہتی تھی۔ بھرے مشاعرے میں ایک دوسرے پر اعتراض کرتا تھا اور ایک دوسرے کی ہجو پڑھتا تھا ... شاگردوں کو حکم تھا کہ بھری محفلوں میں حریفوں پر چوٹیں کرو، قہقہے لگاؤ اور

اگر موقع نہ ملے تو رموز و کنایہ میں خاکہ اڑاؤ - یہ بلا اس قدر پھیلی تھی کہ ایک شاعر دوسرے شاعر کا سوانگ بنا کر سرِ بازار نکلتا تھا جہاں اس کے ننگ و ناموس کی بے حرمتی کی جاتی تھی - اس کی ہجو کے اشعار ڈنڈوں پر گائے جاتے تھے - شعرا کے باہم رشک کا یہ حال تھا کہ جس شاگرد کو ہونہار جانتے تھے اور خاص و عام کو اس کی طرف مائل دیکھتے تھے ، اس کے بتانے میں دریغ کرتے تھے اور اس کو غلط اصلاحیں دے کر سرِ مشاعرہ ذلیل کرنا چاہتے تھے -[۲۰]

اس طرح حالی غیر شعوری طور پر آزاد کی رومانیت کا سارا طلسم پارہ پارہ کر دیتے ہیں - دونوں کا فرق ان کے مزاجوں اور زندگی کے متعلق نقطۂ نگاہ کا فرق ہے - حالی ایک سر گرم اخلاقی مجاہد تھے جنھیں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ماضی کی سماجی کمزوریوں کا احساس تھا اور وہ ان کی بیخ کنی کے درپے تھے - اس کے برعکس آزاد روادار اور خوش مزاج تھے - وہ بعض اوقات ماضی کی کمزوریوں کو محسوس کرتے تھے لیکن ان کی تنقید میں وہ اضطرار اور آشفتگی نہیں جو نئے دور کے دوسرے ادیبوں کے ہاں پائی جاتی ہے -

اگر کسی نقّاد پر یہ فرض عائد کیا جائے کہ وہ آزاد اور حالی میں موازنہ کرے تو ضروری نہیں کہ ساری باتیں حضرتِ ناصح (یعنی حالی) کے حق میں جائیں اور یہ محض اس لیے کہ ٹھوس حقائق اور اعداد و شمار ان کی تائید کرتے ہیں - درحقیقت یہ دونوں ماضی پر مختلف زاویوں سے نظر ڈالتے ہیں اور کوئی بھی اس کی جامع تصویر پیش نہیں کرتا - دونوں نہ تو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور نہ ایسے کہ ان میں مفاہمت کا کوئی امکان ہو نہ - بلکہ وہ تو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں - جہاں ایک ماضی کے تاریک پہلوؤں کا پردہ چاک کرتا ہے ، دوسرا اس کے روشن اور شگفتہ پہلو کو اجاگر کرتا ہے - لہٰذا اگر ہم حالی کے اس لیے ممنون ہیں کہ انھوں نے ماضی کی اخلاق نباضی کی تو ساتھ ہی آزاد کے بھی احسان مند ہیں کہ انھوں نے قرونِ وسطیٰ کی باطنی زندگی سے پردہ اٹھایا - انھیں اس دور کا ایسا شعور تھا جو صرف دلی لگاؤ سے ہی پیدا ہوسکتا ہے - ان کے ساتھ ہم قرونِ وسطیٰ کو اسی طرح دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں جس طرح اس دور کے لوگ خود دیکھتے اور محسوس کرتے ہوں گے -

یہ حقیقت کہ آزاد کی جذباتی زندگی ان کے شعور سے بہت آگے بڑھی ہوئی تھی، ان کی بے شمار گریزوں، سرگوشیوں اور قارئین سے ان کی رازدارانہ بات چیت سے بھی عیاں ہے۔ وہ اپنی ذات اور خارجی دنیا کے درمیان امتیازی خط نہیں کھینچ سکتے اور بسا اوقات اپنے آپ سے نکل کر اس کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ادب میں شعور کی کارفرمائی ایک انضباطی قوت کی حیثیت رکھتی ہے جو قلم کار کے مواد کو ترتیب اور نظم و ضبط سے آشنا کرتی ہے۔ لیکن آزاد کے جذبات ان کے شعور سے زیادہ قوی ہیں اس لیے وہ بعض اوقات ہمیں بہکا بہکا کر الٹی راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔ ان کی مثال ایک کھلنڈرے بچے کی سی ہے جسے کسی خاص کام کے لیے بھیجا گیا ہو، لیکن جو ادھر اُدھر کے دلکش نظاروں اور کھیل تماشوں میں اس قدر کھو جائے کہ اسے اصل کام یاد ہی نہ رہے۔

آزاد کی طبیعت کا جذباتی عنصر ان جملہ خامیوں کا باعث ہے۔ یہی عنصر بعض ہم عصروں کے ساتھ ان کی بلاوجہ کش مکش کا موجب بھی ہوا۔ ان کا یہی طرزِ فکر بعض اوقات ان کے اسلوبِ تحریر کو تخئیلی عنصر سے گراں بار کر دیتا ہے اور بارہا انھیں راہِ راست سے ہٹا کر عجیب و غریب اور غیر ضروری تبصروں کی طرف لے جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ ان کی تمام خوبیوں کا سرچشمہ بھی ہے۔ آزاد کی بہترین تحریروں میں ایسی غنائیت ہے جو براہِ راست ان کی شدتِ جذبات سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی تصنیفات اسی طرح اُن کے سینے سے ابھرتی ہیں جس طرح شاعری۔ انھیں بس اتنی سی بات درکار ہوتی ہے کہ کوئی چیز بڑے ہی جذب و کیف کے ساتھ ان کے دل میں راہ پیدا کرلے اور اس کی بہار فضا میں کافی دیر رسی بسی رہے۔ پھر ان کی تخلیقی صلاحیتیں باقی لوازم خود ہی فراہم کر لیتی ہیں۔ بعینہ اس طرح جس طرح زرخیز زمین میں بیج۔ ''آب حیات'' بالکل ایسی ہی تصنیف ہے۔ وہ ان کی عمیق ترین یادوں سے ابھری ہے۔ انھوں نے ماضی کی باتوں اور ماضی کے لوگوں پر اس قدر توجہ کی کہ وہ جملہ اشیا اور اشخاص ان کی ذات کا جزو بن گئے۔ ''سخن دان فارس'' میں بھی ان کی تخلیقی قوتیں انتہائی عروج پر ہیں جس کی وجہ ایران کا وسیع اور دلاویز پس منظر ہے۔ موسموں کی رنگارنگ جلوہ آرائی، شان دار ماضی جس کی جھلک اس کے آثارِ کہن میں نظر آتی ہے، شہروں میں زندگی کی دلفریب وضع اور گہما گہمی، خانہ بدوشوں کی قدیم آزاد زندگی جس نے قدرت کے بوقلموں مشاہدات سے اپنا دامن بھر لیا ہے اور ان کی بدولت اپنے اہلے گہلے کوہ صحرا میں

گردش کرنے والوں کے سینوں میں معلومات کے بے شمار انمول خزانے جمع کرا دیے ہیں - جب ہم اس کتاب پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کے اوراق سے ساری باتیں لپک لپک کر ہمارے سامنے آتی ہیں -

اس طرح آزاد ہمارے ادب میں ایک مجموعۂ اضداد ہیں - ایک طرف خشک محقق اور دوسری طرف ایسا تر دماغ ادیب جس میں ہیزلٹ اور رابلے جیسی بھرپور توانائی نظر آتی ہے -

(۷)

ان کا ایک اور چھوٹا سا شاہکار جسے چھوٹے بڑے سب بار بار پڑھتے ہیں اور ہر بار نیا لطف پاتے ہیں ''قصصِ ہند'' ہے - جس کا موضوع اور اسلوب دونوں غیرمعمولی ہیں - آزاد نے یہ قصّے کچھ اس طرح بیان کیے ہیں جیسے وہ ان واقعات سے خود گزرے ہوں - کہانی کس طرح آہستہ آہستہ ، چپکے چپکے خود بخود بے ساختگی سے آگے بڑھتی ہے ! اگلے وقتوں کی عجیب و غریب فضا ، انسانی فطرت کی سچی عکاسی ، قصّے کا قدرتی ارتقا ، شگفتہ اور غیر ضروری آرائش سے پاک عبارت ، یہ باتیں ''قصصِ ہند'' کو اردو میں منفرد تصنیف بنا دیتی ہیں - آزاد کا لاابالی تخیّل ، جو اُن کی دوسری تصنیفات میں خلل انداز ہوتا ہے ، یہاں اعتدال اور ضبط سے بروے کار آیا ہے - یہی سلجھا ہوا تخیّل ہے جس نے اس کتاب کو فنی حیثیت سے اتنا وقیع بنا دیا ہے -

آزاد کی دوسری کتابوں میں بھی کسی حد تک یہی خوبی ہے اور اس کی وجہ وہی ذاتی رنگ ہے جو انھیں اس قدر خوش آیند بنا دیتا ہے - کیونکہ جب تک کوئی چیز آزاد کے تخیّل کے سانچے میں نہ ڈھل جائے ، اس میں وہ نفاست اور پُرکاری نہیں پیدا ہوسکتی جو ان کی انشا پردازی کا طرۂ امتیاز ہے -

(۸)

جہاں تک نفسِ مضمون کو ہلکے پھلکے پیرائے میں پیش کرنے کا تعلق ہے ، آزاد کا کوئی جواب نہیں - ''سخندانِ فارس'' اور ''آبِ حیات'' اس کی بہترین مثالیں

ہیں ، بالخصوص ''سخندانِ فارس'' - دونوں کتابیں علمی مواد سے لبریز ہیں لیکن اور کوئی ادیب ایسے مواد کو اتنی سادگی اور صفائی سے پیش نہیں کر سکا - اس کی وجہ آزاد کا غیر معمولی نابغہ ہے - ان کے جذبات کی تیز رو بھاری سے بھاری مواد کو بھی بہا لے جاتی ہے - بیان کی یہی ہلکی پھلکی وضع ہے جس کے باعث آزاد کی تحریر پر سطحی ہونے کا الزام عائد کیا جاتا ہے -

(٩)

رومانیت ایک اعتبار سے وہ کشش ہے جو دوری سے پیدا ہوتی ہے ، خواہ یہ فاصلے زمانی ہوں یا مکانی - ہم دیکھ چکے ہیں کہ آزاد کس طرح ماضی پر رومان کا رنگ چڑھا دیتے ہیں - لیکن وہ مکانی حیثیت سے دور کی چیزوں کے ساتھ بھی اتنا ہی لگاؤ رکھتے ہیں - اسی نے ان میں سیاحت کا شوق پیدا کیا جو انہیں ہندوستان ، افغانستان ، ایران اور ترکستان کی وسیع پہنائیوں میں لے گیا - بہ حیثیتِ سیّاح ان کا سر سید اور شبلی سے موازنہ دلچسپی سے خالی نہیں - سر سید جہاں گئے اپنا اصلاحی شوق ساتھ لے گئے - جب انھوں نے فرانس اور انگلستان کی صاف ستھری اور دلفریب فضا دیکھی تو انھیں بے اختیار اپنے یہاں کی غلیظ اور گھناؤنی فضا یاد آئی - شبلی نے ایک مسلمان کی حیثیت سے سفر کیا اور ہمیشہ اپنے ہم مذہبوں ہی کی تعریف اور وکالت کی [٢١]- آزاد سراپا رومان ہیں - وہ جو کچھ کہتے ہیں ، کسی چیز کی خوبصورتی اور تعجب آفرینی سے متاثر ہو کر کہتے ہیں اور زندگی کے ہنگاموں کی طلسم آفرینی کے نشے میں باقی سب کچھ بھول جاتے ہیں -

(١٠)

جہاں تک نقّاد کی حیثیت سے آزاد کا تعلق ہے ، ہم نے ابھی تک ان کے صرف ایک پہلو کا جائزہ لیا ہے ، یعنی وہ ذوق و شوق جو ان میں طبعاً کارفرما ہے - بیشک والہانہ پن ادب کی کماحقہ قدر و تحسین کے لیے ضروری ہے لیکن محض ذوق و شوق ، جس پر تنقیدی شعور کی مضبوط گرفت نہ ہو ، عموماً بے راہ روی کی طرف مائل ہوتا ہے اور جو آرا یا فیصلے اس کے تحت صادر ہوتے ہیں ، پا در ہوا ہوتے ہیں -

ادبی اقدار کا شعور آزاد کے ذوق و شوق میں توازن پیدا کرتا ہے ۔ لہٰذا جب کوئی شاعر واقعی تعریف کا مستحق ہو تو وہ اس کی بڑھ چڑھ کر مدح سرائی کرتے ہیں ، اور ساتھ ہی قدیم شاعری کی خامیوں پر کڑی مگر مختصر تنقید بھی کرتے ہیں ۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے ، ممکن ہے وہ سخت گیری سے کام نہ لیں ، لیکن جب وہ ایک دفعہ سختی سے تنقیدی محاسبے کا تہیہ کر لیں تو پھر ذرا بھی نرمی سے کام نہیں لیتے ۔ وہ قدیم اردو شاعری کے نہایت بالغ نظر نقاد ہیں ۔ ان کی رائے میں ادب اور تہذیب میں گہرا تعلق ہے اس لیے وہ اردو شاعری کے پُر تصنّع ہونے پر افسوس تو کرتے ہیں لیکن اس بات پر زور نہیں دیتے کہ یہ اپنے عہد کی کمزوریوں سے کیوں آزاد نہ ہوسکی ۔ انھوں نے اردو شاعری ، اس کے موضوعات ، اسلوب اور زبان و بیان کے متعلق وہی باتیں کہی ہیں جو اس کے سخت سے سخت نقاد کہہ سکتے تھے ، لیکن ان کا لب و لہجہ درشت نہیں ۔ وہ اپنی آرا کی بنیاد حقائق پر رکھتے ہیں ۔ یہ بات انھیں بعض جدید نقادوں سے ممیّز کرتی ہے ۔

(۱۱)

اس سے قدرتی طور پر آزاد کا ایک اور پہلو بھی سامنے آ جاتا ہے ، یعنی ان کی وسیع المشربی اور بے تعصبّی ۔ شاعری کے نقّاد کی حیثیت سے ان میں انتہا پسند معاصروں کی سی بے لحاظی نہیں جو کسی اچھے خاصے فن پارے کو صرف اس لیے رد کر دیتی ہے کہ یہ پوری طرح درجہٴ کمال تک رسا نہیں ۔ ان کا قاری کو وہی مشورہ ہے جو ہیملٹ نے اپنی ماں کو دیا تھا اور یہی ان کا اپنا مسلک بھی ہے :
"برائے خدا ! اپنے کردار کا سفلی پہلو چھوڑ دو تاکہ دوسرے اعالی پہلو سے زیادہ پاکیزہ زندگی بسر کر سکو [۲۲] ۔"

اردو شاعری کی ذوقی خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں :

"ہر شے مختلف کیفیتوں میں خوبصورتی اور بد صورتی کا ایک عالم رکھتی ہے ۔ پس انسان وہی ہے کہ جس پیرائے میں خوبصورتی جوبن دکھائے ، یہ اس سے کیفیت اٹھائے ، نہ کہ صرف حسینوں کے زلف و رخسار

میں پریشان رہے - خوش نظر اسے نہیں کہتے ہیں کہ فقط گل و گلزار ہی پر دیوانہ پھرے - نہیں ، ایک گھاس کی پتی بلکہ سڈول کانٹا خوشنما ہو تو اس کی نوک جھوک پر بھی پھول ہی کی طرح لوٹ جائے ۲۳-''

اسی طرح ہجو نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''افسوس ہے کہ انھوں نے ہجووں میں فحش اور گالیوں سے انتہا درجہ کثافتیں بھری ہیں - خیر ہمیں چاہیے کہ تھوڑی دیر کے لیے شہد کی مکھی بن جائیں - جہاں رسیلا پھول دیکھیں جا بیٹھیں - جالے اور میلے میلے پتّوں سے بچیں اور جب رس لے چکیں فوراً اڑ جائیں -۲٤''

(۱۲)

آزاد کا مزاج محض ان کے اندازِ نظر اور اسلوبِ بیان ہی پر اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ مواد کے انتخاب پر بھی اثر ڈالتا ہے - انھیں حسّی مشاہدات سے دلی رغبت ہے اس لیے وہ افکار یا تحریکات کی بجائے افراد اور ان کی سرگرمیوں سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں - وہ موضوعات میں انتخاب کے قائل ہیں اور صرف ان واقعات اور اشخاص کو ترجیح دیتے ہیں جو ان کے تخیّل کو لبھاتی ہیں اور ان کے شعری احساس کو حرکت میں لاتی ہیں - وہ ایسی ہی چیزوں پر قلم اٹھاتے ہیں جو نظر فریب ، پُر شکوہ ، اندوہناک اور رقّت انگیز ہوں - یعنی وہ تمام امور جن پر ملکۂ شعری عمل کر سکے - اس لیے ان کا انداز شاعروں کے انداز سے مشابہت رکھتا ہے -

(۱۳)

مورخ کی حیثیت سے آزاد کا طریق کار سراسر داخلی ہے - رومان پسندوں کی طرح موضوع ان کے دل و دماغ پر پوری طرح چھا جاتا ہے - وہ تاریخ کی طرف اس طرح رخ نہیں کرتے جیسے یہ کوئی بڑی ہی دور اور نظروں سے اوجھل چیز ہو ، بلکہ ایسی چیز جو ہر وقت ان کے پیش نظر رہتی ہے - یہی شدید شغف ہے جو ان کی

بے پایاں اضطراری حرکات و سکنات ، گریزوں اور سرگوشیوں کا باعث ہے ۔

(۱۴)

دوسرے رومان پسندوں کی طرح آزاد کی ہمدردیاں قطعی طور پر اشرافیہ ہیں ۔ وہ اپنی تحسین اور اپنے تاسف کو تمام تر اکابر کے لیے وقف کر دیتے ہیں ۔ اس لحاظ سے وہ اپنے معاصرین کے ہم شعار نہیں جو امرا و شرفا کے بلند بانگ دعووں کا مضحکہ اڑاتے اور اپنا زورِ قلم اس بات پر صرف کرتے ہیں کہ انھیں اخلاق و ذہنی دونوں حیثیتوں سے سلیم الطبع ، بیدار مغز اور ترقی پسند طبقوں کی ضد قرار دیں ۔ جدید اردو ادب کا بیشتر حصہ شدت سے امرا و رؤسا کے خلاف نفرت و حقارت میں ڈوبا ہوا ہے ، جس کی وجہ یہ ہے کہ آج زندگی پر نظم و ضبط اور متانت و سنجیدگی کا غلبہ ہے جس نے قرونِ وسطیٰ کی ڈھیلی ڈھالی زندگی کی جگہ لے لی ہے جس کی وضع نسبتاً زیادہ خوش آیندہ تھی ۔ سرسید کا اپنے آپ کو بالعموم ایڈیسن اور اسٹیل کے مشابہ قرار دینا بلاوجہ نہیں ۔ ان کا ضابطۂ اخلاق متوسط طبقے کا ضابطۂ اخلاق ہے ۔ یہی بات دوسروں پر بھی صادق آتی ہے ۔ چنانچہ سرشار کے نواب پرلے درجے کے احمق اور سادہ لوح ہیں اور ان کے حاشیہ نشین سب کے سب نہایت عیّار ، جو انھیں بری طرح بے وقوف بنا کر اپنا الّو سیدھا کرتے ہیں ۔ عبدالحلیم شرر نے اپنے ناولوں میں حکمران طبقے کی اوباشی اور بد اخلاق کا خوب خوب پردہ چاک کیا ہے ۔ حالی ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کے حامی ہیں اور اسے نئے معاشرے کا پشت پناہ قرار دے کر اس کے گیت گاتے ہیں [۲۵]۔

امرا و شرفا کی بلند سیرتی آزاد کے لیے جزوِ ایمان تھی ۔ وہ ان کی وضع داری اور خوش خلقی کو پسند کرتے ہیں اور متوسط طبقے کو اس لیے پسند نہیں کرتے کہ اس کی رکھائی اور خود نمائی انھیں ناگوار تھی ۔ آزاد کی تصنیفات سے صاف ظاہر ہے کہ وہ خود اعتمادی ، توانائی اور مضبوطیِ کردار کے ان چند اوصاف کو پسند نہیں کرتے تھے جو ہمارے ہاں انیسویں صدی کے نصف ثانی میں پسے ہوئے متوسط طبقے کو آہستہ آہستہ معاشرے میں مرکزی حیثیت عطا کر رہے تھے ۔ یہ مخالفت اُس اخلاقی ضابطۂ حیات کا نتیجہ تھی جو علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر ماضی کے

نشاط آگیں طرزِ حیات کی جگہ لے رہا تھا۔

"دربارِ اکبری" میں خان خاناں کے مخالفین پر تبصرہ ان کی عوام سے نفرت اور شرفا کی توصیف نگاری کی ایک واضح مثال ہے۔ لکھتے ہیں :

''ہائے ہائے بے رحم دنیا ، اور حیف بیدرد اہلِ دنیا ! گڑھوں کے بسنے والے ، موریوں کے سڑنے والے بادشاہی محلوں میں رہنے والوں پر باتیں بناتے ہیں۔ انھیں کیا خبر ہے کہ اس شاہ نشان امیر کو کیا کیا نازک موقعے اور پیچیدہ معاملے پیش آتے تھے اور وہ سلطنت کی مہموں کو حکومت کے ہاتھوں سے کس طرح سنبھالتا تھا۔ کمینی ، نجس اور ناپاک دنیا ، اس کی آبادی شور و شر کا میلا ہے۔''[۲٦]

* * *

حوالے اور حواشی

۱- آب حیات ، ص ۳۴۲ -
۲- ایضاً ، ص ۳۴۱ - ۳۴۲ -
۳- سی - ایف - اینڈریوز ، ص ۵ - ۶ -
۴- ایضاً ، ص ۱۰ - ۱۱ -
۵- دربار اکبری (ممتاز علی) ، ص ۵۸۱ -
۶- آب حیات ، ص ۸۶ -
۷- ایضاً ، ص ۱۰۷ -
۸- Bagehot ص ۱۱۲ -
۹- آبِ حیات ، ص ۱۵۳ - ۱۵۴ -
۱۰- ایضاً ، ص ۹۷ -
۱۱- ایضاً ، ص ۱۰۱ -
۱۲- ایضاً ، ص ۱۰۶ -
۱۳- ایضاً ، ص ۹۷ -
۱۴- ایضاً ، ص ۱۰۲ -
۱۵- ایضاً ، ص ۱۳۸ -
۱۶- ایضاً ، ص ۳۱۰ - ۳۱۱ -
۱۷- ایضاً ، ص ۱۴۵ -
۱۸- ایضاً ، ص ۱۸۷ -

۱۹- Bagehot، ص ۱۰۹ - ۱۱۱ -

۲۰- مقالات حالی ، حصہ دوم ، ص ۱۴۸ - ۱۵۰ -

۲۱- دیکھیے جی - ایف - گریہم ''دی لائیف اینڈ ورکس آف سید احمد خـاں'' لندن ۱۹۰۹ع ، باب نہم - اور شبلی : ''سفرنامہ' روم و مصر و شام -''

۲۲- آب حیات ، ص ۸۷ -

۲۳- ایضاً ، ص ۳۱٦ - ۳۱۷ -

۲۴- آب ِ حیات ، ص ۳۱٦ - ۳۱۷ -

۲۵- دیکھیے وہ ترکیب بند جسے حـالی نے ۱۸۹۱ع میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ، علی گڑھ میں پڑھا (دیوان حالی ، ص ۱۸۰ - ۱۸۷)

۲٦- دیکھیے دربار اکبری ، ص ٦۴۰ - ٦۴۱ -

دسواں باب

اسلوبِ بیان

(۱)

اربابِ نظر نے آزاد کو بحیثیت نقّاد و مورخ تسلیم کرنے سے جتنا گریز کیا ہے ، اتنی ہی شدت سے ان کے اسلوبِ بیان کی تعریف کی ہے - آئیے ہم ان کے اسلوبِ تحریر کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیں -

آزاد کا اسلوب بعینہ ان کی طبیعت کا آئینہ دار ہے - ہم نے ان کی بحیثیت انسان جتنی خصوصیتیں بیان کی ہیں ، وہ سب ان کے اسلوب میں بھی موجود ہیں - خواہ ہم ان کی شخصیت سے اسلوب کی طرف آئیں یا اسلوب سے شخصیت کی طرف جائیں ، بات ایک ہی ہے - دونوں سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے - ہم دیکھ چکے ہیں کہ آزاد طبعاً جذباتی تھے اور اعلیٰ تخیّل سے بہرہ ور - یہ دونوں خصوصیتیں ان کے اسلوب میں منعکس ہیں -

(۲)

آزاد کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت اس کی محسوس وضع ہے - وہ اپنے موضوع کو مسلسل تصاویر کی شکل میں دیکھتے ہیں - خیالات ان کے سامنے محاکات و مجازات کے لباس میں آراستہ و پیراستہ نظر آتے ہیں - وہ واقعات کو بیان نہیں کرتے ، چشمِ تصوّر سے ان کا مشاہدہ کرتے ہیں اور جو کچھ دیکھتے ہیں ، اسے زندگی کے کیف و رنگ اور حرکات و سکنات میں پیش کردیتے ہیں - مثال کے طور پر ذیل کی جستہ جستہ عبارتیں دیکھیے جو ان کی مختلف تصنیفات سے

چنی گئی ہیں :

''اس حالت میں اس کے عہد بعہد کی تبدیلیاں اور ہر عہد میں اس کے باکمالوں کی حالتیں نظر آئیں ... چنانچہ اس لحاظ سے پانچ جلسے سامنے آئے ... ایک نے دوسرے کو رخصت کیا اور اپنا رنگ جمایا [۱]۔''

''غرض یہ سب باتیں میری آنکھوں میں اس طرح عبرت کا سرمہ دیتی ہیں گویا وہی زمانہ اور وہی اہلِ زمانہ موجود ہیں [۲]۔''

''غرض خیالاتِ مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات بزرگوں کے معلوم ہیں ... اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، چلتی پھرتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں [۳]۔''

''اس سمے کا تماشہ ایک عالم ہوگا، دیکھنے کے قابل۔ آزاد اس حالت کا فوٹوگراف الفاظ و عبارت کے رنگ و روغن سے کیونکر کھینچ کر دکھائے [٤]۔''

یہی تخیّل کی زود حسی اور نت نئی شکلوں میں جلوہ گری ہے جس سے عبارت کی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں، اور ان کے ساتھ ہی جابجا خرابیاں بھی رونما ہوتی ہیں۔ بعض موضوع فی نفسہ ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر تخیّل کی سحرکاری اپنا اثر دکھا سکتی ہے اور بعض ایسے جن کا حق براہِ راست اظہار ہی سے ادا ہو سکتا ہے۔ آزاد کو تشبیہوں اور استعاروں کا اس قدر شوق تھا کہ یہ چیزیں ان کا تکیۂ کلام بن کر رہ گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خواہ کوئی بھی موضوع ہو وہ اس کو تخیّل سے آب و رنگ عطا کیے بغیر نہ رہ سکتے۔ ان کے اسلوب کا یہ پہلو ایسا ہے جس پر بحث کے لیے اصل موضوع سے قدرے انحراف کی ضرورت ہے۔

(۳)

نثر اور نظم کا امتیاز اگرچہ بعض اوقات گمراہ کن ثابت ہوتا ہے، پھر بھی تفہیمِ مسائل کے لیے بڑی حد تک ضروری ہے۔ نثر فی نفسہ مدلّل، توضیحی و تشریحی اور تجزیاتی ہوتی ہے۔ نثر نگار بالعموم باقی تمام بیرونی اثرات و عائدات سے اجتناب کرتا ہے، اور ایسے مقابلوں اور موازنوں سے کام لیتا ہے جن سے بیان

میں وضاحت اور زور پیدا ہو۔ یعنی ایسی خصوصیتیں اُبھر آئیں جو نمایاں طور پر شعوری ہوں۔ لیکن اگر یہ صورت پیدا ہو کہ نفسِ مضمون پر جو توجہ مرکوز ہو وہ اس سے برطرف ہو جائے تو اسلوب ناقص ہوگا۔ اس کے برعکس شاعر تخیّل کو متاثر کرتا ہے، اور من جملہ دیگر امور کے، جو بالفعل زیرِ بحث نہیں، وہ ساحرانہ عنصر، جو اس کی تخلیقی کاوشوں کو محسوس و مرئی شکل عطا کرتا ہے، مجاز ہے۔ نثر اور نظم میں یہی فرق ہے۔ نثر شعوری و تجزیاتی ہوتی ہے، وہ تشریح و توضیح کرتی ہے۔ نظم تخیّلی اور ربط آفریں ہے۔ وہ قاری کے سارے وجود کو اس طرح متحرک کر دیتی ہے کہ وہ اپنے اندر تجربے کو ازسرِنو تخلیق کر سکے۔ بالفاظِ دیگر تشبیہات و استعارات نثر میں محض شعوری عنصر کے طور پر کام کرتے ہیں۔ عملاً نظم و نثر ایک دوسرے سے اس قدر دور نہیں کہ ان میں کوئی نقطۂ اتّصال نہ ہو۔ نثر کے پیرائے اتنے متنوّع ہیں کہ یہ کسی سائنس داں یا فلسفی کی خشک، منطقی تحریر سے شروع ہو کر گوناگوں مرحلوں سے گزرتے ہوئے ڈی کونسے یا رسکن کی تحریر تک پہنچ جاتی ہے، جن میں شاعری کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ شاعری اپنی ظاہری وضع قطع برقرار رکھتے ہوئے نثر کی صورت اختیار کرے، اسی لیے کولرج نے کہا ہے کہ شاعری کی حقیقی ضد نثر نہیں بلکہ سائنس ہے۔

مگر نظم و نثر کا اس طرح ایک دوسرے میں خلط ملط ہو جانا نقاد کے لیے کوئی دشواری نہیں پیدا کرتا۔ اسلوب کا مسئلہ بڑا سیدھا ہے۔ کیا یہ موضوع کا حق ادا کرتا ہے؟ کیا یہ مطلوبہ خیال کو اُبھارتا اور تقویت پہنچاتا ہے؟ اسلوب کا کام بس اتنا ہی ہے کہ کوئی بات کیسے ادا کی جائے۔ تشبیہ اور استعارہ کلام کو زیادہ موثر بنانے کے لیے عام طریقِ بیان سے انحراف کے مترادف ہوتے ہیں۔ اسلوب کے معنی ہیں طریقۂ اظہار، اور تشبیہ اور استعارہ آرائش و زیبائش کے لیے نہیں بلکہ وسیلۂ اظہار کے طور پر برتنے میں آتے ہیں۔ اس توضیح کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آزاد کی تحریروں میں تشبیہ و استعارہ کا استعمال برمحل ہے یا نہیں۔ کیا یہ بیان کو زیادہ واضح اور زوردار بنانے میں مدد دیتے ہیں یا مطلوبہ معنی کے اظہار میں حائل ہو کر توجہ کو ہٹا دیتے ہیں؟ قارئین جانتے ہیں کہ آزاد کا تخیّل غیرمعمولی حد تک شوخ اور ان کے شعور سے کہیں زیادہ قوی ہے۔ آپ

آزاد کو کوئی چیز پیش کردیں ، وہ فی الفور اُس کے مانند کسی اور چیز کا تصوّر کرنا شروع کر دیتے ہیں ۔ تخیّل کی اس تیزی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ آزاد پیکر آفرینی کی طرف بے حد مائل ہیں ۔ "آبِ حیات" میں ولی کا ذکر ملاحظہ ہو :

"نظمِ اُردو کے عالم کا پہلا نو روز ہے ۔ نفسِ ناطقہ کی روح ، یعنی شاعری عالمِ وجود میں آئی تھی مگر بچوں کی نیند پڑی سوتی تھی ۔ ولی نے آ کر ایسی میٹھی آواز سے غزل خوانی شروع کی کہ اس بچے نے ایک انگڑائی لے کر کروٹ لی اور اثر اس کا دفعۃً حرارتِ برق کی طرح دل میں دوڑ گیا ۵ ۔"

یا "نیرنگِ خیال" میں اُردو کی نشو و نما اور ترقی کا یہ نقشہ ملاحظہ کیجیے :

"زبان اُردو ایک لاوارث بچہ تھا کہ اُردوے شاہجہانی میں پھرتا ہوا ملا ۔ کسی کو اس غریب کے حال کی پروا نہ ہوئی ۔ اتفاقاً شعرا نے اُٹھا لیا اور محبت سے پالنا شروع کیا ۔ اس نے انھی کے کھانے سے خوراک پائی ، انھی کے لباس سے پوشاک پہنی ، انھی سے تعلیم کا سرمایہ لیتا رہا ۔ اسی واسطے انھی کی زبان سے بولنا سیکھا ، انھی کے قدموں پر چلنا سیکھا ، انھی کے خیالات اُس کے دل و دماغ میں سمائے ۶ ۔"

ان تحریروں میں آزاد خیالات کو اس طرح تمثیلی پیرائے میں پیش کرتے ہیں جس طرح بلیک یا صادقین اپنی تصاویر کو ۔ ان خیالات کو صاف سیدھے پیرائے میں براہِ راست پیش کیا جا سکتا تھا لیکن آزاد کا تخیّل شعور سے زیادہ تیز ہے ۔ اور اس طرزِ عمل کا نتیجہ بیان نہیں بلکہ تصویر کشی ہے ۔ کیا خیالات کو اس طرح ادا کرنے سے برجستگی اور قطعیت کو نقصان پہنچتا ہے یا فائدہ ؟ اس پر ہم پھر بحث کریں گے ۔ فی الحال قابلِ غور بات یہ ہے کہ آزاد ان فن پاروں میں قارئین کو محض معلومات نہیں بہم پہنچا رہے ، بلکہ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ وہ ان سے کس طرح متاثر ہوئے ۔ ان کی تمام تحریروں میں یہی گہرا ذاتی میلان پایا جاتا ہے ۔ ذیل کے چھوٹے چھوٹے تراشے اس رجحان کو اور بھی واضح کرتے ہیں :

"چنانچہ ماگدی (پالی) ، سورسینی ، مہاراشٹری وغیرہ ، قدیمی پراکرتیں اب بھی اپنی قدامت کا پتا بتاتی ہیں ۔ ان کی سیاہی میں

سینکڑوں الفاظ سنسکرت کے چمکتے نظر آتے ہیں ، مگر بگڑے ہوئے ہیں ۷۔''

''ایک چھوٹا دیوان مرتب کیا ۔ اس کا نام 'دیوان زادہ' رکھا ، کیونکہ پہلے دیوان سے پیدا ہوا تھا ۔ وہ صاحب زادہ بھی پانچ ہزار سے زیادہ کا مال بغل میں دبائے بیٹھا ہے ۸۔''

ان دو مثالوں میں معلومات کے علاوہ کچھ اور بھی ملتا ہے ۔ آزاد ان سے کیسے متاثر ہوئے ، یہی غنائی یا ذاتی عنصر ہے جو انھیں شعرا کے بہت قریب لے آتا ہے ۔ شاعری کا کوائف یا حقائق سے اتنا سروکار نہیں جتنا ان احساسات و کیفیات سے جو ان کے باعث دل میں ابھرتے ہیں ۔

آزاد خیالات کو کس طرح پیش کرتے ہیں ، اس کے لیے "آبِ حیات" کی یہ دو عبارتیں ملاحظہ ہوں :

''قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں ۔ دیکھنا اہلِ مشاعرہ آن پہنچے ۔ یہ کچھ اور لوگ ہیں ۔ ان کا آنا غضب آتا ہے ۔

ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہوں گے کہ جن کی شوخی اور طراریِ طبع بارِ متانت سے ذرا نہ دبے گی ۔ اتنا ہنسیں اور ہنسائیں گے کہ منہ تھک جائیں گے ، مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے ، نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے ۔ انھی کوٹھوں پر کودتے پھاندتے پھریں گے ۔ ایک مکان کو دوسرے مکان سے سجائیں گے اور ہر شے کو رنگ بدل بدل کر دکھائیں گے ۹۔''

''اس میں دو قسم کے باکمال نظر آئیں گے ۔ ایک وہ کہ جنھوں نے اپنے بزرگوں کی پیروی کو دین و آئین سمجھا ۔ یہ ان کے باغوں میں پھریں گے ۔ پرانی شاخیں ، زرد پتّے کاٹیں چھانٹیں گے اور نئے رنگ ڈھنگ سے گلدستے بنا کر گلدانوں سے طاق و ایوان سجائیں گے ۔ دوسرے وہ عالی دماغ جو فکر کے دخان سے ایجاد کی ہوائیں اڑائیں گے اور برجِ آتش بازی کی طرح اس سے رتبۂ عالی پائیں گے ۔ انھوں نے اس ہوا سے بڑے بڑے کام لیے مگر یہ غضب کیا کہ گرد و پیش جو

وسعت بے انتہا پڑی تھی اس میں سے کسی جانب میں نہ گئے۔ بالا خانوں ہیں سے بالا بالا اُڑ گئے۔ چنانچہ تم دیکھو گے کہ بعض بلند پرواز ایسے اوج پر جائیں گے جہاں آفتاب تارا ہو جائے گا۔ اور بعض ایسے اُڑیں گے کہ اُڑ ہی جائیں گے۔ وہ اپنے آئین کا نام خیال بندی اور نازک خیالی رکھیں گے، مگر حق یہ ہے کہ شاعری ان کی ساحری اور وہ خود اپنے وقت کے سامری ہوں گے [۱۰]۔''

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ آزاد کا تخیّل کس قدر شوخ ہے اور کس آسانی سے تشبیہوں اور استعاروں کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ یہاں لکھنوی دبستان کا چونچلا پن اور مبالغہ آرائیاں اور شاہ نصیر، مومن اور غالب کی پیچیدہ بیانی اور دور از کار موشگافیوں کا کیسے چلبلے پیرائے میں نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جلی خط والے جملے دیکھ کر بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر ہم یہ بھی فراموش نہیں کر سکتے کہ عمدہ نثر کا انداز کبھی ایسا نہیں ہوتا اور نہ اسے اس طرح ادائگی کا پیرایہ اختیار کرنا چاہیے کیونکہ نثر کا مقصد مفہوم کو قاری کے ذہن نشین کرنا ہے۔

(۴)

ہمارے خیال میں آزاد کے اسلوب پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس سے شعور کی تسکین نہیں ہوتی۔ وہ ہمیں اپنے تخیّل کے غیرمتوقع کرشموں سے متاثر اور محظوظ تو کرتے ہیں، لیکن کیا وہ مطالب کو بھی قاری کے ذہن نشین کرتے ہیں؟ کیا ان کا تخیّل ذہن کو نفسِ مضمون سے بھٹکا کر کہیں اور تو نہیں لے جاتا؟ بے شک پہلے ہم کچھ تعجب آفریں حظ اٹھاتے ہیں مگر جب یہ مرحلہ گزر جاتا ہے تو ہم عبارتوں سے تشبیہ اور استعارے کا لبادہ اتار کر ان کے مفہوم تک پہنچنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر آزاد خیال کو یا تو احساسات میں تحلیل کرتے ہیں یا تخیّل سے مجسّم کر دیتے ہیں۔ وہ اشاروں اور کنایوں میں مبہم طور پر بات کہتے ہیں جس سے شعور کی تسکین نہیں ہوتی۔

آزاد کی حمایت میں یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ جہاں خیالات کے غیر واضح

ہونے سے نقصان ہے وہاں ان کے دل آویز ہونے سے فائدہ بھی ہے ۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے ، حسن کاری کے معنی یہ نہیں کہ مضمون پر خواہ مخواہ سامانِ آرائش لاد دیا جائے ۔ اسلوب تو نفسِ مضمون اور اظہار میں پوری ہم آہنگی پیدا کرنے کا نام ہے ، یعنی مضامین یا تجربات کو ایسے پیرائے میں پیش کیا جائے جو انشا پردازی کے فطری قوانین کے مطابق ہو ۔

آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ آزاد کا ذہن کن کن مختلف طریقوں سے کام کرتا ہے ۔ بالعموم وہ ایک ہی لفظ ، فقرے یا تمثیل سے پوری کی پوری تصویر پیش کر جاتے ہیں :

''اس عہد کی حالت اور بھاشا زبان کو خیال کرتا ہوں تو سوچتا رہ جاتا ہوں کہ یہ صاحبِ کمال ، زبان اردو اور انشائے ہندی میں کیونکر ایک نئی صنعت کا نمونہ دے گیا ، اور اپنے پیچھے آنے والوں کے واسطے ایک نئی سڑک کی داغ بیل ڈالتا گیا ۔ کیا اسے معلوم تھا کہ اس طرح یہ سڑک ہموار ہوگی ، اس پر دوکانیں تعمیر ہوں گی ، لالٹینوں کی روشنی ہوگی ، اہلِ سلیقہ دوکان دار جواہر فروشی کریں گے اور اردوے معلٰی اس کا خطاب ہوگا ؟[۱۱]''

یہاں کوچہ و بازار کی تصویر مناسبات اور سرگرمیوں کے حوالے سے پیش کی گئی ہے ۔ یعنی دکانیں ، لالٹینیں ، بنج بیوپار ، دوکان دار ، گہما گہمی ، یہ ساری تصویر ایک ہی لفظ "اردوئے معلٰی" نے سجھائی ہے ۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آزاد کو کوئی تشبیہ ہاتھ آ جائے تو پھر وہ جب تک ایک ایک کرکے اس کے تمام مناسبات نہ گنوادیں ، اسے چھوڑتے نہیں ۔ مثلاً یہ عبارت لیجیے :

"میر خلیق ، نازک خیالیوں میں ذہن لڑا رہے تھے کہ باپ کی موت نے شیشے پر پتھر مارا ۔ عیال کا بوجھ پہاڑ ہوکر سر پر گرا جس نے آمد کے چشمے خاک ریز کردیے ، مگر ہمت کی پیشانی پر ذرا بھی بل نہ آیا [۱۲]۔''

یہاں استعارے پر استعارہ ہے اور ہر استعارہ پچھلے استعارے کی مدد سے ذہن میں آتا ہے ۔ یہی اس عبارت کی خامی ہے ۔ پہلی عبارت میں صرف ایک ہی

منظر کو پوری طرح اجاگر کیا گیا ہے اور یکے بعد دیگرے ہر تفصیل ذہن پر تصویر کا گہرا نقش بٹھا دیتی ہے۔ دوسری عبارت میں ربط نہیں، اس میں ذہن ایک تصویر سے دوسری تصویر کی طرف لگاتار بڑھتا چلا جاتا ہے۔ استعارے اثر کو دوبالا کرنے کی بجائے ایک دوسرے کو قطع کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ شوقِ آرائش بعض اوقات نرا گورکھ دھندا بن جاتا ہے:

"فطرت کے چمن میں حکم ہوا، مشورت کی بلبلیں آئیں کہ بنگالہ کے لیے کیا صلاح ہے۔ بعض کا زمزمہ ہوا کہ برسات میں ملکِ مقبوضہ کا بندوبست ہو۔ جاڑے کی آمد میں بنگالہ پر خون ریزی سے گلزار کا خاکہ ڈالا جائے۔ بعض نے نغمہ سرائی کی کہ غنیم کو دم نہ لینے دو۔ اُڑ جائیں اور چھری کٹاری ہو جائیں کہ یہی بہار ہے۔ فتح کے گلچیں اور سلطنت کے باغبان نے کہا کہ ہاں یہی ہانک سچی ہے [۱۳]۔"

اور یہ تو اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے:

"۹۶۴ھ میں بیرم خاں کا بڑھاپا اقبال کی جوانی میں لہلہا رہا تھا۔ ہیموں کی سہم مار لی تھی۔ اکبر شکار کھیلنے لاہور کو چلے آتے تھے جو نغمۂ بلبل کی سُروں میں کسی نے آواز دی کہ بڑھاپے کے باغ میں رنگین پھول مبارک ہو [۱۴]۔"

ان دونوں عبارتوں میں آزاد قصداً اثر پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ کلام میں شعریت پیدا کی جائے۔ ایسی عبارتوں سے، جو آزاد کے یہاں بکثرت ہیں، پتا چلتا ہے کہ وہ فارسی کے پرانے اسلوبِ انشا پردازی سے کبھی بھی پیچھا نہ چھڑا سکے۔ نہ صرف بحیثیتِ انسان بلکہ انشا پرداز کی حیثیت سے بھی وہ جتنے حال سے وابستہ ہیں اتنے ہی ماضی میں بھی پیوست ہیں۔ بیان و بدیع کی جملہ بے اعتدالیاں ان کے ہاں موجود ہیں۔

آزاد کی اکثر بے اعتدالیاں استعارے کے استعمال کا نتیجہ ہیں۔ استعارہ تخیّل کی زبان ہے اور عام طور پر نثر کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس تشبیہ اس سے زیادہ منطقی چیز ہے۔ تاوقتیکہ اس کو حد سے زیادہ نہ پھیلایا جائے، یہ بیان میں وضاحت پیدا کرتی ہے۔ "قصصِ ہند" سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"جب تحریریں پہنچیں اور تحقیق ہوا تو اسی وقت ضلع ضلع سے

فوجیں سمیٹ کر برستی گھٹا کی طرح شمال سے اٹھا اور آتے ہی سرحد کے ملکوں پر آفت برسا دی [۱۵]۔"

"پیادے پیادوں سے لپٹ گئے، سوار گھوڑوں سے کود پڑے، ہاتھیوں نے اپنا پرایا کچھ نہ دیکھا، سب کو چکی کی طرح دل ڈالا [۱۶]۔"

"یہ سن کر محمود کے دہانِ طمع میں پانی بھر آیا اور دل سانپ کی طرح لہرانے لگا [۱۷]۔"

"شاہِ باتدبیر نے اس خبر کو یہیں بند رکھا کہ اگر لڑتی ہوئی فوج کو یہ خبر وحشت ناک پہنچی تو سارے لشکر میں ہل چل پڑ جائے گی۔ فوراً اپنی رکاب کی فوج لے کر برق و باد کی طرح لپکا اور اس کالی آندھی کے سامنے جا کر پہاڑ کی طرح ڈٹ گیا [۱۸]۔"

"جاں نثار سپہ سالار کو بادشاہ کے حکم اور ولیعہد کی بات کا خیال تھا۔ جب دیول دیوی کو نہ پایا بہت گھبرایا۔ ٹھیرنا مناسب نہ جانا، جنگل اور پہاڑ میں برابر تین دن تک بجلی کی طرح کڑکتا اور بادل کی طرح برستا چلا گیا [۱۹]۔"

آزاد تشبیہوں کے استعمال میں ناکام ثابت ہوتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ یہ تشبیہیں بہت شاعرانہ ہوتی ہیں بلکہ بے ہنگم ہوتی ہیں۔ یہ ایسے تلازمات کا سلسلہ چھیڑ دیتی ہیں جو ذہن کو نفسِ مضمون سے دور لے جاتے ہیں۔ "دربارِ اکبری" کی یہ عبارت دیکھیے:

"بدگویوں کی زبانیں قلم ہوگئیں اور حاسدوں کے منہ دوات کی طرح کھلے رہ گئے [۲۰]۔"

یہاں آزاد ایسا منظر پیدا کرتے ہیں جس میں بے ہنگم باتیں جمع ہو کر ذہن کو اصل مطلب یعنی سپہ سالار کی بہادری سے کہیں دور بھٹکنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ یہ لغزشیں نامناسب تحریر کی ذیل میں آتی ہیں۔ متذکرہ عبارت میں دوات کی تشبیہ قلم سے پیدا ہوئی ہے اور قلم و دوات کا جو جوڑ نبھایا گیا ہے وہ حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ ایسی مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ آزاد کس طرح اپنے آپ کو بے لگام تخیّل کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے تھے۔

یہی اعتراض آزاد کی تجسیمات پر بھی وارد ہوتا ہے ۔ تجسیم ایک ایسی ہیئتِ ترکیبی ہے جس سے بے جان چیزوں کو جان دار فرض کرکے انھیں اضافی اوصاف سے متّصف کیا جاتا ہے ۔ یہ اُس قدیم اندازِ فکر کی یادگار ہے جب جان دار اور بے جان میں امتیاز نہیں کیا جاتا تھا ، یہاں تک کہ بے جان مادے کو بھی جان دار تصوّر کیا جاتا تھا ۔ یہ پیرایہ شاعر کا قدرتی ہتھیار ہے اور آزاد اسے شاذ و نادر ہی ایسے انداز میں استعمال کرتے ہیں جو غیر رسمی ہو :

"یہ نظمِ اردو کی نسل کا آدم جب ملکِ عدم سے چلا تو اس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا جس میں وقت کے محاورے نے اپنے جواہرات خرچ کیے اور مضامین کی رائج الوقت دست کاری سے میناکاری کی ۲۱۔"

"غرض جب ان کا دیوان دلی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا ، قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا ، لذّت نے زبان سے پڑھا ۲۲۔"

ہمارے خیال میں یہ طرزِ تحریر اُس استعارہ طرازی کی یادگار ہے جس کا آزاد کے زمانے تک برابر رواج رہا اور جس کا سلسلہ سابقہ ادوار کی فارسی نثر تک جاتا ہے ۔ آزاد کے یہاں اس کی موجودگی اس دوگونہ وفاداری کی زندہ مثال ہے جس کا ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں ۔

آزاد کی اکثر تجسیمات بے جان ہیں لیکن جب ان کی فکر عروج پر ہوتی ہے اور تخیّل موضوع کی بلندی سے اشتعالک پاتا ہے تو ان تجسیمات میں ایسی آب و تاب اور برجستگی پیدا ہو جاتی ہے جو آزاد ہی کا حصّہ ہے ۔ ذیل کی عبارت میں یوں لگتا ہے جیسے "خاموشی" ، "تاریکی" اور "رات" واقعی پُر اسرار کردار ہیں جو خوف ناک معرکۂ کارزار میں فیصلہ کن حصّہ لے رہے ہیں :

"تکبیر کی آواز سے برہمنوں اور پلنڈوں کے دلوں میں گیان اور دھرم کی آگ سے ایک دھواں اٹھا اور راجپوتوں کے دلوں میں خونِ غیرت نے جوش مارا ۔ دفعتہً آگ بگولا ہو کر دوڑے ۔ جو تیرانداز فصیل پر کھڑے تھے ان سے آتے ہی چھری کٹاری ہو گئے اور سب کو کاٹ کر نیچے گرا دیا ۔ پھر تو اُدھر سے آتش بازی کے بان اور رال

کی ہانڈیاں تھیں اور ادھر سے تیروں کی بوچھاڑ اور برچھیوں کی بجلیاں ۔ عالم گرد و غبار سے اندھیرا ہوگیا اور لڑائی برابر ترازو کے تول تلی ہوئی تھی ۔ مگر قلعے کا پلہ بھاری تھا کہ اتنے میں شام نے آ کر اندھیرے کی سپر بیچ میں رکھ دی ۔ دونوں لشکر اپنے اپنے مقام پر آئے ۔ شبخون کی روک تھام کا بندوبست ہوا ... غرض دونوں طرف سناٹے کا عالم تھا ۔ اندھیری رات میں سنسان جنگل سائیں سائیں کرتا تھا اور گھوڑے سے لے کر اونٹ تک سانس لیتا تھا [۲۳]۔''

مجازات متلاطم جذبات کی علامت ہیں اور عام طور پر شعری فضا ہی میں بھلے لگتے ہیں ۔ حقائق کے لیے براہِ راست اظہار ضروری ہے جن سے تمثیلات کو کوئی مناسبت نہیں ۔ اسی لیے آزاد کی تشبیہیں اور استعارے وہیں کامیاب ہوتے ہیں جہاں فضا فی الواقع جذباتی ہو ۔

آزاد کی ذکاوتِ حس صرف اشیا کی مشابہت ہی تک محدود نہیں ۔ وہ لفظی مناسبتوں سے بھی اتنا ہی مس رکھتے ہیں ۔ یہ لفظی موشگافیاں جو صنائع و بدائع کہلاتی ہیں ، پرانے ادیبوں کا سرمایہ تھیں ۔ وہ ان کے ساتھ اسی طرح کھیلتے تھے جس طرح بازیگر گیندوں سے ۔ عام طور پر جو ادیب لفظی رعایتوں کی طرف مائل ہو اسے ایک حد تک قطعیت اور فطری بے ساختگی کو خیر باد کہنا ہی پڑتا ہے ۔ عام اصول کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ لوازم قاری کی توجہ کو منحرف کر دیں اور خیال کے سیدھے سادے ، براہِ راست اظہار میں سدِ راہ ہوں تو معیوب ہیں اور ان کی ادب میں کوئی جگہ نہیں ۔ اس کے برعکس اگر فطری اور بے ساختہ ہوں (جو کم ہی دیکھنے میں آتا ہے) تو ان سے مسرت آمیز تعجب پیدا ہوتا ہے ۔ "آبِ حیات" سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

''۱۲۶۴ ہجری میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے ۔ یکایک ایسا موت کا جھونکا آیا کہ شعلے کی طرح بجھ کر رہ گئے ۔ آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہونا تھا [۲۴]۔''

''تمام دربار چمک اٹھا اور میاں جگنو مدھم ہو کر رہ گئے [۲۵]۔''

''اصل پیشہ سپہ گری تھا ۔ تباہی سلطنت سے ہتھیار کھول کر مضمون

باندھنے پر قناعت کی اور زینت المساجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کر اٹھے ۲۶۔''

وہ فیض آباد میں تھے - لکھنؤ کے دارالخلافہ ہو جانے سے وہاں آئے اور وہیں عمر بسر کی - ٹکسال ایک محلہ مشہور ہے - اس میں بیٹھ کر شعر کے چاندی سونے پر سکہ لگاتے تھے اور کھوٹے کھرے مضمون کو پرکھتے تھے ۲۷۔''

ان میں سے اکثر نمونے ایسے ہیں جن پر دانستہ کاوش اور تصنّع کا گماں نہیں ہوتا ، لیکن ہم اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے - مذاق درحقیقت ابتدائی تربیت ، ائتلافات اور ماحول کا نتیجہ ہوتا ہے - اور جو بات ایک کو مرغوب ہو ، ضروری نہیں دوسروں کو بھی پسند ہو - ہمیں اعتراف ہے کہ ہمیں آزاد کی بعض مثالیں پسند ہیں ؛ مثلاً دوسرا حوالہ تو واقعی شاہکار ہے اور اس لطیفے کی جان جس میں یہ تلازمہ واقع ہوا ہے -

ایک دو بار آزاد نے تلازمات کو بڑے ہی لطیف اور مزاحیہ پیرائے میں برتا ہے اور اتفاق سے ان کا تعلق دو متوسط اشخاص ہدہد اور جگنو سے ہے - وہ تمام مو شگافیاں اور بوالعجبیاں ، جو سنجیدہ نثر میں کھٹکتی ہیں ، مزاحیہ تحریروں میں لطف دیتی ہیں - اس قسم کی آنکھ مچولی اعتدال سے ہو تو بھلی یا کم از کم بے ضرر ہے اور حد سے گزر جائے تو بد مذاق تک جا پہنچتی ہے - مثلاً :

''کمبخت برج علی جب حضور میں پہنچا تو پہلے 'ملا' پیر محمد سے ملنا واجب تھا کہ وکیلِ مطلق ہوگئے تھے - 'ملا' قلعے کے برج پر آترے ہوئے تھے - برج علی سیدھا برج پر چڑھ گیا اور اخلاص و نیاز کے پیغام پہنچائے - ان کا دماغ برجِ آتش بازی کی طرح آڑا جاتا تھا - بڑے خفا ہوئے - وہ بھی آخر جاں نثار و نمک حلال کا وکیل تھا ، شاید کچھ جواب دیا ہوگا - یہ ایسے جامے سے باہر ہوئے کہ حکم دیا باندھ کر ڈال دو اور مار کر تھیلا کردو - اس پر بھی دل کا بخار نہ نکلا - کہا کہ برج پر سے گرا دو - اسی وقت گرایا گیا اور دم کے دم میں جسم کی عمارت زمین سے ہموار ہوگئی ۲۸۔''

(۵)

آزاد کی نثر میں زبان کے مجازی استعمال سے جو بحث کی گئی ہے اس سے ادب میں تمثیلی عنصر کا سوال ختم نہیں ہو جاتا ۔ آزاد کا تخیّل بیانیہ نثر میں بھی بے تکلفی اور برجستگی سے داخل ہو جاتا ہے اور بہت بہتر اثر پیدا کرتا ہے ۔ بیانیہ قوت ، یعنی جو چیزیں یا واقعات بیان کیے جائیں ان میں پوری واقعیت آ جائے ؛ آزاد کا اس پیرایۂ اظہار میں کوئی حریف نہیں ، جب ان کی بیانیہ قوت نقطۂ عروج پر ہوتی ہے ، اس کا اندازہ ''سخن دانِ فارس'' کی اس عبارت سے کیا جا سکتا ہے :

''دفعۃً ہوا بند ہو گئی ۔ ابر سا گھر آیا ۔ دنیا دھواں دھار ہو گئی ۔ پھر سفید غبار سا برستا ہوا معلوم ہوا ۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو زمین پر ، کوٹھوں پر ، دیواروں اور منڈیروں پر کوئی سفید سفید آٹا سا چھڑک گیا ۔ غرض کہ ایک جھکولا برف کا اور پڑا ۔ رات گزری ، صبح کو دیکھا تو تمام درختوں پر برگ ریز کا حکم پہنچ گیا ۔ دوسرے دن ایک جھکولا اور ، اور ساتھ ہی ایک سناٹا ہوا کا آیا ۔ پھر جو دیکھا تو درخت پر پتّے کا نام نہیں ۔ جو درخت کہ ہفتہ بھر پہلے پتّوں سے بھرے تھے اب خالی جھاڑیاں کھڑے ہیں جیسے کسی نے کپڑے آتار دیے ۔ وہ بھی سیاہ رنگ جیسے بجلی مارا لوہا ۔ ایک دو دن بعد برف برسنی شروع ہوئی مگر کس طرح ؟ جیسے کوئی آسمان پر بیٹھا روئی دھنک رہا ہے ۔ ایک دن رات جو برف کا تار لگا تو در و دیوار ، زمین آسمان تمام سفید ۔ وہ سیاہ جھاڑیاں برف جم کر بلور کے درخت اور شیشے کی شاخیں ہو گئیں ...

پہاڑوں پر برف کے پہاڑ چڑھ گئے ، جنگلوں میں برف سے رستے رک گئے ۔ سوداگر جہاں کے تہاں بیٹھ رہے ۔ میدان ، کھیت ، گلی کوچے میں گھر گھر قد آدم برفیں چڑھ گئیں ۔ بازاروں میں سناٹا ، کارخانے بند ۔ غریب کاریگروں کے کاروبار ان کے ہاتھوں سے بھی ٹھنڈے ۔ کوٹھوں پر برف کے انبار ہیں ۔ جلدی گراؤ ! نہیں تو گھر بیٹھا ۔ امرا کے غلام ،

نوکر، مزدور، لکڑی کے پنچ شاسے اور پھاوڑبساں لیے ہیں، برف گرا رہے ہیں۔ غریب غربا اپنا کام آپ ہی کرتے ہیں۔ پھر گھروں میں آ گھستے ہیں۔ آگ بغیر گزارہ نہیں۔ انگیٹھی بیچ میں لے بیٹھتے ہیں۔ جن کو خدا نے دیا ہے ان کے ہاں آتش دان اور بخاریاں روشن ہوتی ہیں۔ کمروں کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ وہ گھروں میں دنبے کاٹتے ہیں، مرغ ذبح کرتے ہیں، نہیں تو گوشت قاق کے پلاؤ دم دیتے ہیں۔ اس کی یخنیاں پیتے ہیں۔ کلے پائے اور شب دیگیں پکا پکا کر کھاتے ہیں اور چائیں آڑاتے ہیں لیکن باہر تمام عالم ویرانہ ہے۔ کھیت اور باغ سب سنسان۔ گیدڑ، لومڑی، خرگوش بلکہ چوہا تک جنگل میں نظر نہیں آتا۔ اپنے اپنے بھٹوں اور بلوں میں گھس رہتے ہیں۔[۲۹]''

یہ ادب پارہ کیفیت سے لبریز ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں تشبیہ و استعارہ کو زیادہ دخل نہیں، اور جو بھی کہا گیا ہے برمحل اور برجستہ پیرائے میں۔ چھوٹے چھوٹے جملے، ان کا تیز رَو ترنم اور تخیّل کی گہرائی بیک جنبش، تھوڑی سی جگہ میں، ایران کے موسمِ سرما کی تمام شعریت سمیٹ لیتی ہے، اور پورا نقشہ بڑی وضاحت سے نظروں کے سامنے لے آتی ہے۔

اسی طرح "قصصِ ہند" کی یہ عبارت بھی آزاد کی قدرتِ بیان کی خبر دیتی ہے۔ اس کا موضوع پچھلی عبارت کے موضوع سے یکسر مختلف ہے۔ یہ بھی آرائش سے بالکل پاک ہے۔ عبارت کا 'پرشکوہ آہنگ، شدید نظم و ضبط، کفایتِ الفاظ اور اشارے کنائے سے پیدا ہونے والی قادرالکلامی اسے اردو نثر کے بہترین شہکاروں میں جگہ دیتی ہے:

''راجہ نے بھی باہر نکل کر خوب خوب مقابلے کیے۔ جان ہاروں نے ملک کے نام پر جانیں قربان کیں، مگر کہاں تمام ہندوستان کا تاج دار، کہاں چتوڑ کا باجگزار۔ جوان جوان بیٹے آنکھوں کے سامنے مارے گئے، بڑے بڑے سردار کٹ گئے۔ جب سب سے آس ٹوٹ گئی تو ایک بیٹا باقی تھا، اسے بلا کر کہا کہ اے فرزند! جو کچھ یہاں ہم پر گزرے گی، آثار اس کے نمودار ہیں۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے کسی طرف کو نکل جاؤ کہ نسل تو قائم رہے۔ بعد اس کے

پدمنی کو سامنے بلایا اور دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ ہر چند کہ وہ عورت تھی مگر بڑی رمز شناس تھی۔ اس نے اسی وقت صندل کی لکڑیاں منگا کر سات چتائیں چنوائیں۔ تمام خاندان کی عورتیں اور بڑے بڑے ٹھاکروں اور سرداروں کی بیبیاں، جو خاوند اور خاندان کے نام کے آگے جان کو کچھ مال نہ سمجھتی تھیں، سب آئیں۔ سر سے پاؤں تک چادریں اوڑھے، گھونگھٹ نکلے، پھولوں کی ایک ایک مالا گلے میں، رام رام کے سمرن کرتی چتاؤں کے گرد کھڑی ہوئیں اور خلقت کا ہجوم ہوگیا۔ جس وقت چتاؤں کو آگ دی اور شعلے بلند ہوئے دلوں سے دھوئیں اور خلائق سے ایک غل اٹھا۔ ہر ستونتی لاج کی ساری ایک ایک سے آگے بڑھتی تھی، اپنی آبرو اور مردوں کی فتح کی دعا کرتی تھی اور پروانے کی طرح اس بھڑکتی آگ پر گر کر آن کی آن میں جل مرتی تھی۔

جب اس ہمتِ مردانہ سے کہ جس پر ہزار ہزار جوان مردوں کو صدقے کر ڈالیے، عورتوں نے یہ ساکھا کیا تو سب کا دل زندگی سے بیزار ہوگیا۔ راجہ رہے سہے رفیقوں کو لے کر اول قلعے کے میدان میں کھڑا ہوا۔ دل غم سے پانی پانی تھا اور نگاہوں سے خون ٹپکتا تھا۔ مگر نہ آنکھ سے آنسو نکلتا تھا نہ منہ سے بات نکلتی تھی۔ بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے رخصت ہوا۔ سب سے آگے راجہ اور پیچھے تمام جاں نثار جن میں سپاہی اور سردار سب برابر ہو رہے تھے، قلعے سے باگیں اٹھائے نکلے اور ان گنتی کی جانوں کی گٹھڑی کر کے لشکرِ شاہی کے دریا میں دے مارا ۳۰۔''

مسٹر اے۔ رے مونڈ اپنی تصنیف ''پوئٹری ایز اے ریپرے زنٹیٹو آرٹ'' (Poetry as a Representative Art) میں لکھتے ہیں:

"اگر وہ سین جس کا نقشہ پیش کرنا مقصود ہو، فی نفسہ عمیق ترین اور 'پرشکوہ احساسات و خیالات کے لیے موزوں ہو، تو پھر براہِ راست اظہار ہی مناسب ہوتا ہے۔ یعنی اگر خیالات نہایت ارفع و اعلیٰ اور رقّت انگیز ہوں تو صرف ایک ہی چیز درکار ہے؛ یہ کہ قاری آن

کو ہوبہو محسوس کرے - کیونکہ اس صورت میں بالواسطہ اظہار
اثر کو بڑھانے کی بجائے اس میں سدّ راہ ہوتا ہے [۳۱]-"

آزاد کی عبارتِ بالا اس کی بہت عمدہ مثال ہے - اس میں جو زبان برتی گئی ہے وہ عام بول چال کے سوا کچھ نہیں - پھر بھی ناممکن ہے کہ جو شخص نثر کے زیر و بم کا شعور رکھتا ہو ، اس کو پڑھ کر یہ نہ پکار اٹھے کہ یہ عبارت ایک شاہکار ہے - یہاں الفاظ نہ بیش ہیں نہ کم ، ہر لفظ برمحل اور برجستہ ، لب و لہجہ دھیما دھیما - لیکن اس کے پیچھے ایک زبردست قوت کا احساس ہوتا ہے - ایسی بے تحاشا قوت نہیں جو آپے سے باہر ہو جائے ، جیسا کہ جوش و ہیجان کے لمحات میں اکثر ہوا کرتا ہے ، بلکہ ایسی توانائی جو نظم و ضبط سے پیدا ہوتی ہے - ایسے مواقع پر آزاد بات کی روح کھینچ لاتے ہیں اور اسے چند الفاظ میں ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں -

(۶)

آزاد کے اسلوب پر بحث کرتے وقت محاکات اور تشبیہات و استعارات کا ذکر لازماً نمایاں رہتا ہے اور یہ بجا بھی ہے - لیکن انھیں روزمرہ پر جو قدرت حاصل ہے اگر ہم اس کو پوری طرح محسوس نہ کریں تو بلاشبہ ان کی قادر الکلامی کے ساحرانہ اثر سے نا آشنا رہیں گے - آزاد کا درجہ اردو نثر میں بہت بلند ہے اور محض ان کے تخیّل کی وجہ سے نہیں بلکہ اس غیرمعمولی قدرت کے باعث ہے جو انھیں اردو روزمرہ پر حاصل ہے - حسنِ بیان ، سادگی اور قادرالکلامی کے لیے ذیل کی عبارت ملاحظہ ہو :

"خصوصیاتِ ملک کے ذکر میں اگر وہاں کے حماموں کا ذکر نہ کیا جائے تو کچھ کہا نہیں - بڑے بڑے کمرہ درکمرہ اور حجرہ در حجرہ لداؤ کی عمارتیں ، چونہ گچ کی دیواریں - زمین بھی اسی سے پختہ یا سلوں کا فرش ، نامی بادشاہوں کے دربار اور ملاقاتیوں کے جلسے ، ان کے جنگی معرکے سب عالم تصویر میں عیاں ہوتے ہیں - 'بوستان' میں شیطان کی تصویر اور شیطان کی گفتگو کی حکایت پڑھ کر میں حیران

تھا - جب وہاں جا بجا ایسی تصویریں دیکھیں ، اس حکایت کا مزا آ گیا - حمام میں اکثر دوست آشنا مل کر جاتے ہیں - پہلے کمرے میں داخل ہوتے ہیں - سماوارچی چائے تیار لیے بیٹھا ہوتا ہے - وہاں بیٹھ کر ایک حقہ پیا ، ایک ایک پیالی چائے کی پی - مزاج میں گرمی آئی - دوسرا کمرہ جامہ کن کہلاتا ہے ، وہاں جا کر کپڑے اتارے - ایک حقہ اور پیا اور طبیعت گرمائی - پھر حمام کے کمرے میں داخل ہوئے - طبیعت میں عجب فرحت اور مستی پیدا ہوتی ہے کہ بغیر شعرخوانی اور ترنم کے نہیں رہا جاتا - تماشا یہ ہے کہ ان کمروں میں معمولی آواز سے بھی باتیں کرو تو ایسی گونجتی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی - تب معلوم ہوتا ہے کہ "سکندر نامہ" میں ع : "سرودے بگرمابہ در گفتہ گیر" کا یہ مطلب ہے - ایک ایک آدمی کو کئی کئی حامی لپٹ جاتے ہیں - کوئی پانی ڈالتا ہے ، کوئی کیسہ کرکے ملتا ہے ، کوئی اشتہال کرتا ہے ، کبھی بٹھا کر اور کبھی لٹا کر ، کبھی دائیں کروٹ اور کبھی بائیں کروٹ - اس اس طرح کل کل دباتے ہیں کہ عمر بھر کی کلفتیں اتر جاتی ہیں - نہانے کے بھی کئی کئی کمرے ہوتے ہیں - سب میں ٹھنڈے اور گرم پانی کے حوض بھرے ہوئے - ہر کمرے میں پانچ پانچ چھ چھ آدمی بیٹھے نہا رہے ہیں اور سب کے سر منڈے ، گول گول ، یکساں ہانڈیاں عجب بہار دیتی ہیں - پھر بھر سے کم نہانے کا لطف نہیں - نکلتے ہیں تو پھر اسی طرح کمرہ بہ کمرہ ٹھہرتے ہوئے اور دم لیتے ہوئے نکلتے ہیں - دفعۃً نکلیں تو خدا جانے لقوہ ، فالج اور ذات الجنب کیا کیا بیماری ہو جاوے - وہیں کسی دکان میں چلے گئے - روٹی ، کلے پائے ، کباب ، شب دیگ لے کر کھائی اور لمبی لمبی ڈاڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے گھر چلے آئے [۳۲]۔"

(۷)

اکثر کہا جاتا ہے کہ آزاد کا اس وجہ سے کوئی مقلّد نہیں پیدا ہوا کہ ان کی طرز اڑانا محال ہے - یہ بات صرف آزاد ہی پر صادق نہیں آتی بلکہ اس کا اطلاق ہر

صاحبِ طرز پر ہوتا ہے ۔ کسی ادیب کے طرزِ تحریر کی ظاہری خصوصیات کا چربہ آتار لینا کچھ مشکل نہیں ، لیکن اس کے باطنی جوہر تک رسائی دشوار ہے ۔ اسلوب کو بعض اوقات کسی ادیب کی لفظیات اور نحوی ترتیب کے محدود مضمون میں بھی استعمال کیا جاتا ہے ، حالانکہ اسلوب میں حقیقی کارپرداز وہ ملکہ ہے جو خام مواد کو بیان کے مخصوص سانچوں میں ڈھالتا ہے ۔ اس لحاظ سے آزاد کی خوبیِ تحریر کا راز ان کی غیرمعمولی صلاحیتوں اور تخیّل کی شادابی و بوقلمونی میں مضمر ہے ۔ ان کی انشا پردازی ایک ایسے بلیغ انسان کی انشا پردازی ہے جو نہایت اعلیٰ تخیّل کا مالک ہے ۔ اسی لیے جدید اردو نثر نے سرسید اور ان کے رفقائے کار کی پیروی کی اور ایسے طرزِ تحریر کو رائج کیا جو ہماری روزمرہ کی ضروریات کے لیے موزوں ثابت ہو ۔

دورِ حاضر کے حوالے سے دیکھا جائے تو آزاد کا اسلوب اب بھی کچھ کچھ پارینہ لگنے لگا ہے ۔ ان کی تحریر صحیح معنوں میں کسی جدید ادیب کی تحریر نہیں معلوم ہوتی ۔ ان کا ذہن فارسی میں رچا ہوا ہے ۔ اس لیے وہ کبھی بھی پوری طرح مسجع اور مقفیٰ نثر پر غالب نہ آ سکے ۔ "آبِ حیات" کے پہلے ہی جملے سے ظاہر ہے کہ ان کے طرزِ تحریر میں فارسی صرف و نحو کو کس قدر دخل ہے ۔ منجملہ دیگر امور کے فارسی کے انداز میں ''کہ'' کا استعمال بہت نمایاں ہے :

''چنانچہ اس لحاظ سے پانچ جلسے سامنے آئے کہ مسلسل اور متواتر قائم ہوئے ۔ لیکن چونکہ سلطنت اور معتبر تصانیف پر مذہب کا چوکیدار بیٹھا تھا اس لیے نقصان کا بہت خطرہ نہ تھا کہ دفعۃً ۵۴۳ برس قبل عیسوی میں بدھ مذہب کے بانی شاک منی پیدا ہوئے ۔[۳۴]''

''یہ وہی سپہ سالار ہے جو ایک ہاتھ پر نشانِ شاہی لیے تھا کہ خوش نصیبی اس کی جس پہلو میں چاہے سایہ کرکے قائم ہو جائے ۔ دوسرے ہاتھ میں تدبیرِ وزارت کا ذخیرہ تھا کہ جس کی طرف چاہے نظامِ سلطنت کا رخ پھیر دے ۔[۳۵]''

''... بادشاہ ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھ رہے تھے کہ اور تماشہ ہوگیا ۔ دل چاچر ہاتھی سرشوری اور بد مزاجی میں مشہور تھا کہ

یکایک دو پیادوں پر دوڑ پڑا ، وہ بھاگے ۔ دل چاچر ان کے پیچھے بھاگا جاتا تھا کہ بیربر آگے آ گئے ۳۶۔"

آزاد کی نحو پر بھی فارسی کی چھاپ ہے ۔ ذیل کے جملوں سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح آج کل کے کئی ادیب انگریزی میں سوچتے ہیں ، اسی طرح وہ فارسی میں سوچتے تھے :

"تین ہزار غلام اس کے وطن کا ہمراہ آیا تھا ۳۷۔"

"اور راجہ یہاں کا جے پال تھا ۳۸۔"

"دوسرے ترکوں کی فوج جس کے سامنے سے ایک دفعہ فوج ہماری ہٹ آئی اب اس کے مقابلے پر تھمنا بہت مشکل ہوگا ۳۹۔"

"... لشکر کی بہتات سے دل قوی رکھتے تھے ۴۰۔"

"سمندر کے کنارے ایک شہر عظیم الشان ہے اور اس میں ایک اور عبادت خانہ ہنود کا ہے ... ملک ملک کے راجاؤں نے جو جاگیریں دے رکھی ہیں انہیں جمع کردیں تو دو ہزار گاؤں ہوتا ہے ۴۱۔"

" اور ہاتھی پر سے ننگے پاؤں کود کر پنجاب اپنے علاقے میں بھاگ آیا کہ یہ ملک وسیع اور باسامان بھی ہے اور ادھر سے ایران کا رستہ بھی کھلا ہے ۴۲۔"

(۸)

الغرض آزاد کے نثری اسلوب کی نمایاں خصوصیات بھرپور توانائی اور تخئیلی وضع ہیں ۔ وہ جیسے بھی چاہیں سادہ ، 'پرکار ، 'پرشکوہ ، 'پرجوش یا محاکاتی عبارت لکھ سکتے ہیں اور بسا اوقات خوبی و رعنائی کے غیرمعمولی مقامات تک پہنچ جاتے ہیں ۔ اس کے برعکس آن کا اسلوب بعض شدید نقائص سے بھی خالی نہیں ۔ بعض باتیں تو ان کا تکیہ کلام بن چکی ہیں :

"آدھر دانائے فرنگ جو کلکتے میں فورٹ ولیم کے قلعے پر دور بین لگائے بیٹھا تھا اس نے دیکھا ۔ نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے مگر تربیت چاہتا ہے ۴۳۔"

''لیکن اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ میر انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۲۱۲ھ/۱۸۰۷ع میں قواعدِ اردو لکھ کر ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول لگائے ۴۴۔''

''اکبر میں بہت سی باتیں تھیں کہ دوربینی کی عینک اور دور اندیشی کی آنکھیں اسے دکھاتی تھیں ۴۵۔''

''جو سخن شناس دور دراز کے ملکوں میں قرائن کی دوربین لگائے بیٹھے ہیں۔۴۶ وہ اپنے گھر کے گوشے میں علم کی دوربین لگائے بیٹھا تھا اور ان شطرنج بازوں کی چالوں کو دور سے دیکھ رہا تھا ۴۷۔''

''مگر غزلوں کے مقطع میں فخریہ چشمکیں ہونے لگیں اور ساتھ ہی نکتہ چینی کی عینکیں لگ گئیں ۴۸۔''

''اگرچہ علوم نے اس کی آنکھوں پر عینک نہ لگائی تھی ۴۹۔''

تصویر حقیقی ہو یا خیالی ، شاعرانہ نوک جھوک ، دلچسپ حکایات اور لطائف و ظرائف ، ان سب کو پیش کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ۔ اس کے مقابلے میں دوسرے امور پر انھیں وہ قدرت نہیں ۔ نقشہ کھینچنے یا واقعہ بیان کرنے میں آزاد خاص مہارت رکھتے ہیں ۔ یہاں ان کا قلم جادو کی چھڑی کا سا کام کرتا ہے ۔ یہ انشا کی اس آخری جھلک سے ظاہر ہے جب مفلسی اور موت کے رینگتے ہوئے سائے اس پر منڈلا رہے تھے ۔ یہ جادو اپنا اثر زائل کر دیتا ہے جب ذہنی کیفیات کی عکاسی کرتے ہوئے آزاد تشبیہوں پر تشبیہیں اور استعاروں پر استعارے نچھاور کرتے چلے جاتے ہیں ۔ ایسے موقعوں پر کون کہہ سکتا ہے کہ قاری اس سے بیزار نہ ہوگا ؟

جو بات پروفیسر بلیک نے والٹیر کے طرزِ تحریر کے بارے میں کہی ہے وہ آزاد کے اس قدر حسبِ حال ہے کہ ہم اس کا اعادہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے :

''فکر و خیال کے بعض میدان ایسے ہیں جن میں رنگینیِ بیان نفسِ مضمون کے لیے واقعی خطرناک بن جاتی ہے ۔ تخیّل کی شعلہ کاری اور ذہن کی براق ممکن ہے عظیم ادب پیدا کر دیں ، لیکن سائنس جس قسم کی سیدھی سادی ، جچی تلی ، بالعموم خشک توضیح کا تقاضا کرتی ہے ،

اسے ادا کرنے کے لیے شاید یہ درست وسائل ثابت نہ ہوں ۔ بلکہ بالعموم اس مقصد کے لیے یہ موزوں ثابت نہ ہوں بعینہ اسی طرح جیسے تند و تیز منہ زور گردابوں اور امنڈتی موجوں کے باعث سازو سامان سے لدی ہوئی کشتی حرکت سے قاصر ہوتی ہے ، خواہ دیکھنے میں یہ نظارہ کتنا ہی دلاویز کیوں نہ ہو ۔ غرض ادبی شعور ـــ اور والٹیر کا شعور خالصۃً ادبی ہی تو تھا ـــ کی خامیاں اس وقت دکھائی دینے لگتی ہیں جب اس کا سروکار ادق مسائل یا حقائقِ نفس الامری سے ہو ۔ اس وقت یہ اسلوب قدم قدم پر جھٹکے کھا کھا کر آگے بڑھتا ہے ۔ یہ موازنوں اور تلازموں ، اور استعاروں کے جھمیلے میں پڑ جاتا ہے اور بسا اوقات کسی پُر طمطراق فقرے یا بھڑکیلے جملے کی ادھوری صداقت کے سہارے منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے "۔

واقعہ نگاری میں آزاد کی کامیابی کئی باتوں پر منحصر ہے ۔ ان میں سب سے نمایاں ان کا ڈراماتی احساس ہے ۔ وہ کوئی ماجرا بیان کرنے یا حلیہ کھینچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے بلکہ براہ راست اپنے کرداروں کو سٹیج پر لے آتے ہیں تاکہ وہ الفاظ کے ذریعے اپنا اپنا پارٹ ادا کریں ۔ ان کے تاریخی مضامین کا بیشتر حصہ یا تو بالمشافہ گفتگو ہے یا تقریر ، جس میں جابجا واقعات اور مناظر کے مرقعے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مرقعے بڑے ہی شوخ اور واضح ہیں ۔

آزاد کی ایک اور خصوصیت قرونِ وسطیٰ کے بارے میں لامحدود معلومات ہیں ۔ اردو ادب میں اور کہیں بھی اس سے زیادہ تفصیلات کی فراوانی نظر نہیں آتی ۔ لشکر ، دربار ، درباداری کے آداب اور فنونِ جنگ ، قرونِ وسطیٰ کے ہر جزو وکل کے بارے میں ان کی معلومات بے حد وسیع ہیں جو مرقع کشی کے بوقلموں نمونوں کا سرچشمہ ہے ۔ یہ معلومات محض مقصد تک رسائی کا ذریعہ ہی نہیں ، جیسا کہ تمام حقیقت پسندوں کے یہاں ہوا کرتا ہے ، آزاد ان سے اس لیے بھی رغبت رکھتے ہیں کہ یہ فی نفسہ دلاویز ہیں ۔ "قصصِ ہند" میں اس قسم کے بے شمار شہ پارے ہیں ۔ ازانجملہ ایک ملاحظہ ہو :

"پچھلی رات تھی کہ کمر بندی کا حکم پہنچا ۔ صبح ہوتے ہوتے تمام

لشکر کیل کانٹے سے لیس ہوکر میدان میں جم گیا ۔ آگے پیچھے دائیں بائیں ہر ایک سردار اپنی اپنی فوج کو سنبھالے تھا ۔ خود صاحبِ لشکر زرہ بکتر ، چار آئینہ سجے ، سر پر خود فولادی ، کمر میں شمشیر اصفہانی ، پشت پر سپر ، کندھے پر کمان ، زین پر گرز گاؤ سر دھرا ، کمندِ ابریشمی شکار بند میں آویزاں ، علم کے سائے کے نیچے نیزہ تانے کھڑا تھا اور اسپِ عربی جس پر پوست پلنگ کی پاکھر پڑی تھی رانوں میں سے نکلا جاتا تھا ۔ ادھر حریف کے لشکر میں پہلے ہاتھیوں کی قطار ، بعد اس کے رتھیں اور بہلیاں ، پیادہ اور سوار فوج تھی کہ جس کا شمار سوائے منشئی تقدیر کے کسی کو معلوم نہیں ۔ ہاں سلسلۂ انتظام اس کا خاص ایک شخص کی چٹکی میں تھا کہ جدھر چاہے آدھر جھونک دے ۔ بیچوں بیچ میں ہند کا سینا پتی ، سر سے پاؤں تک اوبچی بنا ہوا ، زرد دگلے پر چلتا اور اس پر زرہ بکتر ، چار آئینہ سجے ، راجپوتی ایک پیچہ بھوں پر رکھے ، کمر میں ایک طرف سروہی کی تلوار ، دوسری طرف کھانڈا اور کٹار ، پشت پر گینڈے کی ڈھال ، سورج مکھی کے سائے میں ہاتھی پر بیٹھا ، دونوں لشکروں کو غور سے دیکھ رہا تھا ۔ آخر نہ رہ سکا اور تڑپ کر ہاتھی سے کود گھوڑے پر سوار ہوا ۔ بھائی کو ہاتھی پر بٹھا دیا ۔ آپ دکھنی گھوڑی اڑاتا ، سپہ گری کا بانکپن دکھاتا ، بھالے کے ہاتھ نکالتا ہوا دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں تک ایک چکر لگایا اور سامنے لشکر کے کھڑے ہوکر اہلِ لشکر کے دلوں کو اس طرح بڑھایا "۔"

آزاد کی تیسری خصوصیت یونانی مورخ پلوٹارک کی طرح لطائف و حکایات برجستہ استعمال ہے ۔ یہ لطیفے اور حکایتیں ''آبِ حیات'' کی روحِ رواں ہیں ۔ آزاد انھیں کس ذوق و شوق سے چٹخارے لے لے کر بیان کرتے ہیں ، یہ ایک ہی مثال سے واضح ہو جاتا ہے جو نیچے دی ہوئی ہے ۔ یہاں اردو میں بات کرتے کرتے دفعتہً بمقتضائے حال فارسی کی طرف رجوع سے واقفیت میں کس قدر اضافہ ہوا ہے ! یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آزاد کوئی کہانی بیان نہیں کر رہے بلکہ حقیقی روداد پیش کرنے والے رپورٹر ہیں اور انھوں نے وہ بات سن و عن بیان کر دی ہے جو اپنے

کانوں سے سنی ہے :

''ایک ولایتی نے کہ زمرۂ اہلِ سیف میں معزز ملازم تھا ، عجب تماشا کیا - یعنی سودا نے اس کی ہجو کہی اور ایک محفل میں اس کے سامنے ہی پڑھنا شروع کردی - ولایتی بیٹھا سنا کیا - جب ہجو ختم ہوئی ، اٹھ کر سامنے آ بیٹھا اور ان کی کمر پکڑ کر مسلسل و متواتر گالیوں کا جھاڑ باندھ دیا - انھیں بھی ایسا اتفاق آج تک نہیں ہوا تھا - حیران ہو کر کہا کہ خیر باشد ، خیر باشد ! جناب آغا اقسام ایں مقالات شایانِ شانِ شہانیست - ولایتی نے پیش قبض کمر سے کھینچ کر ان کے پیٹ پر رکھ دی اور کہا : نظم گفتی ، حالا این نثر را گوش کن - ہر چہ تو گفتی نظم بود - نظم از ما نمی‌آید - ما بہ نثر ادا کردیم [۵۲]۔''

چوتھی خوبی ، جو جملہ خوبیوں کی جان ہے ، ان کی نفسیاتی حقیقت آرائی ہے - انسانی طبیعت سے گہری واقفیت آزاد کو بیان میں واقعیت پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے - جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ، اُن کی تاریخ نگاری ماضی کی ازسرِ نو بازیافت ہے - ان کا طریقہ ناول نویسوں یا ڈرامہ نگاروں کے طریقے سے ملتا جلتا ہے - کوئی شخص کسی وقت کیا کہے گا ، کرے گا یا سوچے گا ؟ ان سوالات کا برجستہ جواب دینا —— بہ الفاظِ دیگر افرادِ انسانی کو خواہ وہ حقیقی ہوں یا خیالی فطرتِ انسانی کے مطابق پیش کرنا —— افسانہ نویسی کی صلاحیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے اور یہی تخیّل ہی کا دوسرا نام ہے - یہ آزاد کا ملکۂ خاص ہے کہ وہ خود کو تاریخی کرداروں کے ساتھ یک جان کردیتے ہیں اور انھی کے خیالات و احساسات کی ترجمانی کرنے لگتے ہیں - تاریخی واقعات کو ہوبہو پیش کرنا ، جس پر بے ذوق لوگ اتنا ناز کرتے ہیں ، آزاد کا مقصود نہیں - وہ واقعات سے زیادہ انسانی سرشت کی نبّاضی سے سروکار رکھتے ہیں - بہ الفاظ دیگر آزاد ڈائری نویس نہیں ، فن‌کار ہیں - ایک مثال ملاحظہ ہو :

''ہرچند ماںتا کی آنچ گود سے اُتارنے نہ دیتی تھی ، مگر جب کچھ بن نہ آئی تو ماں نے بھی کلیجے کے ٹکڑے کو زمین پر رکھ دیا اور روتی چلی گئی - ایک رات کی جان جنگل میں پڑی روتی تھی -

تھک جاتی تو ہاتھ چوسنے لگتی تھی ، مگر قسمت سرہانے کھڑی ہنستی تھی کہ جلدی نہ کر ۔ جس محل میں تجھے ملکہ بنا کر بٹھانا ہے وہ ابھی تعمیر نہیں ہوا ۔ پیچھے پیچھے قافلہ بھی آتا تھا ۔ اس صبح کے تارے کو زمین پر پڑا دیکھ کر سب حیران ہوگئے ۵۳۔''

اس عبارت کا غالب حصہ تخیّل کے سوا اور کچھ نہیں ۔ وہاں پر کون تھا جو اس ننھی سی جان کو کبھی انگوٹھا چوستے اور کبھی روتے دیکھتا ؟ لیکن ہم بھی اس منظر کا تصوّر بعینہ اسی طرح کریں گے ۔ یا پھر یہ عبارت ملاحظہ ہو :

''اگرچہ علاؤالدین بادشاہ کے محلوں میں کولا دیوی بادشاہ بیگم تھیں ۔ دنیا کی نعمتیں موجود اور عیش و عشرت کا گلشن ہمیشہ بہار پر تھا ، مگر کولا دیوی کے دل کا کنول کملایا ہی رہتا تھا ۔ بادشاہ پوچھتا تھا تو کچھ بتاتی نہ تھی ۔ اتفاقاً چند روز کے بعد بادشاہ نے پھر دکن پر فوج کشی کا حکم دیا اور کولا دیوی نے بھی سنا ۔ جب بادشاہ محل میں آئے تو عرض کی ، جہاں پناہ ! حضور کے اقبال سے آج میں ملک ہندوستان کی ملکہ ہوں اور جدھر دیکھتی ہوں مرادوں کا چمن لہلہا رہا ہے ۔ مگر ایک کانٹا غم کا ہے کہ دل میں کھٹکتا ہے ۔ چونکہ اس کے نکالنے میں ملکوں کی تباہی اور ہزاروں بندگانِ خدا کا خون ہوتا نظر آتا تھا ، اس لیے کہنے کو دل نہ چاہتا تھا ۔ اب یہ صورت خدا ساز پیش آئی ہے ، اس لیے عرض کرتی ہوں کہ جب میں راجہ کرن کے محلوں میں راج کرتی تھی تو خدا نے دو بیٹیاں عنایت کی تھیں کہ ہر ایک حسن و جمال کے سانچے میں پتلی کی طرح ڈھلی تھی ۔ ایک تو خورد سال ہی مر گئی تھی ۔ دوسری جس کا دیول دیوی نام ہے ، زندہ و سلامت موجود ہے ۔ ماںتا کی آنچ سے دل سینے میں مچھلی کی طرح تڑپتا ہے ۔ اگر وہ کسی طرح صحیح و سلامت آئے تو آنکھوں اور کلیجے کو ٹھنڈک آ جائے ۵۴۔''

کیا کولا دیوی نے یہ ساری باتیں کہی ہوں گی ؟ کون کہہ سکتا ہے ۔ زندگی واقعی بڑی حسین ہو جائے اگر انسان اس خوش اسلوبی سے گفتگو کر سکے ۔ خاص دل چسپی کی بات یہ ہے کہ ہم یہاں اپنی آنکھوں سے ایک ارمانوں بھری

ماں دیکھتے ہیں جو زبان سے کچھ کہنا نہیں چاہتی - مگر کہے بغیر رہ بھی نہیں سکتی اور بڑی حسرت سے جھجکتے جھجکتے اپنے دل کی بات کو ، جو مدتوں اس کے نہاں خانۂ دل میں دبی ہوئی تھی ، سامنے لاتی ہے - پھر وہ ماں ہی نہیں بیوی بھی ہے - ایک طور طریقے اور ادب آداب کا لحاظ رکھنے والی شریف و رحم دل عورت - غرض ساری تقریر ہوبہو اس کے کردار کے مطابق ہے - یا پھر یہ عبارت دیکھیے :

''اتفاقاً فوج کے چند جوان بہادر جمع ہوکر سپہ سالار کے پاس آئے اور کہا کہ تقدیر سے یہاں آنا ہوگیا ہے - نہیں تو ہم کجا اور یہ جنگل پہاڑ کجا - دنیا دیکھنے کے لیے ہے - آخر مر جانا ہے - پہلو میں کوہ الورہ کے قدیمی غار ہیں اور ان میں کسی زمانے کی عمارتیں ہیں جن کی دستکاریاں دیکھ کر صنعتِ الٰہی یاد آتی ہے - اگر اجازت ہو تو جا کر دیکھ آئیں - سپہ سالار نے کہا جاؤ ، مگر دائیں بائیں سے ذرا ہوشیار جانا کہ دشمن کا گھر ہے اور ہر قدم پر خطرے - غرض چند سردار ، کئی سو آدمی لشکر سے گئے - اب قدرتِ الٰہی کا تماشہ دیکھو کہ یہ سب ہنستے بولتے ، آگے پیچھے چلے جاتے تھے جو یکایک سامنے کچھ سوار نظر آئے - یہ گھبرائے کہ شاید دشمن دیو گڑھ سے مدد لے کر پھر پلٹا - چنانچہ اپنی جمعیّت کو ترتیب دیا اور سب سنبھل کر دفعۃً جا پڑے - ان بیچاروں کی حقیقت کیا تھی ، ایک حملے میں تتر بتر ہوگئے - ادھر سے انھوں نے نوچ کھسوٹ ، مار دھاڑ شروع کردی - ایک سپاہی کو پینس نظر آئی کہ کہار رکھ کر بھاگ گئے تھے اور چند مرہٹنیں ہتھیار بند آس پاس کھڑی ہیں - یہ للکار کر پہنچا اور تلوار کھینچ کر کہا کہ نکل آ اور نکال جو کچھ پاس ہے ''-

دیکھیے جوانوں کی درخواست ، سپہ سالار کی محتاط ہدایات ، 'چھٹی مناتے ہوئے بے فکر ہشاش بشاش ، ہنستے بولتے سپاہی اور آخر میں سپاہی کی واقعیت سے بھرپور للکار ، یہ سب باتیں کس قدر فطری اور قرینِ قیاس ہیں - آزاد نے تاریخی واقعات کو تخیّل کی آنکھ سے دیکھ کر حقائق کی بازآفرینی سے کام لیا ہے -

اب آخر میں کولا دیوی اور اس کی مدت سے بچھڑی ہوئی بیٹی ، دیول دیوی کا ملاپ دیکھیے - کتنے تھوڑے بول اور عبارت میں کتنا زور ہے - آزاد خوب جانتے

ہیں کہ ایسے نازک موقعوں پر ، جب جذبات امڈ امڈ کر دل پر چھا جاتے ہیں ، منہ سے کچھ کہنا جذبات کی بے حرمتی ہے - اس وقت چند اشارات وہ کام کرتے ہیں جو دفتروں کے دفتر بھی نہیں کر سکتے :

"ماں بے اختیار ہو کر دوڑی ، بیٹی کو اتروایا اور دیر تک گلے لگا کر رویا کی - بعد اس کے اندر لا کر مسند پر بٹھایا ، مگر منہ سے بات نہ نکلتی تھی - گویا دو چینی کی مورتیں تھیں کہ آمنے سامنے دھری تھیں - ہاں آنسوؤں کے تار جاری تھے اور دلوں پر ہزار خیال گزرے کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا -۵۶"

* * *

حوالے اور حواشی

١- آبِ حیات ، ص ١ -
٢- ایضاً ، ص ٢ -
٣- ایضاً ، ص ٤ - ٥ -
٤- دربارِ اکبری ، ص ٢٧ -
٥- آبِ حیات ، ص ٨٦ -
٦- نیرنگِ خیال ، جلد اول ، پیش لفظ -
٧- آبِ حیات ، ص ٩ -
٨- ایضاً ، ص ١١٥ -
٩- ایضاً ص ٢٣٢ -
١٠- ایضاً ، ص ٣٣٩ -
١١- ایضاً ، ص ٩١ -
١٢- ایضاً ، ص ٣٧٩ -
١٣- دربارِ اکبری (ممتاز) ، ص ٢٤٢ -
١٤- ایضاً ، ص ٥٦٧ -
١٥- قصصِ ہند ، ص ٨ -
١٦- ایضاً ، ص ٧ -
١٧- ایضاً ، ص ١٠ -
١٨- ایضاً ، ص ١٦ -
١٩- ایضاً ، ص ٤٢ - ٤٣ -
٢٠- دربارِ اکبری (ممتاز) ، ص ٢٠٦ -
٢١- آبِ حیات ، ص ٨٨ -
٢٢- ایضاً ، ص ٩٢ -

۲۳- قصص ہند، ص ۱۳ - ۱۴ -
۲۴- آبِ حیات، ص ۳۸۹ -
۲۵- ایضاً، ص ۱۲۵ -
۲۶- ایضاً، ص ۱۰۱ -
۲۷- ایضاً، ص ۳۴۴ - ۳۴۵ -
۲۸- دربارِ اکبری (م)، ص ۲۰۵ -
۲۹- سخن دانِ فارس، ص ۱۸۸ - ۱۸۹ -
۳۰- قصص ہند، ص ۳۸ - ۳۹ -
۳۱- مطبوعہ لنڈن، ص ۲۶۶ -
۳۲- سخن دانِ فارس، ص ۱۶۷ - ۱۶۸ -
۳۳- آبِ حیات -
۳۴- ایضاً، ص ۱۰ -
۳۵- دربارِ اکبری (م)، ص ۱۵۷ -
۳۶- ایضاً، ص ۲۹۷ - ۲۹۸ -
۳۷- قصص ہند، ص ۲ -
۳۸- ایضاً، ص ۳ -
۳۹- ایضاً، ص ۵ -
۴۰- ایضاً، ص ۷ -
۴۱- ایضاً، ص ۹ - ۱۰ -
۴۲- ایضاً، ص ۱۲۹ -
۴۳- آبِ حیاب، ص ۲۵ - ۲۶ -
۴۴- ایضاً، ص ۲۶ -
۴۵- دربارِ اکبری (م)، ص ۳ -
۴۶- سخن دانِ فارس، ص ۱۶۸ -
۴۷- دربارِ اکبری، ص ۴۸ -
۴۸- آبِ حیات، ص ۲۶۲ -
۴۹- دربارِ اکبری، ص ۱۰۶ -
۵۰- بلیک، ص ۱۳۶ - ۱۳۷ -

۵۱- قصص ہند ، ص ۲۲ - ۲۳ -
۵۲- آبِ حیات ، ص ۱۷۱-
۵۳- قصصِ ہند ، ص ۱۰۶ -
۵۴- ایضاً ، ص ۴۰ - ۴۱ -
۵۵- ایضاً ، ص ۴۳ -
۵۶- ایضاً ، ۴۴ - ۴۵ -

گیارھواں باب

حرفِ آخر

آزاد نے اُس ذہنی بیداری کو فروغ دینے میں ، جو پنجاب میں انگریزی عمل داری قائم ہونے پر رونما ہوئی ، فیصلہ کن کردار ادا کیا ۔ لیکن ادب کو عمومی طور پر متأثر کرنے کے سوا اُنھوں نے اپنے عہد پر براہِ راست کوئی اثر نہیں ڈالا ، کوئی دبستان قائم نہیں کیا اور نہ کوئی مقلّد ہی چھوڑے ہیں ۔ اس کے برعکس سرسیّد کے رفقا نے اپنے عہد پر مستقل اثر چھوڑا اور عرصہ دراز تک ادب کا فعّال عنصر رہے ۔ اس لحاظ سے آزاد اور ان میں نمایاں فرق ہے ۔ اس سلسلے میں ایک بات بہت واضح ہے ۔ ان ادبا کے اثر کا ان کے ادبی مقام یا حیثیت سے کوئی واسطہ نہیں ۔ سرسیّد اور ان کے رفقا نے اپنے عہد پر اتنا وسیع اثر اس لیے ڈالا کہ وہ اس کے نمائندے تھے اور ان کی ادب سے دلچسپی بڑی حد تک مذہبی اصلاح میں دلچسپی کے تابع تھی ۔ یہ وہ میدان تھا جس نے اس عہد کے بہترین افراد —— راجہ رام موہن رائے ، سوامی واویکانند ، دیانند ، مولوی نذیر احمد وغیرہم —— کو اپنی طرف کھینچا ۔ آزاد نے بھی مذہبی و معاشرتی اجتہاد کی ضرورت محسوس کی لیکن ان افراد کے برعکس اس کا تقاضا اتنی شدّت سے محسوس نہیں کیا ۔ ان گرم جوش مصلحین کے مقابلے میں ان کا اصلاحی ذوق و شوق محض سرسری اور وقتی تھا ۔ وہ نقّاد کی نسبت خلّاق زیادہ تھے ۔ ان کے لیے ادب ہی مقصود بالذات تھا ۔ اس کے برعکس ان کے معاصر ، ادب کو اصلاح کا آلۂ کار خیال کرتے تھے اور انھوں نے شعر و ادب کو اسی حیثیت سے استعمال کیا ۔ بہ الفاظِ دیگر وہ سب مُصلح تھے جو معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنا چاہتے تھے ۔ حالی کا رہ رہ کر اخلاق کے علم برداروں کو انسان کے بہترین محسن قرار دینا اور شعرا کو اربابِ اخلاق کا ممدو معاون گردانتا اُس زمانے کے شدید مذہبی رجحان

کا آئینہ دار ہے جس کا سایہ آزاد پر بہت ہلکا تھا۔

آئیے ہم آزاد کا موازنہ تحریکِ علی گڑھ کے مصنّفین سے کریں اور دیکھیں کہ بعض صریح مشابہتوں کے باوجود وہ ان سے کس طرح مختلف ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر وہ کون سے فضائل ہیں جو آزاد کی یاد تازہ رکھتے ہیں۔

اول وہ کافی طویل عرصہ جو دو دہائیوں سے اوپر ہے، اپنے عہد کی علمی سرگرمیوں اور شعر و ادب کی نشو و نما میں برابر حصہ لیتے رہے۔ دوسرے ان کا ذخیرۂ علم بہت وسیع تھا اور معلومات ٹھوس بنیادوں پر مبنی تھیں۔ تیسرے شعر و ادب کے نقّاد کی حیثیت سے وہ نہایت بالغ نظر اور نکتہ رس تھے، نیز ان کا ذوق نہایت پختہ تھا۔ ان سب سے بڑھ کر عہدِ ماضی کی وہ دل آویز اور برجستہ مرقّع کشی ہے جس میں ان کو یدِ طولیٰ حاصل ہے اور جس میں تاریخ، افسانہ اور حقیقت رومان بن گئی ہے۔

سرسیّد اور شبلی نے جو کچھ لکھا اپنے عہد کے فوری ناگزیر تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے لکھا، اس لیے ان کا نہایت زور و شور سے خیرمقدم کیا گیا۔ لیکن آج ہماری ضروریات ان کے معاصرین کی ضروریات سے بہت مختلف ہیں، اس لیے ان کا چرچا جلد ہی اپنے عہد تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ہم آج ان کی تصنیفات کو صرف ان معلومات کے لیے پڑھتے ہیں جو ان میں پیش کی گئی ہیں۔ اس لیے نہیں پڑھتے کہ دل آویز اور ذوق افروز ہیں۔

آزاد کی تخلیقات زیادہ پائیدار ہیں کیونکہ وہ ہمارے تخیّل اور ذوق کے لیے باعثِ کشش ہیں۔ انھوں نے ماضی کے افسانوں اور واقعات کو اس طرح اجاگر کیا ہے کہ ہم انھیں واقعی اپنی آنکھوں کے سامنے رواں دواں پاتے ہیں۔ اس لیے جو باتیں آزاد کو آج جاذبِ توجہ بناتی ہیں کل بھی ان کو جاذبِ توجہ بنائے رکھیں گی۔

ضمیمے

۱- وسط ایشیا کا سیاسی مشن

۲- نگارستان پارس

۳- نصیحت کا کرن پھول

۴- تذکرۂ سنینِ اسلام ، حصہ اول

۵- سخن دان فارس سے نیرنگ خیال تک

۶- آبِ حیات کے ماخذ

۷- نیرنگ خیال کے ماخذ

۸- سخن دان فارس کے ماخذ

۹- دربار اکبری کی تصنیف

۱۰- تدوین دیوان ذوق

وسط ایشیا کا سیاسی مشن

[ادبی حلقوں میں وسط ایشیا کو بھیجے جانے والے وفد کے بارے میں بہت قیاس آرائیاں کی جاتی رہی ہیں ، لیکن دستاویزی شہادت کی عدم موجودگی میں مشن کا مقصد متعیّن نہ کیا جا سکا - ذیل میں ایک مستند دستاویز کا متن پیش کیا جاتا ہے جو ہمارے پاس موجود ہے - یہ دستاویز وفد کے مقصد کو پوری طرح واضح کرتی ہے - چونکہ یہ بڑی ہی خفیہ دستاویز تھی اس لیے اس میں متعلقہ ممالک کی نشان دہی ان کے ابتدائی حروف سے کی گئی ہے - یعنی 'ر' برائے روس ، 'خ' برائے خوقند اور 'ب' برائے بخارا] :

'ک' میں ان کی اصلی حیثیت کیا ہے ؟ کتنی فوج ان کی اس ملک میں ہے ؟ بہ تفصیل سوار و توپ خانہ - فوج ان کی بیشتر اصلی 'ر' ہے ، یعنی آدمی سپاہ کے سکنائے گرد و نواح سینٹ پیٹس برگ 'ک' سے ہیں یا مسلمان سپاہی جو اضلاع توابع 'ر' حدود متصلہ 'ک' میں بھرتی کیے گئے ؟ افسر اور سپاہی ایک ہی قوم سے ہیں یا افسر عیسائی ہیں اور سپاہی ماتحت مسلمان ؟ 'ر' نے کون کون سے قلعے بنائے ہیں اور ان پر توپیں چڑھائی ہیں ؟ بڑی بڑی پلہ کی یا وہ فقط مضبوط سرائے ہیں جو واسطے سودگران و مسافراں از غارت گراں بنائی گئی ہیں ؟ کیا یہ تعمیرات بہت بنائی ہیں ؟ عموماً کتنے آدمی ہر جگہ میں مامور ہیں ؟ کیا 'ر' نے 'ک' والوں کو بالکل شکست دی ہے یا وہ دونوں اب تک لڑ رہے ہیں ؟ اگر لڑ رہے ہیں تو 'ک' والے اس لائق ہیں کہ خاطر خواہ کامیابی کے ساتھ مقابلہ 'ر' کا کریں ؟ یا ضرور شکست کھائیں گے ؟ لڑائی کا سبب کیا ہوا ہے ؟ آیا یہ بات ہے کہ 'ر' چاہتے ہیں کہ 'ک' کو فتح کر کے متصرّف ہو جائیں یا فقط 'ر' کا یہ مطلب ہے کہ 'ک' والوں کو حملہ ہائے اور دست درازی اپنی سرحد سے روکیں ؟ کیا 'ک' والے پہلے 'ر' کے ملک

میں غارت گری نہیں کرتے تھے اور لوگوں کو پکڑ کر بھی لے جاتے تھے ؟ جیسے ترکمان خراسان کی حدود پر کرتے ہیں - کیا 'ر' نے کسی قدر ملک 'ک' پر تسلّط کر لیا ہے ؟ اور جو کر لیا ہے تو کیا اس کا مالیہ وصول کرتے ہیں ؟ اور اس میں پُلس مقرر کر رکھا ہے اور بندوبست اس کا اپنے طور کر رکھا ہے ؟ 'ر' نے 'ک' میں اپنی طرف سے کوئی گورنر مقرر کر رکھا ہے ؟ اور جو کیا ہے تو اس کا نام کیا ہے ؟ وہ عیسائی ہے یا مسلمان ؟ 'ک' میں بہ سبب لڑائی سلسلۂ تجارت کس طرح ہو رہا ہے ؟ آیا سُست ہے یا بدستور ؟ سودگران کی حفاظت کرتے ہیں یا ان سے بہ حسنِ سلوک پیش آتے ہیں یا برعکس ہوتا ہے ؟ 'ر' رعایائے ملک متصرّفۂ جدیدہ کی تالیفِ قلوب کرتے ہیں یا اُن کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں ؟ یارقند کے لوگوں کی عموماً لڑائی کی بابت کیا رائے ہے جو مابین 'ر' اور 'ک' کے ہے ؟ کیا ان کو اندیشہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ یہ اُمید کرتے ہیں کہ 'ر' ہمارے ملک یارقند پر بھی حملہ کرے گا ؟ 'ک' میں کوئی باترتیب گورنمنٹ لوگوں میں ہی ہے یا ... اور اگر ہے تو اس خان یا سردار کی عمر اور سیرت کیا ہے ؟ وہ لئیق آدمی ، مستعد اور دلیر ، جس پر لوگوں کو بھروسا ہو ، ہے یا نہ ؟ 'ک' میں سپاہی ملکیہ لوگ ہیں یا اپنی فوج ہے ؟ جہاں تک ہو سکے تعداد ہر ملک کی دریافت کرو - کیا بیش تر سپاہ سواراں : ملک کے ہیں ؟ خانِ 'ک' کے پاس کوئی توپ بھی ہے ؟ اگر ہے تو کس پلہ کی اور کس حجم کی ؟ اور عموماً اس کی کتنی مار ہے اور کیونکر کھینچی جاتی ہے ؟ اگر گھوڑوں سے کھینچی جاتی ہے تو فی توپ کے گھوڑے لگائے جاتے ہیں ؟ کوئی میگزین باروت اور گولہ کا بھی رکھتے ہیں ؟ اگر نہیں رکھتے تو گزارہ کیونکر کرتے ہیں ؟ سوار اور پیادہ کے پاس کیا کیا ہتھیار ہیں ؟ کھلے ہوئے میدان میں 'ر' کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور لڑ سکتے ہیں یا فقط ان کو اچانک چھاپہ مار کر حملوں سے حیران کر سکتے ہیں ؟ چونکہ حال میں خبر پہنچی ہے کہ خان 'ک' یا تو مسند سے معزول کیا گیا اور نظربند کیا گیا یا مارا گیا اور ... نے اس کو ہٹا کر ملک حوالۂ شاہِ 'ب' کر دیا - اس کا حال مفصّل حتی الامکان دریافت ہونا چاہیے - اور یہ بھی تحقیق ہونا چاہیے کہ اس کا اثر غالباً نسبت رابطہ 'ر' اور 'ب' ان دونوں ملکوں میں کیا ہوگا ؟ علاوہ اس کے پورب میں یقین ہو رہا ہے کہ 'ر' نے قدیمی قلعہ والی حد ہٹا دی ہے 'ک' کا کچھ ملک لے کر - اس نئی حد کی لین حتی الامکان تحقیق ہونی چاہیے - جو قلعے اس حد پر بنائے گئے ، کہاں کہاں اور کیسے قلعے ہیں ؟ اور کس قدر ملک

اس طرح سے 'ک' سے نکل کر 'ر' میں شامل ہو گیا ؟ اور چونکہ معلوم ہوتا ہے کہ کاشغر، یارقند، ختن، جو اب تک چین کے ماتحت ہے، کے مسلمانوں نے سرکشی ختائیوں سے کی اور اپنے سرداروں کی گورنمنٹ مقرر کردی ہے، اس کے صحیح حالات تحقیقات ہونے چاہئیں، اور جو مابین ان ملکوں کے آپس میں واسطہ ہے اور درمیان 'ر' اور درمیان 'ک' اور 'ب' اور 'ر' کے جو کچھ یا وہ... اور واسطہ ہو، سب تحقیقات کرنا چاہیے - اور ان کی مرضی اور خواہش اور امکان دربارۂ تجارت کیسے ہے ؟ اور نیز یہ کہ چین والے پھر سلطنت اپنی قائم ہونے والی ہے یا نہ - اور کابل اور 'ک' کے درمیان ملک بدخشاں جس میں کان بہت ہیں اور ایک ایلچی حال میں معہ نمونہ جات پاس 'ک' آیا، اس کے ملک کے حالات بھی شامل تحقیقات ہونے چاہئیں - اور اس کی ... آمدنی و پیداوار اور اس کا برتاؤ ریاستہائے متصلہ کے ساتھ تحقیق ہونا چاہیے -

نگارستانِ پارس

"نگارستانِ پارس" کو آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد نے جون ۱۹۲۲ء میں آزاد کی وفات کے بعد شائع کیا۔ آغا محمد طاہر کے بیان کے مطابق آزاد نے "اس تذکرے کو بنا سنوار کر مکمل کر لیا تھا اور چھپوانے کا دل میں تہیہ ہوگا جو چرخِ کینہ جُو نے آپ کی طبیعت اور آپ کے دماغ کو برہم کردیا۔"

اس کے بعد وہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد بزرگوار نے بھی مسوّدے کو تلاش کرنے کی بارہا کوشش کی تھی، لیکن کتابوں اور مسودوں کے انبار میں اُس کا پتا نہ چل سکا۔ جب آغا محمد ابراہیم فوت ہوگئے تو دادا کی غیر مطبوعہ کتابوں کی تدوین و اشاعت کی ذمہ داری آغا محمد طاہر پر عائد ہوئی اور اُنھوں نے مسودات کی تلاش شروع کردی۔ اس سلسلے میں میر ممتاز علی نے یہ کہہ کر مزید تحریک دلائی کہ آزاد نے آبِ حیات کی طرح ایک تذکرہ فارسی شعرا کا بھی لکھا تھا۔ ایک دو دفعہ ہم نے دیکھا بھی۔ مگر اس کے بعد تمھارے والد اور میں نے ہرچند کوشش کی مگر ہاتھ نہیں آیا۔ تم ذرا خیال رکھنا۔ مجھے معلوم تو پہلے بھی تھا مگر اب یقین ہوگیا اور اس کی ٹوہ میں رہا۔

آغا صاحب لکھتے ہیں کہ کتاب کا مسوّدہ مختلف بستوں میں پایا گیا۔ لیکن چونکہ اس کے صفحات پر نمبر پڑے تھے اور ہر صفحے کا پہلا لفظ پچھلے صفحے کے نیچے تحریر ہے، اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ سارے کا سارا مسوّدہ مل گیا ہے۔ اس میں بعض ممتاز شعرا کا تذکرہ نہ ہونے کا سبب یہ نہیں کہ مسوّدے کے کچھ حصّے ضائع ہوگئے، بلکہ غالباً ان شعرا کو دانستہ نظرانداز کردیا گیا ہے۔

آغا طاہر ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے انھی نے ۱۹۲۲ء میں

یہ مسوّدہ دریافت کیا۔ لیکن مولانا شبلی کے ایک خط سے، جو انھوں نے "سخن دانِ فارس" کی اشاعت کے بعد مولانا حبیب الرحمان شروانی کو ۱۲ مئی ۱۹۰۷ع کو لکھا تھا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسوّدہ آغا طاہر کے والد کے پاس تھا۔ خط کی عبارت یہ ہے:

"آزاد نے نظم کا حصہ تذکرۃ الشعرا کے لیے اٹھا رکھا ہے، جو اسی قدر ضخیم ہے اور چھپ رہا ہے۔ ان کے بیٹے کے خط سے معلوم ہوا..."

غالباً آغا محمد طاہر کو یہ بات معلوم نہ تھی اور جب انھیں مسوّدہ ملا تو انھوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسے دریافت کیا۔ میر ممتاز علی کے محوّلہ بالا بیان سے جو دشواری پیدا ہوتی ہے، اتنی سنگین نہیں، کیونکہ ممکن ہے اس کا اشارہ اس زمانے کی طرف ہو جب آغا محمد ابراہیم کو یہ مسوّدہ دستیاب نہیں ہوا تھا۔

آغا طاہر کی رائے میں تمام کتاب پڑھ جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب "آبِ حیات" کے ساتھ ساتھ ہی لکھی گئی۔ اس کے برعکس ہمیں جو داخلی شہادت ہاتھ آئی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ کتاب بہت پہلے تحریر ہوئی تھی۔ اس کی تصدیق دو باتوں سے ہوتی ہے: اول اس کا طرزِ تحریر، دوسرے "آبِ حیات" اور "نگارستانِ پارس" میں بعض ہم طرح موضوعات پر بحث اور چند لطائف و حکایات کی تفصیلات میں نمایاں فرق۔

جہاں تک طرزِ تحریر کا تعلق ہے، یہ بیان کردینا کافی ہے کہ جب یہ کتاب لکھی گئی اس وقت آزاد کی انشا پردازی کا ابتدائی زمانہ تھا اور ان پر فارسی صرف و نحو کا اثر زیادہ تھا۔

قطعی شہادت ان حکایات و لطائف سے فراہم ہوتی ہے جو امیر خسرو کے متعلق دونوں کتابوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ دونوں میں نمایاں فرق کا سبب وہ طویل مدّت ہے جو ان دونوں کے مابین حائل ہے۔

سالِ تصنیف متعیّن کرنے کے لیے کوئی داخلی یا خارجی شہادت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ آزاد نے اسے سیاحتِ

وسط ایشیا سے واپسی پر لکھا، کیونکہ اس میں سفر سے متعلق بعض اشارات ہیں۔ طرزِ تحریر کی نومشقی اور مذکورہ بالا شہادت کی بنا پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب اور "آبِ حیات" کی تصنیف کے درمیان کافی عرصہ حائل ہے۔ اور یہ سیاحتِ وسط ایشیا سے واپسی کے سال (۱۸۶۶ع) اور "سخن دانِ فارس" کی تصنیف کے سنہ (۱۸۷۲ - ۷۴ع) کے درمیان کسی وقت لکھی گئی۔

آزاد کا اس تصنیف کے بارے میں سکوت سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کے خطوط میں غیر مطبوعہ کتابوں کا ذکر جابجا پایا جاتا ہے۔ وہ ''دربارِ اکبری"، "قند پارسی'' "سخن دانِ فارس"، "سفرنامہ" اور دوسری مجوزہ تصنیفات، مثلاً "فارسی لغت" اور "ڈرامہ اکبر" کے متعلق بار بار لکھتے ہیں، لیکن اس کتاب کا کہیں بھی نام نہیں آیا۔ یہ سکوت اس وقت اور بھی ناقابلِ فہم بن جاتا ہے جب وہ میجر بلگرامی کے اس خط کا جواب دیتے ہیں جس میں انھوں نے فارسی زبان و ادب سے متعلق کچھ کتابوں کا پوچھا ہے۔ آزاد نے اپنی غیر مطبوعہ کتاب "سخن دانِ فارس'' کا تو ذکر کیا ہے لیکن اس کتاب کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا۔

جب پرنسپل ٹریننگ کالج لاہور نے انھیں یہ اطلاع دی کہ انھوں نے ''آب حیات" کو نارمل سکولوں کے نصاب میں شامل کر دیا ہے، اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اے کاش! کوئی ایسی کتاب ہوتی جو فارسی ادب کے نصاب کا کام دے سکتی، تو آزاد نے صرف اپنی غیر مطبوعہ کتاب ''سخن دان فارس" ہی کا تذکرہ کافی سمجھا۔

جس خط سے یہ اطلاع ماخوذ ہے وہ مارچ ۱۸۸۴ع میں لکھا گیا۔ ان امور سے یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ آزاد نے یہ کتاب ایران سے واپسی پر لکھی ہوگی، لیکن اوپر جو شہادت پیش کی گئی ہے اس کی بنا پر یہ قیاس بھی بے بنیاد ٹھہرتا ہے؛ کیونکہ آزاد نے اپنے مکتوبات میں ''آبِ حیات'' کے بعد اپنی تمام کتابوں پر مبسوط بحث کی ہے، مگر اس کتاب کا کہیں حوالہ نہیں دیا۔ ہمارے خیال میں ''نگارستانِ پارس'' ایک ابتدائی تصنیف ہے جسے آزاد نے یونہی چھوڑ دیا تھا، کیونکہ وہ اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔

یہ کتاب دو اور وجوہ سے بھی الجھن پیدا کرتی ہے؛ اول یہ کہ اس میں اس ذوق و شوق کی پرچھائیں تک نہیں جو آزاد کی دوسری کتابوں کی نمایاں

خصوصیت ہے - پیشکش شروع سے آخر تک غیر جذباتی اور حقیقت آمیز ہے - آزاد کو ایران اور اس کے ادب سے جو شغف ہے ، اسے دیکھتے ہوئے یہ کچھ کم تعجب انگیز نہیں -

اتنی ہی حیران کن یہ بات بھی ہے کہ اس کتاب میں استعارہ در استعارہ اور تشبیہ در تشبیہ غائب ہے حالانکہ آزاد اس کی طرف شدت سے مائل تھے -

---

ضمیمہ ۳

نصیحت کا کرن پھول

یہ کتاب پنڈت من پھول کی فرمائش پر ۱۸۶۴ع میں لکھی گئی۔ اس کا مسودہ پڑا رہا۔ کوئی چالیس سال بعد اسے آغا محمد ابراہیم نے شائع کیا۔

یہ کتاب آج کل ایک ادبی عجوبہ خیال کی جاتی ہے اور افسانے کے اُس رائج الوقت تصوّر پر کافی روشنی ڈالتی ہے جب افسانہ سبق آموزی کا ذریعہ خیال کیا جاتا تھا۔ "نصیحت کا کرن پھول" کی کہانی (بشرطیکہ اسے کہانی کہا جا سکے) محض ایک بہانہ ہے اس نصیحت کا کہ عورتوں کو تعلیم دی جائے۔ ایرانی سیّاح نے، جو تجارت کے لیے چین جا رہا ہے، اپنی بیوی کو ترغیب دی کہ وہ اس کی عدم موجودگی میں بیٹی کو لکھائے پڑھائے۔ کتاب باپ اور بیٹی کے مابین خط و کتابت پر مشتمل ہے۔ جنگِ آزادی کے بعد آزاد کی سیر و سیاحت اور ان کی دہلی و لاہور سے شناسائی نے ان ابتدائی خطوط کے لیے مواد فراہم کیا جو بڑے ہی واضح اور حقیقت پسندانہ ہیں۔ جن خطوط میں کلکتے اور چین کے سمندری سفر کا حال بیان کیا گیا ہے، ان میں کوئی ذاتی رنگ نہیں، اور واقعات بہت غیرواضح اور کتابی سے لگتے ہیں۔

ان قباحتوں کے باوجود کتاب اس لیے دل چسپ ہے کہ اس سے خود مصنّف کا بہت کچھ حال معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ دیگر امور کے اس میں لاہور کے متعلق ابتدائی تاثرات ملتے ہیں اور اُس تاریک ماحول کے خلاف ردِعمل بھی جب آزاد ایک کم معاش سررشتہ دار کی حیثیت سے تنگی ترشی سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ دہلی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے لڑکی کا باپ لکھتا ہے:

"ایک بات دلی کی اور دیکھی کہ حکمت کے رُو سے بھی مجھ کو

نہایت پسند آئی - یعنی کوچہ و بازار بہت وسیع ، دکانیں بلند اور کشادہ اور مکانات امیروں کے تو سبحان اللہ ، لیکن غربا کے رہنے سہنے کی بھی حویلیاں بہت کشادہ اور صحن اُن کے دل کشا ہیں - نہ شہر لاہور کے سے کوچہ تنگ ، رات دن پرنالوں کی آنکھ سے آبِ نزول جاری - بازاروں میں زکامی کی ناک کی طرح دونوں طرف موریاں پڑی بہتی ہیں - گھروں کو دیکھو تو قبر کے برابر زمین پر تین تین چار چار منزل لاٹھیں سی بناتے چلے جاتے ہیں ، جس کی دو منزلیں تو سوائے ایندھن اور کوڑا بھرنے کے کسی کام کی نہیں - اوپر کی ایک دو منزلیں رہیں ، وہ نیچے کے بخارات اور تعفّن سے بیماری کا گھر ہو جاتی ہیں -"

ضمیمہ ۴

تذکرۂ سنینِ اسلام

حصہ اول

ڈاکٹر لائیٹنر کے ساتھ آزاد کی ادبی رفاقت کا ایک اہم نتیجہ ''تذکرۂ سنینِ اسلام'' حصہ اول ہے ، جو ۱۸۷۴ع میں شائع ہوا ۔ دوسرا حصہ دو سال بعد شائع ہوا ۔ ڈاکٹر لائیٹنر کا بیان ہے کہ انھوں نے اسے مولوی کریم الدین ، ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز ، امرتسر کے تعاون سے لکھا ۔

پہلے حصے کو بعض نقادوں نے تمام تر آزاد سے منسوب کیا ہے ۔ آغا محمد طاہر لکھتے ہیں :

''تذکرۂ سنینِ اسلام بڑی محنت سے لکھوائی تھی مگر ایک دفعہ سے زیادہ نہ چھپ سکی ۔ اچھی چیز تھی ۔ ڈاکٹر صاحب کے نام نے مولانا کی محنت کو خاک میں ملادیا ۔''

اس کے برعکس ڈاکٹر لائیٹنر نے تمہید میں لکھا ہے :

I have to express my thanks for the assistance which Maulvi Muhammad Husain has given me in the preparation of this work. It owes to him any elegance which its Urdu Style may possess.

ترجمہ : اس اعانت کے لیے جو مولوی محمد حسین آزاد نے ہمیں اس کتاب کے تیار کرنے میں دی ، ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں ۔ اُردو زبان کی جو خوبیاں اس میں نظر آئیں وہ ان ہی کی بدولت ہیں ۔

مولوی خلیل الرحمان ، جن سے میں نے اس بارے میں استفسار کیا ، لکھتے ہیں :

''سنین اسلام'' کا زیادہ تر مواد لائیٹنر نے دیا اور اس کو آزاد نے مرتّب کیا ۔ اس کے متعلق کئی مرتبہ آزاد نے تذکرہ کیا ۔''

کتاب کے متعلق دو باتیں بڑی حد تک حتمی ہیں ؛ اس میں آزاد کے پختہ طرزِ تحریر کی جھلک صاف نظر آتی ہے اور کتنی ہی عبارتیں ہیں جو صرف آزاد ہی کے قلم سے نکل سکتی ہیں ۔ اس کے برعکس تاریخِ یورپ سے گہری واقفیت ایسی بات ہے جسے اکثر بے لاگ قاری آزاد سے منسوب کرنے میں تامل کریں گے ۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ پیش کش کلیتہً معروضی ہے جو آزاد کے مزاج کے خلاف ہے ۔ اس میں وہ انحراف اور سرگوشیاں نہیں جو آزاد سے مخصوص ہیں ۔

اس داخلی شہادت کی بنا پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مواد ڈاکٹر لائیٹنر نے فراہم کیا اور آزاد اسے ضبطِ تحریر میں لائے ۔

آزاد کو حصۂ اول کے لکھنے میں بہت دخل تھا ۔ یہ اس کے اسلوبِ بیان سے ثابت ہے ۔ یہ اسلوب حصہ دوم کے اسلوب سے مختلف اور بدرجہا بہتر ہے ۔ ہمیں چونکہ کافی مستند معلومات حاصل نہیں ، اس لیے ہم آج صرف اسلوبِ بیان کے بھروسے پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ کتاب آزاد کی تصنیف ہے ۔ اگرچہ ڈاکٹر لائیٹنر نے واشگاف الفاظ میں اس کا اعتراف نہیں کیا لیکن ان کے الفاظ کے بغور مطالعے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ آزاد نے ڈاکٹر لائیٹنر کے مواد کو اپنی زبان میں ادا کیا ہے ۔ وہ اپنے بیان میں یہ نہیں کہتا کہ آزاد نے اس کے طرز تحریر کو جلا دی ہے ، بلکہ اس نے کہا ہے کہ ادبی محاسن کے لیے ان کی تصنیف آزاد ہی کی مرہونِ منّت ہے ۔

ذیل میں ''سنینِ اسلام حصہ اول'' سے دو اقتباسات اور حصۂ دوم سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے ۔ ان کا بغور مطالعہ کرنے سے نہ صرف پہلی دو عبارتیں تیسری سے بہتر ٹھہرتی ہیں بلکہ سرسری مطالعے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ پہلی دو تحریروں میں آزاد ہی کا طرزِ تحریر نمایاں ہے :

(۱) شروعِ اسلام ، اور اس سے سو برس پہلے ، ان لوگوں میں ایک فخر اور بھی تھا یعنی فصاحت و بلاغت ۔ چنانچہ اس میں انھوں نے

ایسا اقتدار بہم پہنچایا تھا کہ ایک فصیح صاحبِ تقریر جماعتِ کثیر کو فقط اپنی قدرتِ کلام سے جس ارادے سے چاہتا روک لیتا اور جدھر چاہتا تھا جھونک دیتا تھا ۔ یہ کمال اس مرتبے تک پہنچا کہ فصاحت قرآن کے لیے معجزہ ٹھہری ۔ کلام کا اثر یہاں تک بڑھا کہ کہا گیا "ان من البیان لسحرا"۔ یہ جوہر ان کا ذاتی تھا کہ اشراف خاندانوں کے بچے لطفِ زبان طوطی اور بلبلِ ہزار داستان کی طرح اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے تھے ۔ جب معرکۂ جنگ میں رجز خوانی سے شجاعت کے جوش و خروش پر آجاتے تو مخالفوں کے جی چھوٹ جاتے ۔ جب اپنے کشتوں کی لاشوں پر نوحہ کرتے تو سننے والوں کے آنسو نکل پڑتے ۔ گل و بلبل سے عبارت آرائی تو جانتے نہ تھے، جنگل کے صحرائی اور پہاڑوں کے شکاری تھے ۔ مگر زبان میں خدا نے وہ زور دیا تھا کہ جب اپنے ارادے پر کمر باندھ کر قبیلے میں کھڑے ہو جاتے ، ہزاروں کے دل ادھر سے آدھر کر دیتے ۔ باوجود اس کے تکلف اور آورد بالکل نہ تھی ...

جبلِ عرفات کے پیچھے مکّہ کے پاس عکاظ ایک مقام تھا وہاں برسویں دن بازار لگتا تھا ۔ صدھا کوس کے لوگ خرید و فروخت کی چیزیں لا کر ہزاروں کے لین دین کرتے تھے ، مگر حق پوچھو تو اصل فائدہ اس میں یہی تھا کہ ایک قبیلے بلکہ ایک گھر کی ادنیٰ برائی یا بھلائی اس مجمع میں کھل کر فوراً تمام عربستان میں پھیل جاتی تھی ۔ ہر ایک بات کے ڈھنگ بے تکلف اور سیدھے سادھے تھے مگر نہایت پُر تاثیر ۔ جس طرح یونان میں کسی زمانے میں کشتی گیر اور شہسوار دنگل میں اسب تازیاں اور زور آزمائیاں کرتے تھے ، یہاں شعرا طبع آزمائیاں کرتے تھے ۔ تمام عرب کے بدوی اور ملک ملک کے مسافر جو آئے ہوئے ہوتے تھے، بڑے ذوق و شوق سے جمع ہو کر ایک میدان میں با اسلوب بیٹھ جاتے تھے ۔ ان میں سے ایک شخص کہ اپنا نام یا کام یا مقام کچھ نہ بتاتا تھا ، دفعتاً سروقد اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور حفظ اپنے اشعار پڑھنے شروع کر دیتا تھا ۔ بنیاد ان اشعار کی بہادری ،

جوش و خروش، خونریزی یا فخرِ خاندانی ، رفاقتِ دوستانہ ، سخاوت، مہمان نوازی ، نیک نامیٔ دوامی ، فرحتِ مقام، دریاؤں کی روانی ، جنگلوں کی ویرانی ، کوہستانِ وحشت نـاک ، خوش نما جزیرے اور سرسبز جنگل اور ٹیلے ، حیوانات کی وحشت ، اپنے گھوڑے یا اونٹ کی تعریف یا عشق یا دل کی اداسی ، طبیعت کی پریشانی وغیرہ ، غرض اس قسم کے مضامین پر لوگ اشعار پڑھتے تھے - اور فقط کلام کا اثر ان انجان لوگوں سے اپنے مصنّف کو ایسے بے لاگ صلے تحسین یا نفرین کے دلواتا تھا کہ تمام میلے میں ایک دھوم مچ جاتی تھی - (ص ۲۱ - ۲۴)

(۲) تیسرے طبقے میں کچھ امویہ اور عباسیہ کا عہد آ گیا - ان کے عالیشان درباروں کی قدردانیوں سے شاعروں کے دل بڑھ گئے ... مگر اصل زبان کا لطف جبھی تک تھا کہ اپنے وطن کے جنگلوں اور پہاڑوں کی تشبیہیں ، اپنے اونٹوں اور بکریوں کے مضامین باندھ کر دلی اور اصلی مطلب ظاہر کرتے تھے - پھر کلام میں تکلف اور آورد اور مضامین میں عشق کی بہار آ گئی - اصلیتِ مطالب کے حسن کو استعاروں کی رنگینی اور الفاظ کی خوش نمائی پر قربان کر دیا ... خلفا اور سلاطین اور امرا کی تعریفوں میں ، کہ اکثر ان میں سے ترک تھے ، دھوم دھام کے قصیدے کہہ کر ان کے دل خوش کرتے تھے اور انعام لیتے تھے - دو سو برس تک یہی دربار اور جلسے تھے - آخر مبالغوں کے بوجھ نے اصل زبان کو دبا کر ایسا ضعیف کیا کہ اگر آج ان کی اطراز میں کسی واقعی معاملے کو بیان کرنا چاہیں تو بات کی اصلیت کا ادا ہونا ممکن نہیں - فائدہ : ہر شے کا عام خلق اللہ کی رائے اور ضروریات کے بموجب ترقی کرنا اس میں قدرتی حسن اور طبعی خوبی پیدا کرتا ہے - جب اسے خاص اشخاص کی منظور نظر کرنا چاہو تو اس میں شک نہیں کہ خاص خاص قیدیں اس میں ضرور لگ جاتی ہیں - خصوصاً بادشاہوں کی پسند کہ اس میں تکلفات اور ظاہری آرائش لازم پڑی ہوئی ہے - لوگ انعاموں کی لالچ سے فقط ان کی نگاہ کو دیکھتے رہتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ دربار کا رواج پھیل کر سب

اسی کو پسند کرنے لگتے ہیں ۔ مگر قدرتی حسن اور اصلی خوبی اس کی برباد ہو جاتی ہے ۔ گلاب کے پھول کی لطافت اور نزاکت اور خوشنمائی محتاجِ بیان نہیں ، مگر جو کچھ ہے قدرتی ہے ۔ اگر کوئی مصوّر اپنی دستکاری صرف کرے تو نقش و نگار ضرور ہوں گے ، مگر اس سادگی کے حسن میں جو عالم ہے وہ اس میں نہ ہوگا ، بلکہ اصلی خوبی بھی خاک میں مل جائے گی ۔ (ص ۳۲ - ۳۳)

(۳) حکومتِ بنی امیہ میں کیا حال اندلس کا تھا اور کیا کیا کارِ نمایاں اس خاندان سے وہاں پر ہوئے ؟

اس ملک اندلس میں بنی امیہ کی حکومت کو ۳۰۰ برس تک قیام اس واسطے ہوا کہ یہ لوگ بہت شائستہ تھے اور حکام یورپ کے ، اس وقت میں ، درمیان جہالت کے پھنسے ہوئے تھے ۔ اندلس کے عرب اگرچہ بالطبع جنگی اور خونریز تو تھے مگر ان کی ملن ساری اور صلح کلی کے طور اور خوش خلقی کی کامیابیوں نے فتح مندی سے زیادہ کام کر دکھایا تھا ۔ ان عربوں نے شائستگی اطوار کی اور علم اور ہنر اپنے حوصلے اور شوق سے حاصل کیے تھے ، نہ اہل فرنگ کی طرح ۔ کیونکہ اس زمانۂ تاریک میں یورپ کے باشندوں نے جو کچھ حاصل کیا ، شارلمین کے جبر سے کیا ، نہ اپنے شوقِ طبعی سے ۔

تحصیلِ علوم و فنون یا فنِ تجارت و زراعت میں جو صلاح مفید ان لوگوں کو دی جاتی تھی وہ بڑی شکرگزاری اور احسان مندی کے ساتھ اس صلاح کو مانتے تھے ۔ ۷۱۱ع (۹۲ھ) سے ۷۵۵ع (۱۳۷ھ) تک جو تخم تہذیب و شائستگی کا پڑا ، عبدالرحمان اول کی تاثیر و تربیت اور استقلال مزاجی اور استحکامِ حکومت کے باعث اس کے پھل لانے کی امید ہوئی ۔

یہ لوگ جو ہر ایک امید میں کامیاب ہوتے تھے ، اصل میں اس کے دو باعث تھے : ایک یہ کہ ارادۂ حاکم کو اصل جانتے تھے اور برغبتِ تمام اس کی تعمیل کرتے تھے ۔ دوم خواہشِ نفسانی پر شریعت غالب تھی ۔ علاوہ ازیں یہ باعث تھا کہ قانونِ ملکی فسادِ مذہبی سے مبّرا

تھا ۔ چنانچہ عبدالرحمان بانی اس سلطنت نے کعبۃ اللہ کا حج بھی چھوڑ دیا تھا ۔ اس واسطے اس نے خاص شہر قرطبہ میں ایک لاکھ دینار خرچ کرکے ایک مسجد عالیشان ایسی بنوائی کہ اُس کی زیارت کو ہجوم خلائق کا دُور دُور سے آ کر ہوگیا ، اور بہت لوگ معبدِ عظیم سمجھ کر اسی جگہ آ بسے ۔ اور سب لوگوں کے ذہن نشین اس نے یہ بات کردی تھی کہ ہمارا خاندان شرافت اور نجابت کے اعتبار سے قابل تعظیم و تکریم کے ہے ۔ چنانچہ اسی سبب سے علوی اور عباسی اس کا کچھ نہ کرسکے اور یہ خاندان برسوں تک اس ملک میں حکومت کرتا رہا ۔ اگر کوئی فرقہ مذہبی بھی برخلاف اس کے برپا ہوا تو اس نے ان کے عقائد میں دخل ملکی نہ دیا ۔ جو کچھ کیا حکمت اور اخلاق سے کیا ۔ اس واسطے قتل اور خونریزی تک نوبت نہ پہنچنے پائی ۔ اس خاندان میں دو خوبیاں اور بھی تھیں ؛ اول یہ کہ دور اندیشی کے ساتھ انتظامِ ملکی میں یہ خاندان کامل تھا ۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ متحمّل اور نرم مزاج ، منصف اور محسن یہ لوگ بہت تھے ۔ انصاف تو اس خاندان کا مثل سخاوتِ حاتم کے مشہور ہوگیا تھا ۔ اگرچہ شان و شوکتِ شاہی بھی اس خاندان میں تھی ، پر دل ان کا زر اور زیور ، جواہر و الماس سے اتنا خوش نہ ہوتا تھا جتنا کہ کارہائے بزرگ یا مہماتِ نمایاں سے ہوتا تھا ۔'' (ص ۳۲ ، ۳۴)

''تذکرۂ سنینِ اسلام'' حصہ اول کی اشاعت کے جلد ہی بعد آزاد کے لائٹنر سے تعلقات کشیدہ ہونے شروع ہوئے اور آخرکار کھلم کھلا عداوت پیدا ہوگئی ۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ بعض لوگ ، جن کو آزاد کی لائٹنر سے دوستی کھٹکتی تھی ، وہ لائٹنر کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوگئے کہ آزاد کے تعاون سے ان کی شہرت پر حرف آیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے اپنے اشتراک کے بارے میں اخفائے راز کا وعدہ کیا تھا ۔ وہ نکتہ چینوں کی افترا پردازی پر بہت سٹپٹائے لیکن برملا جواب بھی نہیں دے سکتے تھے ۔ بالآخر معترضوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ''سنین اسلام'' کی ترکیب ہی غلط ہے ۔ اس پر آزاد نے لائٹنر کو ایک پُر زور رقعہ لکھا جو اُن کے مکتوبات میں درج ہے ۔ غالباً وہ تکلفات کو بالائے طاق رکھ

کر برملا کتاب کی مدافعت کرنا چاہتے تھے، لیکن لائٹنر اس کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ دونوں میں ناچاقی پیدا ہو گئی اور بعد میں کئی بار شدید بحث و تکرار تک نوبت پہنچی۔ ان ہنگامہ خیز واقعات پر آزاد نے بہت کھل کر اظہار خیال کیا۔ صورتِ حال اس حد تک نازک ہو گئی کہ ایک وقت آزاد کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں محکمۂ تعلیم میں ان کا مستقبل خطرے میں نہ پڑ جائے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کون لوگ آزاد اور لائٹنر میں کشیدگی کا باعث ہوئے۔ آغا طاہر کا خیال ہے کہ ان میں سے ایک پنڈت من پھول بھی تھے جنھوں نے سیاحتِ وسط ایشیا کے بعد آزاد کے بارے میں بڑی خراب رپورٹ دی تھی۔ لیکن یہ ان کا قیاس ہے۔ کوئی قطعی ثبوت دستیاب نہیں ہوا۔

ضمیمہ ۵

سخن دان فارس کے مآخذ

ذیل میں چند متوازی اقتباسات دیے جاتے ہیں جن سے ہمارے بیان کی تائید ہوتی ہے -

شاہ عباس ماضی نے ایک عورت سے جبراً نکاح کرنا چاہا - ایک بھائی کے سوا کوئی اُس کا وارث نہ تھا - مولانا احمد اردبیلی اُس وقت مجتہد تھے - عورت کا بھائی ان کی خدمت میں پہنچا اور حال بیان کیا - انھوں نے ایک کاغذ کے پرزے پر لکھ کردے دیا - صورۃ رقعہ : ''برادرم عباس ! خواہرِ حاملِ رقعہ را بہ وے باز دہ - فقط -'' شاہ نے اُسی وقت تعمیل کی اور وہ خط "فخریۃً" سب کو دکھایا کہ سرکارِ مولانا نے مجھے ''برادرم'' لکھا ہے - پھر خزینہ دار کو دیا کہ اسے احتیاط سے رکھو ، دفن کے وقت میرے کفن میں رکھنا -'' (ص ۳۸ - ۳۹)

We read in the history of Abbas the Great, that a person complained to Moollah Ahmad, the Moojtahed of Ardebil, that the king had taken his sister by force into his harem. The holy man immediately gave him a note to the following effect : "Brother Abbas, restore to the bearer his sister." The king commanded the woman to be instantly given up ; and, showing the note he had received to his courtiers, said aloud, "Let this be put into my shroud" for, on the day of judgment, having been called brother by Moollah Ahmed will avail more than all the actions of my life. (Vol. II, p. 574)

بادشاہِ حال کے دادا فتح علی شاہ قجر نے اپنی تصویر حاکمِ سندھ کو بھیجی - اس کا صندوق ایک خاص نہایت مکلّف سواری میں رکھا ہوا ، فوج کے ساتھ اس توزک و احتشام سے گیا جیسے کوئی درگاہ جاتی ہے - جس آبادی کے قریب پہنچتا تھا ، لوگ پیشوائی کو نکلتے تھے ، بڑی عظمت کے ساتھ لاتے تھے - جو شہر میں پہنچا تو دریا بیگی کئی منزل استقبال کو گیا - جب شہر میں داخل ہوا تو شلک سلامی سر ہوئی -

شاہی خلعت کسی حاکم کے پاس پہنچتا ہے تو وہ ، خواہ شہزادہ ہو خواہ کوئی امیر ہو ، کئی میل تک استقبال کو آتا ہے - ہر شہر کے پاس ایک مقام مقرر ہے ، اسے ''خلعت پوشاں'' کہتے ہیں ، وہاں ٹھہرتا ہے - شہر کے لوگ جمع ہوتے ہیں ، دھوم دھام کا دربار ہوتا ہے ، وہاں خلعت پہنتا ہے -

دربارِ شاہی کے آئین و آداب دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے - تمام شہزادے اور امرائے دربار ، اپنی اپنی جگہ با ادب کھڑے ، سب کی نگاہیں بادشاہ کی طرف ، خاموش ، بے حرکت ، گویا بدن میں جان نہیں - کسی سے کچھ کہتا ہے تو اس طرح کہ فقط ہونٹ ہی ہلتے معلوم ہوتے ہیں - جس کو بلاتا ہے تو وہ کئی کئی قدم پر آگے بڑھتا ہے اور تھم جاتا ہے - گویا بار بار اجازت چاہتا ہے کہ بڑھوں یا نہ بڑھوں - بادشاہ گفتگو کرتا ہے تو اپنے تئیں غائب تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "شاہ فرمان میدہد" ''شاہ میفرماید'' ''شاہ خواہش دارد -" وزرا و امرا ''قبلۂ عالم'' کہتے ہیں اور غائب ہی تعبیر کرتے ہیں - ''قبلۂ عالم کا حکم ہو تو اس طرح کیا جائے'' اور ''قبلۂ عالم کی اجازت ہو تو اس طرح عمل میں آئے - '' (ص ۱۴۳ - ۱۴۲)

...everything connected with the royal name or authority is treated with a respect that is increased by the form which attends it. If the king sends an honorary dress, the person for whom it is intended must proceed several miles to meet it, and clothe himself in his robes of favour with every mark of gratitude and submission...A short time ago a picture of the reigning monarch was sent to the ruler of Sind.

It was enclosed in a case, and nailed down on a litter carried by two mules : but though not visible, was deemed entitled to the respectful homage of his subjects in those countries through which it passed. On the approach of this picture to Abushehr the governor of that port, with all his troops and attendants, went a stage to pay his obeiscence. When it came near, they dismounted from their horses and walked forward to meet it on foot : the governor kissed the conveyance, in token of his devotion to that which it contained, and accompanied it to Abushehr, where it was welcomed with salutes.

...The princes of the royal family are not exempted from paying this mark of respect. There is in general, a place in the vicinity of the provincial capital called Khelat-posh, which means "putting on honorary dress ;" to which the governor or other officers, who receive it, must proceed to be invested with it. The Khelat-posh near Shiraz, is at a distance of four miles on the Isphahan road.

There is no court where a more rigid attention is paid to ceremony than at that of Persia. The looks, the words, the motion of the body are all regulated by the most strict observance of form. When the king is seated in public, his sons, ministers, and courtiers, stand erect, with their hands crossed, and in the exact place of their rank. They watch the looks of the sovereign and a glance is a mandate. If he speaks to them, you hear a voice reply, and see their lips move but not a motion or gesture betrays that there is animation in any other part of the frame. The monarch in speaking often uses the third person, commencing his observations with, "The king is pleased" or, "The king commands", His ministers addressing him, usually style him "The object of the world's regard." (Vol. II, pp. 544-55).

یہ سب لوگ حقیت میں بڑے راہزن ہیں اور اسی کو فخر سمجھتے ہیں -
آج کل کہ انتظام درست ہے ، بڈھے بڈھے مغل مل کر بیٹھتے ہیں ، چائیں پیتے جاتے

ہیں ، حقّے اڑاتے ہیں ، اگلے زمانوں کو یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں : "اے آغا! وقت وقتے بود کہ ہر کس شمشیرے در کمر ، خونے در جگر ، اسپے بزیرِ ران داشت ۔ البتہ میتوانست پارۂ از عمر بآرام بسر برد ۔ ایں زندگی نیست ، رسوائیست موت بہ ہزار درجہ بہتر ازیں زندگی ..." ان لوگوں کو بہت سے لوٹ مار کے کارنامے اپنے بزرگوں کے یاد ہیں ۔ وہ فخریۃً بیان کیا کرتے ہیں ، اور کوئی کہتا ہو تو نہایت اشتیاق سے سنتے ہیں ۔ (ص ۱۵۰ - ۱۵۱)

The wandering tribes of Persia are all plunderers ; and glory in admitting that they are so. They are continually recounting their own successful acts of depradation or those of their ancestors...Every sentiment that escapes them evinces their attachment to their predatory habits. They often regret the internal tranquility of their country ; and speak, with rapture, of those periods of confusion, when everyman who, to use their own expression, "had a horse, a sword, and a heart, could live in comfort and happiness." (Vol. II, p. 599).

سفر میں بادشاہ ہمیشہ گھوڑے پر سوار ہوتا ہے ، کیوں کہ وہ شہسوار ہوتا ہے ۔ بیماری کی ناچاری ہو تو تخت رواں پر جاتا ہے ، اسے خچر کھینچتے ہیں ۔ سفر کا خیمہ و خرگاہ بھی بڑی نمود و نمائش رکھتا ہے ۔ سلاطینِ صفویہ سادات تھے ، وہ عبا و عمامہ رکھتے تھے ۔ قجر سپاہ گری کا فخر رکھتے ہیں ، اس لیے ان کا لباس چست ہے ، اور عمامہ کی جگہ پوست برہ کی کلاہ ۔ سواری کے گھوڑے برق و باد سے باتیں کرتے ہیں ۔ سونے چاندی کا ساز و یراق جواہرات سے مرصّع ہوتا ہے ۔ اس طرح کے بہت سے گھوڑے سجے سجائے کوتل میں چلتے ہیں ۔ ہر شہر کے حاکم اپنے اپنے طویلوں میں اچھے اچھے گھوڑے تیار کرتے ہیں اور وقت بوقت حضور میں بھیجتے رہتے ہیں ۔

It has been before stated that there are no wheel carriages in Persia. The monarch always rides, unless he is prevented by indisposition ; and then, if forced to move, he is carried in a litter that is

suspended between two mules. The tents and portable pavilions of the King of Persia are very magnificent ...

The dress of the Suffaveans was as splendid as that of the present monarch ; but the costume is much changed. It is now universally the fashion in Persia to wear the beard long, and the head is covered with a cap instead of a turban. The upper parts of their garments are made to fit the body very close, but the lower is invariably loose.

There is no part of the establishment of a monarch of Persia to which more attention is paid than his horses...the finest colts, from every part of his kingdom, are sent to the king ; and from these he selects what are deemed the best, for his riding. The charger on which he is mounted is richly caparisoned ; and a number of others with gold embossed saddles and bits are led before him, and form, when he is travelling, the most magnificent part of his state.

(Vol. II, pp. 557—559)

یہ قدرتی مخلوق جنگلوں اور دروں میں بھی پھرتے چلتے رہتے ہیں - جہاں جاڑے کے لیے سرسبز جنگل اور اپنے لیے میوہ دار درخت اور شکار دیکھے ، وہیں سیہ چادر یعنی کالی تنبولیاں ڈالیں اور آتر پڑے - یہ ڈیرے انھیں کے اونٹوں اور بکریوں کی آون کے ہوتے ہیں - ان کا کمسریٹ ان کے ساتھ لدا ہوتا ہے - وہ غلہ ، سوکھے توت ، سوکھے زرد آلو ، اخروٹ ، گوشت قاق (سوکھا گوشت) ، سوکھا دہی ہوتا ہے - کچھ اس سے ، کچھ جنگل کے ہرے میووں سے ، کچھ تازے شکاروں سے اپنے تنوں کو تیار اور جانوں کو تازہ کرتے ہیں - ان کے قبیلوں کے سردار ، جنھیں جوانی کی طاقت اور توانائی حوصلے دیتی ہے ، شہروں میں جاتے ہیں - درباروں سرکاروں میں خدمتوں سے عظمتیں پاتے ہیں - بڈھے سردار ریش سفید کہلاتے ہیں اور اس شہرِ رواں کے حاکم یا بادشاہ جو سمجھو وہی ہوتے ہیں - ریش سفید کا سب ادب کرتے ہیں - وہ بھی سیدھی سادی وضع کے ساتھ ان میں انھیں کی طرح ملا جلا رہتا ہے - سب کی چادریں ہم رنگ اور یکساں ہوتی ہیں - البتہ ریش سفید کی چادر ذرا بڑی ہوتی ہے -

یہ جہاں آترتے ہیں چوکور قلعہ باندہ کر آترتے ہیں - اونٹ ، گھوڑے ، خچریں ، دنبے ادھر آدھر چرنے کو چھوڑ دیتے ہیں - جوان کچھ کام نہیں کرتے - اگر شکار نہ ہو تو دس دس بیس بیس مل بیٹھتے ہیں - ہنستے کھیلتے ہیں ، گاتے بجاتے ہیں اور حقہ آڑاتے ہیں - عورتیں گھروں پر رہتی ہیں ، روٹیاں پکاتی ہیں ، چرخے کاتتی ہیں - قالین ایسے 'بنتی ہیں کہ مخمل کو گرد کردیتی ہیں - بعض عورتیں بڈھوں اور اپنے بچوں کے ساتھ گلے چراتی ہیں - جب بہار کے موسم میں شہروں کے مسافر گھروں سے نکلتے ہیں ، تو دیکھتے ہیں - آذربائیجان اور کردستان کے دروں اور پہاڑوں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ رنگا رنگ مخلوق خدا سے موج مارتے ہیں - یہ صحرائی مخلوق اکثر دامن کوہ یا پہاڑ کے آس پاس ہی رہتے ہیں - جہاں بادشاہ یا دشمن کی طرف سے خطرہ معلوم ہوا ، جھٹ اسباب باندھا اور پہاڑوں میں گھس گئے (صفحہ ١٤٦ - ١٤٧)

The chiefs of these tribes, during peace, usually reside at court, or at provincial capitals ; and leave their followers, whom they occasionally visit, to the direction of elders of the different branches and families of the tribe...They pitch their dark tents on the finest of those plains over which they have a right of pasture ; and the encampment is usually on the bank of a rivulet, or a stream.

It is commonly formed in a square ; and the abode of the principal elder is only to be distinguishe from that of the lowest man in the tribe by its size. All are made of the same coarse materials ; and in the same shape. The horses, mules and sheep, are turned loose, to feed around the encampment. While the young men, if not employed in hunting, are generally seen sitting in circles, smoking, or indulging in repose, the women are busy occupied with their domestic duties, or aiding aged men and boys in tending the flocks. It is the usage of these tribes, unless when very strong, to pitch their tents in the vicinity of a range of mountains, that their flocks and families may be within reach of a place of security on the occurrence of danger. Along the base of those hills which divide Kurdistan from Aderbijan,

every valley is occupied, during the spring and summer, by the camps of these wanderers. (Vol. II, pp. 595—96)

The women were employed in baking, spinning, and weaving carpets ; while the men were as usual, wandering idle or in search of game. (Vol. II, p. 602)

آبِ حیات کے مآخذ

(۱)

"مجموعۂ نغز" یعنی تذکرۂ شعرائے اردو، از حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ قاسم کی اشاعت سے "آبِ حیات" کے مآخذ پر تازہ روشنی پڑتی ہے - حافظ محمود شیرانی، جنھوں نے اس تذکرے کو مرتّب کیا، وہ "آبِ حیات" کے مندرجہ ذیل کوائف کا سراغ اس کتاب سے لگاتے ہیں :

۱- ولی اور ناصر علی کی شاعرانہ چشمک کے بارے میں حکایت (ص ۹۳) -

۲- شاہ مبارک آبرو (ص ۹۷)، شیخ شرف الدین مضمون (ص ۱۰۲)، آزاد (ص ۱۳۰ - ۱۳۱) اور محمد شاکر ناجی کے سوانح مع اشعار جن سے اُن کے کلام کی توضیح ہوتی ہے -

۳- مکھن پاک باز (ص ۹۷) کا حوالہ، آرزو کا فی البدیہہ شعر (ص ۱۲۳)، سودا کا قدسی سے سرقہ (ص ۱۷۲)، شاہ حاتم کے سوانح کا بیشتر حصہ اور اشرف علی خاں یکرنگ کے متعلق بعض نکات (ص ۱۹۷) -

۴- مرزا جانِ جاناں مظہر کی شہادت کا ماجرا اور میر و سودا کی شاعری کا موازنہ (ص ۱۶۴)، سودا کا قاسم امیدوار سے تمسخر (ص ۱۷۰)، بقاء اللہ خاں پر حاشیہ (ص ۱۵۴) اور میر پر ہجو (ص ۲۲۲) -

۵- پیر خاں کمترین پر حاشیہ (ص ۲۱۱ - ۲۱۲) -

۶- میر کی بد دماغی کا تذکرہ (ص ۲۱۶ - ۲۱۷) جو میر کے مدّاحوں کی ناراضگی کا سبب بنا - آزاد کی عبارت "مجموعۂ نغز" کی اس عبارت پر

مبنی ہے :

''از نخوت و خود سریش چہ بر نگارم کہ سینہ ٔ قلم ِ حقائق رقم مے فگارد ۔ بر شعر کسے ، گر ہمہ اعجاز باشد ، و کلام ِشیخ شیراز ، سر ہم نمی‌جنباند تا بہ تحسین ِ خود چہ رسد ۔ و بر سخن ِ احدے اگرچہ معجز طراز می‌بود و گفتہ ٔ اہلی شیرازی ، گوش ہم فرا نمی دارد ۔ امکان چیست کہ حرف ِ آفرین بر زبانش رود ۔"

۷۔ ولی کے متعلق یہ قول کہ "شاعرے است از شیطان مشہور تر" اسی کتاب سے ماخوذ ہے ۔ قاسم کے الفاظ یہ ہیں :

در تذکرۂ خود (میر) ہمہ کس را بہ بدی یاد کرد ۔ در حق ِ شاعر ِشان ِ جلی المتخلص بہ ولی نوشتہ کہ وے شاعرے است از شیطان مشہور تر و سزائے ایں کردار ِ ناہنجار از کمترین شاعر بجوابے یافتہ کہ وے ہجو ہائے متعددۂ او کردہ کہ بعضے ازاں بغایت رکیک و پردہ در افتادہ ۔ حقش بر جملہ سخن پردازان ِ ہندی زبان ثابت و سخن بر سخنش ابلیس منشی و شیطنت ۔ پیر خان کمترین کہ خداش بیامرزد بسیار بموقع و بجا گفتہ کہ : ع

ولی پر جو سخن لائے اسے شیطان کہتے ہیں

۸۔ محمد نثار کا تذکرہ اور اس کا میر کی مثنوی ''اجگر نامہ'' کا جواب (ص ۲۱۸) ۔

۹۔ جرأت کی ابتدائی زندگی کا احوال (ص ۲۳۷) ۔

۱۰۔ مرزا احمد تقی کے گھر پر مشاعرے کی کیفیت ، جرأت کا طمطراق سے غزل پڑھنا اور میر سے داد کا مطالبہ ، میر کا گریز اور مشہور حاضر جوابی : کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو ، اپنی چوماچاٹی کہہ لیا کرو ۔

(۲)

ان سے بھی زیادہ دلچسپ وہ معلومات ہیں جو آزاد کو دوسرے لوگوں کے خطوط کے ذریعے حاصل ہوئیں ۔ میر خلیق وغیرہم کے متعلق

درج ذیل خط مولوی اشرف حسین خان کا نوشتہ ہے (دیکھیے صفحہ ۳۷۹ ، اور صفحہ ۳۸۳ - ۳۸۴ ، آب حیات) - آزاد کو ضمیر اور میر خلیق کے حریفانہ مقابلے کے بارے میں دو بیانات موصول ہوئے اور وہ ان کے متعلق صحیح حقائق جاننے کے خواہاں تھے - ''آب حیات'' میں دونوں پہلو پیش کیے گئے ہیں -

آزاد کے نام یہ خطوط ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

"جناب مولوی صاحب دام فضلہ !

پس تسلیم التماس آنکہ اس خط کے دو حصے ہیں - حصہ اول : مرزا تقی ترق (نے) خواجہ حیدر علی آتش کو فیض آباد بلوایا - تجویز یہ تھی کہ وہاں رہیں - اس زمانے میں میر خلیق بھی بلکہ ابتدائے رشد سے پندرہ روپے ماہوار کے نیشار پوریوں کے یہاں نوکر تھے - مشاعرہ ہوا ، میر خلیق نے غزل کا مطلع پڑھا :

رشک آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو
صاف ادھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

اس بات پر آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں ہے تو میری کیا ضرورت تھی - وہاں سے چلے آئے - اور ضرورت شاگردی مصحفی کی یہ تھی کہ میر حسن خود لے کر اپنے بیٹے کو مصحفی کے پاس آئے اور کہا کہ میں "بدر منیر" تصنیف کر رہا ہوں—— اور وہ سالار جنگیوں کے یہاں ، بلکہ خود سالار جنگ برادر نسبتی شجاع الدولہ کی سرکار میں ملازم بھی تھے—— اور کہا کہ مجھے فرصت نہیں اور یہ ہر روز غزل لاتا ہے - تم دیکھ دیا کرو - اور لکھنؤ میں پیر بخارا ایک محلہ ہے ، اس میں میر خلیق آ کر ٹکا کرتے تھے - اور صورت پرگوئی کی یہ تھی کہ مثلاً ایک لڑکا آیا اور اس نے کہا میر صاحب ! کل آٹھوں کا میلہ ہوگا ، ہم جائیں گے ، ایک غزل کہہ دو - ''اچھا بھئی کہہ دیں گے'' - "نہیں - ہم کل میلے کو جائیں گے" - اسی وقت غزل کہی - اس لڑکے نے کہا ''یاد بھی کرادو'' - غرض

میر صاحب یاد کرا رہے ہیں - مصحفی کے وقت لکھنؤ میں غزل بکا کرتی تھی - یہ بھی غزل کہہ کر فروخت کر دیتے تھے - ایک کوئی شخص غزل خرید اور تخلص ڈلوا کر اصلاح کے لیے ناسخ کے پاس پہنچا - اور دو شعر پڑھے تھے کہ شیخ صاحب بگڑے اور کہا "ابے یہ تیری ہے ؟ یہ پیر بخارا والے کی ہے ، میں خوب پہچانتا ہوں -" خلاصہ یہ ہے کہ وہ مجلس میر ضمیر کی سازش سے ہوئی تھی اور اسی شخص کے مکان پر ہوئی -

میر علی احسن اشک تخلص صاحبِ دیوان ہیں اور مولوی شہیدی تلمیذ ناسخ کے شاگرد - اب حیدرآباد دکن میں بہ زمرۂ منصبداران ملازم ہیں - ان کے والد میر جنتی تخلص مرثیہ گو میر عماد خوش نویس کی اولاد سے تلمذِ دلگیر بیان کرتے تھے - وہ مکان جس میں میر خلیق ٹکا کرتے تھے ہمارے تعلق کا تھا اور اس روز کی حکایت بیان کرتے تھے - اس روز سے فروغ میر خلیق کا ہوا - اس روز تک ان کی یہ اوقات تھی کہ پیادہ پا فیض آباد سے آنا اور لکھنؤ میں دو تین سو روپیہ سالیانہ کمانا ، اپنے بچوں کی پرورش کرنا - میر انیس اپنی ابتدائی حالت بیان کرتے کہتے ہیں ''جب مشاعرے میں غزل پڑھتا تو دو چار دس آدمی رو کر لوٹنے لگتے - اور میر خلیق کے سامنے جب ذکر ہوتا کہ میر انیس خوب پڑھتے ہیں ، بہت بگڑتے - اور آخری عمر میں حالانکہ چھوڑ دیا تھا مگر بعض اوقات اسی خیال سے کہ میں انیس سے اچھا پڑھتا ہوں ، منبر پر جا بیٹھتے اور سنا ہے خوب پڑھتے تھے - اور ہاتھ اور پاؤں کو حرکت نہ ہوتی تھی ، ایک آنکھ کی گردش تھی - شیخ امام بخش ناسخ نے ان کو بہت فروغ دیا ، اور ہمیشہ اپنے مجمع میں خلیق اور ان کے تینوں بیٹوں کی تعریف کیا کرتے تھے - اور پڑھنا تو حقیقت میں نایاب ہی تھا - خلاصہ جو اس وقت تک سمجھ میں آیا ہے ، یہ ہے کہ زبان اور بندش خلیق کی بھی اور میر انیس کی نایاب ہے - اور مضمون اور مرثیہ گوئی کا خاتمہ مرزا دبیر پر ہوگیا - ایسے ایسے آئین میں مضمون نکالتے کہ جواب نہیں - خصوص تلمیح اور تمليح کا بادشاہ گزرا ہے - اگر مجھ سے کوئی پوچھے تو میں دبیر کو سلطان الذاکرین

کہوں - ہاں ایک امر یعنی مضمون کی غیر واقعیت ، یہ مرضِ عام ُکل مرثیہ گویانِ ہند میں ہے - اور رکاکتِ مضامین ، یہ بھی مرض مشترک ہے - اور مولوی صاحب ، شعر میں جب تک مضمون نہ ہو تو شعر نہیں اور اس کے مصنف کو شاعر نہیں کہنا چاہیے بلکہ وہ وزان ہے - اگر بہ حیثیتِ مضمون دونوں کا کلام منتخب کیا جائے تو باق اس طرف بہت ہی کم رہ جائے گا - مولوی حیدر علی صاحب منتہی الکلام ملا مکتبی تھا - اس سے میر انیس نے پڑھا ہے - عربی عبارت خوب پڑھ لیتے تھے - میرے سامنے عربی کی عبارت کو پڑھا کرتے تھے اور صحیح پڑھتے - مگر لغت زیادہ یاد نہ تھی ، غیر مانوس لفظ پوچھتے - بیان کرتے تھے کہ ایک دن شیخ ناسخ کے پاس بیٹھا تھا کہ میاں بحر آئے اور اپنا مطلع پڑھا - شیخ نے اصلاح دی :

اگلی برسات پہ ساون کی گھٹا ٹل جائے

مقامِ اصلاح یاد نہیں رہا - فقط - میر حسن کی قبر محلہ پیر بخارا میں ہے - یار باقی صحبت باقی -

* * *

ناسخ کے حالات بڑی حد تک مندرجہ ذیل خط پر مبنی ہیں :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بوالا جناب رافت و عظمت مآب ، مکارمِ اخلاق ، منبعِ محاسنِ اشفاق ، جامعِ کمالات حضرت مولوی محمد حسین صاحب -

تسلیم مع التکریم - عرض است عنایت نامہ والا رقمزدۂ ۲۰ جون ۸۲ع ورود یافتہ ممتازم ساخت - ہر چند مکتوبِ سوم سلسلہ وار ارسال خدمت ساختم ، غالباً رسیدہ بملاحظہ عالی گزشتہ باشد - وقتاً فوقتاً ہر آنچہ حالاتِ استادی شیخ عبداللہ امام بخش ناسخ صاحب معلومِ حقیر است و یاد مے آید ، ہمہ رطب و یابس نگاشتہ بخدمتِ فیض درجت ابلاغ میں نمایم - پس ُخذ ما صفا و دَع ما کدر - ہرچہ در مزاجِ

مقدس آید درج تذکره خواہند فرمود و آنچہ مناسب اندراج نیست آنرا ترک خواہند فرمود - ضرور نیست کہ جملہ داخلِ تذکرہ بودہ باشد - یک فیروزۂ عمدہ گرفتہ مرزای صاحب بران نامِ نامیِ شیخ ناسخ کندہ کنائیدہ حوالہ بطورِ نذر فرمودہ بودند - شیخ صاحب اکثر در انگشتِ خود میداشتند و گاہے از انگشت برآوردہ جائے می نہادند - کسے آنرا دزدیدہ بُرد - برآن فرمودہ اند :

ہم سا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

دیگر وقتے کہ در الہ آباد تشریف میداشتند و دران ایّام مرزا کلبِ حسین خان صاحب بہادر تحصیل دار مقامِ سورانول بر سرحدِ نوابی بودہ اند ، تمنا کردند کہ شیخ صاحب برائے چندے بمقامِ تحصیلے رفتہ قیام ورزند و سیرِ سبزہ زارِ آنجا فرمایند - چنانچہ بمزیدِ التماس شیخ صاحب در آنجا تشریف بردند و یک ہفتہ اقامت فرمودند - روزے چناں اتفاق افتاد کہ در طعامِ شیخ صاحب مرزا صاحب تکلف فرمودند لہٰذا توقف شدہ - از اندرونِ حویلی طعامِ خدمت گارانِ شیخ اول آمدہ - ناسخ پرسیدند کہ ایں چیست ؟ خدمت گاران گفتند کہ ایں طعامِ مایان است و در طعام حضرت ہنوز توقف است - پس شیخ صاحب آں ہمہ طعامِ دوسہ خدمت گاران گرفتہ تناول فرمودند - و گفتند کہ طعامِ من کہ خواہد آمد شمایان خواہید خورد - ایں حکایت شنیدہ مرزا کلبِ حسین صاحب بغایت محجوب شدند کہ اول طعامِ آقا می باید فرستاد - شیخ صاحب دو مرتبہ از لکھنؤ در دائرۂ شاہ محمد اجمل الہ آبادی قدس سرہ رونق افروز شدہ مقیم بودہ اند - و از آنجا تا بنارس آمدہ خواستند کہ بطورِ شیخ علی حزیں در بنارس مقام ورزند - باعثِ کثرتِ ہنود پسند نہ افتاد - و یک مرتبہ در عظیم آباد ہم رفتند - ہر چند مردم و رؤسائے آں جا بسیار خاطر داری فرمودند لیکن آں صحبتِ لکھنو کجا میسر - و زبانِ آنہا خام بسیار - جلد از عظیم آباد برآمدند و فرمودند کہ زبانِ من ہم خراب اینجا خواہد شد - باز در الہ آباد آمدہ اقامت

فرمودند - لہذا می فرمایند کہ:

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں

اکثر برائے احباب لکھنؤ گریہ فرمودند و برآں گفتہ اند کہ:

ایک تربینی تو ہے ناسخ کی آنکھ
اب الہ آباد ہی پنجاب ہے

ہرچند در دائرۂ شاہ اجمل قدس سرہ از احفاد شاہ محمد افضل الہ آبادی سہ خاندان بودند و برائے شیخ امام بخش از ہر سہ خاندان طعام خوردنی یک وقت معمول بود، مے آمد - و دیگر از خانۂ شاہ علی جعفر صاحب زوج ہمشیرۂ شاہ ابوالمعالی صاحب یک خوان دیگر و از خانۂ غلام حیدر صاحب خوان طعام دیگر اقسام مے آمد - باوجود آں شیخ صاحب ہموارہ از باورچی خاص خود طعام حسب خواہش طبع تیار کُنانیدہ بشمول ہمہ طعام کہ قریب پنج ثار بود، یک وقت می خوردند - طبّاخ یک مرتبہ خاگینہ پخت - در آں نہ معلوم از غفلت یا قصداً مارسیہ انداختہ بود - ایں قطعہ موزوں فرمودند:

جاں بلب آمد مرا از غفلت طبّاخ آہ
مے پزد خاگینہ با مار سیہ از بہر من
چوں دگر بارہ خطا بنمود سال عیسوی
گفت دل، مار سیہ پخت ایں سفیہ از بہر من (۱۸۳۹ع)

دیگر شاہ غلام اعظم صاحب، فرزند شاہ ابوالمعالی صاحب، نبیرۂ شاہ محمد اجمل قدس سرہ، صاحب زادۂ افضل تخلص شاگرد شیخ بودند و اکثر حاضر مجلس مے شدند - روزے شیخ بوریائے مشرق بر تخت انداختہ نشستہ بودند کہ شاہ غلام اعظم حاضر شدند و بر ہماں تخت بنشستہ ازاں بوریا کاہے کشیدہ شغل می‌نمودند کہ شیخ صاحب دیدہ از آدم خود فرمودند کہ جاروب تازہ کہ آوردہ بیار - آدم جاروب را آورد - آں را ازو گرفتہ حوالہ شاہ غلام اعظم صاحب

فرمودند کہ صاحب زادہ شغل ازیں باید فرمود ۔ و الاّ بوریائے ایں فقیر از اندک التفات برباد خواہد رفت ۔ پس دیگر بوریائے مشرق بدست آمدن مشکل است ۔ ایشاں بغایت محجوب شدند ۔ اینگونہ دلبستگی ہائے بسیار می‌فرمودند ۔ در ۱۸۳۱ع ، دراں ایام کہ صلہ از حضورِ معتمد الدولہ یافتہ بودند ، آں روپیہ حوالۂ مرزائے صاحب دوستِ خود فرمودند ۔ ُدزد را گماں شدہ کہ زر در خانۂ خود ذخیرہ داشتہ باشند ، وقتِ شب نقب عقبِ خانہ افتاد ۔ دزد ہیچ نہ یافت ، خجل رفت ؟

دزد در خانۂ ناسخ چو زدہ نقب امشب
نہ زر و سیم نہ ُبد مس ، خجل آمد بیروں

بہرِ تاریخِ مسیحی چو ُبریدم سرِ دزد
"ُدزد از خانۂ مفلس خجل ، آمد بیروں"

* * *

درجِ ذیل خط کسی شخص لالہ درگا داس کا ہے ۔ لطائف شاہ نصیر کے متعلق ہیں ۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان میں سے پہلا لطیفہ ''آب حیات'' میں شامل نہیں کیا گیا :

مولانا مخدومنا تسلیمات ۔ حاتم کی تین اور شاہ نصیر کی دو غزلیں ، جو فی البدیہ حسب الطلب عبداللہ شاہ صاحب نے عنایت فرمائی ہیں ، اور انشاء اللہ تعالیٰ جو کچھ مل سکے گا ، پھر کبھی ارسال خدمت ہوگا ۔ خاکسار کی التماس یہ ہے کہ میرے ایک عنایت فرما منشی دیبی کائیستھ ساکنِ ٹونک ایک تذکرہ ہندو شاعروں کا لکھ رہے ہیں ۔ پس اگر آپ اپنے کسی شاگرد سے فرمائیے کہ وہ وہاں کے ہندو شعر گویوں ، قدیم و جدید ، کا حال و مقال جس قدر معلوم ہو سکے ، لکھ کر عنایت کرے تو عین نوازش ہو ۔ زیادہ نیاز ۔

درگا داس

۳ مارچ ۷٦ع

فی البدیہ تصیر :

ایک شخص نے شاہ صاحب سے دریافت کیا کہ جناب من! اس ضرب المثل کی اصل حقیقت کیونکر ہے ؟ ''جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا ۔'' تھوڑی دیر کے بعد آپ نے فی البدیہ ارشاد فرمایا :

کی کوہ کنی تو زور کس نے دیکھا
اور قیس کا بن میں شور کس نے دیکھا

کرنا جو کچھ ہے ، کریں گے ان کے در پر
ناچا جنگل میں مور ، کس نے دیکھا

ایک دفعہ کچھ رنگترے لے کر تحصیل دار سونی پت کے پاس ملاقات کو گئے ۔ تحصیل دار صاحب نے فرمایا کہ شاہ صاحب رنگتروں کی کیا ضرورت تھی آپ نے کچھ کلام اپنا نذر کیا ہوتا ۔ اب اگر یہ خوشی ہے تو ہم نے منظور کیے مگر ان رنگتروں کی مثال میں کوئی شعر زبان مبارک سے فرمائیے ۔ آپ نے اسی وقت فی البدیہ یہ رباعی تصنیف فرمائی :

اے نیترِ بروجِ آسمانِ اقبال
ان رنگتروں پہ غور سے کیجیے خیال

یہ نذرِ حقیر ہو قبولِ خاطر
پردے میں شفق کے ہیں گرہ بند ہلال

* * *

جنابِ من !

مجھے جب آپ کے تذکرے کے عالی خیالات اور مضامین کا تصوّر آتا ہے تو افسوس ہوتا ہے ، اب تک شائع کیوں نہیں ہوا ۔ مگر جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر آپ کو بندہ سے سچا سچا حال سب شاعروں کا معلوم ہوا تو بہت سے شاعروں کے شاگرد زندہ ہیں ۔ وہ فی سافی کرنے کو تیار ہوں گے ، اس لیے ایک عذاب جان بن جائیں گے ۔ اب

مرزا غالب کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے کوئی خوبی اس میں نہ تھی ۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا ۔ تنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو افسوس نہ تھا ۔ جس روز ذوق مر گیا تو خوش ہو ہو کر کہتا تھا کہ آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مر گیا ۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ صہبائی شعر کیا کہنا جانے ۔ نہ اس نے شراب پی ، نہ قماربازی کی ، نہ معشوقوں کے ہاتھ سے جوتیاں کھائیں ، نہ جیل خانے میں پڑا ۔ طامع ایسا تھا کہ ایک ایک قصیدہ دس دس جگہ بیچتا تھا ۔ اس لیے قصائد میں یہ نہیں لکھا کہ کس کی تعریف میں ہے ، بلکہ نمبر ان پر لگائے ہیں ، سیزدھم ، دھم ، نہم ۔ میرے نزدیک فقط اس کی شاعری سے آپ غرض رکھیں اور کچھ خصائل اور اخلاق سے بحث نہ ہو ۔ میاں غلام امام شہید فارسی کے شاعر مرزا قتیل کے شاگرد ہیں ۔ وہ مرزا کو یہ کہتے ہیں کہ مغرب میں وہ اور مشرق میں "میں" ۔ غالب کا خود قول یہ تھا کہ جب سے ہندوستان میں فارسی شاعری کا چرچا ہوا ، دو شاعر ہوئے ہیں : ایک غالب اور دوسرا خسرو ۔ ایک معتبر آدمی نے مجھ سے کہا تھا کہ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم اور ایک اہلِ شیراز کا حجاز کے سفر میں جہاز کے اندر صحبت کا اتفاق ہوا ۔ انھوں نے مرزا کا دیوان تفریح طبع کے لیے دیا ۔ اس نے ایک نظر ایک آدھ روز دیکھ کر واپس کر دیا اور لکھ دیا کہ ''دریں خرافات اوقات ضائع نکنیم ، ما نمی‌دانیم کہ در کدام زبان ایں دیوان گفتہ شدہ است ۔''

آپ کو یاد ہوگا کہ ایک شیرازی سید باقر علی ، جو عیسائی ہو گیا تھا ، جان سور نام رکھتا تھا ۔ وہ ذوق مرحوم کے پاس جاتا تھا ۔ وہ اس سے مشکل شعر مرزا کے پوچھتے تھے ، وہ فوراً معنی بتا دیتا تھا اور محاورے کی ایک دو غلطی ... (؟) تھا ۔ عام اعتقاد مرزا پر یہاں کے لوگوں کا یہ ہے کہ فارسی کا شاعر اچھا تھا لیکن اردو کی نظم و نثر اس کی یہاں کے لوگوں کو پسند نہیں ۔ تاریخی یا علمی مضامین کے نہ ہونے کا اعتراض مدرسہ کے تربیت یافتوں کو سوجھتا ہے ۔ اور منشی اور

دبیر جو پہلے زمانے کے ہیں وہ خود بھی نہیں جانتے ۔ نکاتِ غالب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان کی تحقیق میں طفلِ مکتب تھا ۔ سوائے چند مصادر کی تحقیقات کے اس کو کسی اور مضمون سے خبر ہی نہیں ۔ اگر کوئی لڑکا بھی خان آرزو کی تصنیفات پر نظر سرسری ڈال جائے تو اس کو مرزا کے نکات سے دس گنے زیادہ نکتے یاد ہو جائیں ۔''

(منشی ذکاء اللہ)

* * *

۲۸ جون ۷۶ء

... ادیب شفیق حبیب لوذعی والمعی مولوی محمد حسین صاحب عربی پروفیسر کالج لاہور ۔ سلام علیکم ، علیکم سلامی ۔ آپ کا مہربانی نامہ ۲۲ جون کا اس دور افتادہ کو ملا ۔ اس کا ورود میرے لیے فتح الباب مسرت ہوا ۔ آپ کا ارادہ نسبت تالیفِ تذکرۂ مشاہیر شعرا اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ اس تذکرے میں ہر ایک شاعر کے تاریخی حالات اور اس کی سوانح عمری کے واقعات ، لطائف اور تلامذۂ رحمانی کا آپ نے التزام فرمایا ہے ۔ اور بعنایتِ الٰہی اس کا تکمیل پر پہنچنا دریافت ہوکر نہایت درجہ مسرت حاصل ہوئی ۔ اگرچہ میں سرمایۂ علمی بہت کم رکھتا ہوں ، الاّ ایسے امور کا نہایت شائق ہوں ۔ اور افسوس ہے کہ وقت لکھنے اس تذکرے کے میں آپ سے دور تھا ورنہ آپ کو تاریخی حالاتِ شعراء کی نسبت ، سوائے حالات مرزا اسد اللہ خاں غالب کے ، زیادہ تر امداد دی جاتی ۔کیونکہ ‌میں نے اپنے والدِ ماجد سے بہت کچھ سنا ہے ۔ میں ایک خاکستر ہوں اس خرمنِ سوختہ کا جسے آتشِ غدر ۵۷ء نے جلا دیا ۔ اب آپ نے مخدومی و مکرمی عمّی مرزا غالب کا حال دریافت کیا ہے ۔ اگرچہ اس کا منصبِ عمومی مکرمی جناب نواب ضیاء الدین خاں صاحب بہادر کو حاصل ہے ، وہ بالاستیعاب ان کے حال سے آپ کو اطلاع دیتے ۔ بدیں وجہ کہ وہ مجھ سے زیادہ کہن سال بھی ہیں اور ان کے معلومات افہام و اوہام کے نزدیک معتمد علیہ اور معتبر تر ہیں ۔ مگر خیر جو

کچھ مجھے معلوم تھا وہ حوالۂ قلم ہے ۔ آپ کو واضح ہو کہ جنابِ مرحوم سے تلمّذ بھی تھا اور غایت درجہ ان کو مہر و شفقت میری نسبت تھی ۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ باہم میرے والد کے اور ان کے زیادہ محبت اور مودت تھی ۔ اور چونکہ وہ صاحبِ اولاد نہ تھے ، مثل فرزندوں کے مجھے تربیت کیا ۔ میرے پاس جو کچھ ہے اسے بے تکلف لکھے دیتا ہوں ۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اور راویانِ صادق کی تحقیق کے مطابق ہو یا نہ ہو ۔

آپ کا سوال نسبت تبدیلِ تخلص ؟

جواب : مجھ کو دیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ ۱۸۲۸ع یا ۲۹ع کے قریب انہوں نے تخلص تبدیل کیا ۔ اور واقعی اسد اللہ خان کے نام کے واسطے غالب ہی تخلص زیبا تھا ، کیونکہ جناب امیر علیہ السلام کا یہ لقب قرار پایا تھا ۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کوئی اسد نامی ایک فرومایہ ، بونگا ، کوڈھبا جھجھر کا شعر کہتا تھا ۔ اس کے ایک مقطع میں لفظِ اسد ان کی نظر سے گزرا ، اور وہ مقطع یہ ہے :

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب
ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

ہم تخلص ہونا جنابِ مرحوم کو ایسے لوگوں سے ، جو تہمتِ آدم ہیں ، نہایت مکروہ معلوم ہوا ۔ اس وجہ سے اسد اللہ خاں کے ساتھ غالب کو موضوع کر دیا ۔

دوسرا سوال : بابت مذہبِ مرزا صاحب و آبائے مرزا صاحب ؟

جواب : اصل یہ ہے کہ مرزا صاحب اولادِ سلّم اور تُور سے ہیں اور ترکمان کہلاتے ہیں ۔ اجداد ان کے شیعہ مذہب نہ تھے ۔ اور اس ملک کا آدمی اور خصوصاً یہ ترکمان لوگ اکثر تفضیلی ہیں ۔ اور مرزا صاحب کو نظر سیر اور تاریخ پر تھی ۔ ان کے نزدیک حقیقت خلافت و امامت کی ثابت ہوئی ۔ ماسوا اس کے کثرتِ صحبت ایران کے ساتھ اور خصوصاً نواب حُسام الدین حیدر خاں معروف کے ساتھ اور بخشی محمود خان

کے ساتھ اس امر کا باعث ہوئے کہ وہ علی پرست ہوگئے۔ اور غلو ان کا ہنگامِ مباحثہ تھا، نہ یہ کہ وہ تبرّائی ہوں۔ بزرگوں میں مرزا صاحب کے کسی کو ہم کیش مرزا صاحب نہ سنا۔

تیسرا سوال کہ کس سنہ میں شعر کہنے شروع کیے؟

جواب: سنہ مجھے اچھی طرح یاد نہیں مگر عنفوانِ جوانی سے طبیعت نے راہ دی اور یہ ہی شغل رہا۔ خصوصیت کے ساتھ اس زمانے کا کوئی شعر مجھے یاد نہیں۔

چوتھا سوال: ہرمزد ثم عبدالصمد کا معاملہ؟

جواب: آپ کی زبان سے میں نے اکثر سنا کہ وہ آن کا استاد تھا۔ وہ تاجر تھا۔ اقتنا ذخائر کے لیے آگرے کو اس نے امید گاہ بنایا تھا۔ پس اگر مرزا صاحب جھوٹے تصور کیے جائیں تو یہ روایت بھی بے اصل محض ہے۔ اور جب یہ روایت بے اصل ہے تو پھر القا و الہام کو ماننا پڑے گا۔ ایسا متعلّم سوائے سروشِ غیبی کے کیسے فیض پذیر ہو سکتا ہے۔

پانچواں سوال: کتبِ مصنّفہ کی تدوین۔

جواب: دیوانِ فارسی ۱۸۳۳ع - ۱۸۳۵ع میں ترتیب ہوگیا۔ انطباع کا زمانہ مجھے یاد نہیں۔ وہ الواح مطبع سے مل سکتا ہے۔ دیوانِ اردو ۱۸۴۹ع کے بعد ترتیب پذیر ہوا۔ "مہرِ نیم روز" شاید ۱۸۵۱ع میں شروع ہوئی۔ "دستنبو" ۱۸۵۷ع میں لکھی گئی اور اس نے ۱۸۵۰ع اور ۱۸۵۱ع میں شرفِ باریابی ... پایا۔ اور حکیم احسن اللہ خاں کے تقاضے سے تاریخ نگاری شروع کی، ورنہ بادشاہ ایسے اشواق و اشغال سے معرّا تھے۔

چھٹے سوال کا جواب اسی پانچویں سوال کے جواب میں آ گیا۔

ساتواں سوال: کلکتے میں طرحِ "بادِ مخالف" اور اس کی وجہ۔

جواب: اہلِ پورب و بنگالہ بوجہ بے مذاق کے قتیل پرست اور

مادھو رام متا ہیں اور مرزا صاحب کو اہلِ ہند کی نسبت کلام رہا۔ چنانچہ یہ بات مرزا صاحب کے اس شعر سے واضح ہے۔ شعر :

لیک نساید زمن کہ در گفتار
مدحتِ لالہ سورداس کنم

اور باعث اس تفضیح کے چند بے تمیزانِ کلکتہ ہوئے کہ وہ آدابِ مہمان نوازی اور ہنر شناسی سے عاطل ہیں۔ بجائے تکریمِ ضیف تسویم و تفہیمِ ضیف کی گئی۔ اور اس تقریب کے باعث مولوی عبدالقادر صاحب نام اور مفتی کبیر احمد صاحب نام دو بزرگ کلکتے کے تھے اور یہ دونوں آدمی کالج گورنمنٹ میں معلّم اور مشاہیر سے تھے۔ ٹرنر مٹکاف صاحب نے "شاہنامہ" کی تصحیح کہ جس کو گویا تفضیح کہنا چاہیے، ان دونوں صاحبوں کی پشت گری سے کی تھی۔ بالجملہ اسی بنا پر مثنوی "بادِ مخالف" لکھی گئی۔

آٹھواں سوال : نواب مصطفٰی خان کو ہدایتِ غیبی۔

جواب : ہدایتِ غیبی رفیقِ حال ہوئی مگر حالتِ شیبی سے پہلے رنگ جما ہوا تھا۔ اگر رم جو منہیّات میں داخل نہیں ہے تو بنت العنب سے مضائقہ کس لیے ؟ شعر :

ہوگی چھٹی شراب و لیکن کبھی کبھی
پیتے تھے روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

مگر ہاں انصاف کہ میاں عبدالغنی صاحب سے خانقاہ میں جب تجدیدِ بیعت کی اور خود بھی کسی قابل نہ رہے تو توبہٴ کامل حاصل ہوئی۔ اور شاید پاس داشتِ حدیث خوانی ملحوظِ خاطر اسلام شکوہ رہا ہو۔

نواں سوال : مولوی الطاف حسین حالی کی روایت :

جواب : واقعی مرزا صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ دقّتِ اشارات و معنی و غرابتِ ترکیب ہم اردو میں نہ کرتے اگر طباع و افہام کو ایسا ناقص جانتے۔ مجالسِ احباب کی خدمت گزاری کو عموماً حاضر

ہوں اور آپ کی اس مہجور پرستی کا شاکر ۔ جب کسی وقت کوئی کام ہو تو آپ ارقام فرمائیں ۔ اس کا سرانجام میرے لیے سرمایۂ مسرت ہے ۔ مگر اس معاملۂ خاص میں باہمہ بے بضاعتی میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں اور یہ امر بے تلاق ممکن نہیں ۔ اگر آپ تصنیف کی تکمیل چاہتے ہیں تو دو چار روز کے لیے مع اس تالیفِ شریف کے یہاں تک قدم رنجہ فرمائیں ۔ یہ امر نہ دشوار اور نہ شاید آپ کو اس میں جائے انکار ۔ ریواڑی سے لوہارو تک میرے ہاں کی سواریاں حاضر ہو سکتی ہیں اور لاہور سے ریواڑی تک ریل کی سبیل ہے ۔ زیادہ والسلام والاکرام ۔ میں ناتندرست ہوں ورنہ اپنے ہاتھ سے خط لکھتا ۔

المعذور معاف علاء الدین

ضمیمہ ۷

نیرنگ خیال کے مآخذ

ذیل میں آزاد کے مضامین اور اُن کے ماخذ سے متوازی اقتباسات دیے جاتے ہیں تاکہ قاری بطورِ خود فیصلہ کرلے کہ آزاد نے مؤخرالذکر سے کس حد تک استفادہ کیا ہے :

"In the early age of the world, as is well known to those who are versed in ancient traditions, when innocence was yet untainted, and simplicity unadulterated, mankind was happy in the enjoyment of continued pleasure, and constant plenty, under the protection of Rest; a gentle divinity, who required of her worshippers neither altars nor sacrifices, and whose rites were only performed by prostrations upon turfs of flowers in shades of jasmine and myrtle, or by dances on the banks of rivers flowing with milk and nectar.

Under this easy government the first generation breathed the fragrance of perpetual spring, ate the fruits, which without culture, fell ripe into their hands, and slept under bowers arched by nature, with the birds singing over their heads, and the beasts sporting about them. But by degrees they began to lose their original integrity. Each, though there was more than enough for all, was desirous of appropriating part to himself. Then entered violence and fraud, and theft and rapine. Soon after pride and envy broke into the world, and brought with them a new standard of wealth; for men who till then thought themselves rich when they wanted nothing, now rated their demands, not by the calls of nature, but by the plenty of others; and began to consider themselves as poor, when they beheld their own

possessions exceeded by those of their neighbours. Now only one could be happy, because only one could have most, and that one was always in danger, lest the same arts by which he had supplanted others should be practised upon him."

آغازِ آفرینش میں باغِ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا :

سیر کرنے والے گلشنِ حال کے اور دور بین لگانے والے ماضی و استقبال کے روایت کرتے ہیں کہ جب زمانے کے پیراہن پر گناہ کا داغ نہ تھا اور دنیا کا دامن بدی کے غبار سے پاک تھا ، تو تمام اولادِ آدم مسرتِ عام اور بے فکری ٔ مدام کے عالم میں بسر کرتی تھی - ملک ملک فراغ تھا اور خسروِ آرام رحم دل ، فرشتہ مقام گویا ان کا بادشاہ تھا - وہ نہ رعیت سے خدمت چاہتا تھا ، نہ کسی سے خراج باج مانگتا تھا - اس کی اطاعت و فرماں برداری اسی میں ادا ہو جاتی تھی کہ آرام کے بندے قدرتی گلزاروں میں گلگشت کرتے تھے ، ہری ہری سبزے کی کیاریوں میں لوٹتے تھے ، آبِ حیات کے دریاؤں میں نہاتے تھے - ہمیشہ وقت صبح کا اور سدا موسم بہار کا رہتا تھا - نہ گرمی میں تہ خانے سجانے پڑتے ، نہ سردی میں آتش خانے روشن کرتے - قدرتی سامان اور اپنے جسموں کی قوّتیں ایسی موافق پڑتی تھیں کہ جاڑے کی سختی یا ہوا کی گرمی معلوم ہی نہ ہوتی تھی - ٹھنڈے اور میٹھے پانی نہروں میں بہتے تھے - چلتے چشموں پر لوگ جھکتے اور منہ لگا کر پانی پیتے تھے ، وہ شربت سے سوا مزہ ، دودھ سے زیادہ قوّت دیتے تھے - جسمانی طاقت ، قوّتِ ہاضمہ کے ساتھ رفیق تھی - بھوک نے ان کی اپنی ہی زبان میں ذائقہ پیدا کیا تھا کہ سیدھے سادے کھانے اور جنگلوں کی پیداواریں ، رنگا رنگ نعمتوں کے مزے دیتے تھے - آب و ہوا ، قدرتی غذائیں تیار کرکے زمین کے دسترخوان پر چن دیتی تھی - وہ ہزار مقوّی اور مفرّح کھانوں کے کام دیتی تھی - صبا و نسیم کی شمیم میں ہوائی خوشبوؤں کے عطر مہک رہے تھے - بلبلوں کے چہچہے ، خوش آواز جانوروں کے زمزمے سنتے تھے - خوبصورت خوبصورت چرند پرند آس پاس کلیل کرتے پھرتے تھے - جابجا درختوں کے جھرمٹ تھے - انھی کے سائے میں سب چین سے زندگی بسر کرتے تھے - یہ عیش و آرام کے قدرتی سامان اس بہتات سے تھے کہ ایک شخص کی فراوانی سے دوسرے کے لیے کمی نہ ہوتی تھی اور کسی طرح ایک سے دوسرے کو رنج نہ پہنچتا تھا - سب

کی طبیعتیں خوشی سے مالامال اور دل فارغ البال تھے ۔

اتفاقاً ایک میدانِ وسیع میں تختہ پھولوں کا کھلا کہ اس سے عالم مہک گیا ، مگر بو اس کی گرم اور تیز تھی ۔ تاثیر یہ ہوئی کہ لوگوں کی طبیعتیں بدل گئیں اور ہر ایک کے دل میں خود بہ خود یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ سامان عیش و آرام کا جو کچھ ہے ، میرے ہی کام آئے ، اور کے پاس نہ جائے ۔ اس غرض سے اس گلزار میں گلگشت کے بہانے کبھی تو فریب کے جاسوس اور کبھی سینہ زوری کے شیاطین آ کر چالاکیاں دکھانے لگے ۔ پھر تو چند روز کے بعد کھلم کھلا ان کے ذریّات یعنی غارت ، تاراج ، لوٹ مار آن پہنچے اور ڈاکے مارنے لگے ۔ جب راحت و آرام کے سامان یوں پیدا ہونے لگے تو رفتہ رفتہ غرور ، خود پسندی ، حسد نے اس باغ میں آ کر قیام کر دیا ۔ ان کے اثرِ صحبت سے یہ لوگ بہت خراب ہوئے ، کیونکہ وہ اپنے ساتھ دولت کا پیمانہ لائے ۔ پہلے تو خدائی کارخانے فارغ البالی کے آئین اور آزادی کے قانون کے بموجب کھلے ہوئے تھے ، یعنی عیش وافر اور سامان فراواں ، جو کچھ درکار ہو ، موجود تھا اور اسی بے احتیاطی کو لوگ تونگری کہتے تھے ، پھر یہ سمجھنے لگے کہ اگر ہمارے پاس ہر شے ضرورت سے زیادہ ہو اور ہمیں اس کی حاجت بھی ہو یا نہ ہو ، لیکن تونگر ہم جبھی ہوں گے جب کہ ہمسایہ ہمارا محتاج ہو ۔ ہرچند اس بیچارے ضرورت کے مارے کو خرچوں کی کثرت اور ضرورتوں کی شدت سے زیادہ سامان لینا پڑا ہو ، مگر انھیں جب ہمسائے خوش حال نظر آتے تھے تو جل جاتے تھے ، اور اپنے تئیں محتاج خیال کرتے تھے ۔

——: o :——

"It is reported of the Persians by an ancient writer that the sum of their education consisted in teaching youth to ride, to shoot with the bow, and to speak truth.

The bow and the horse were easily mastered, but it would have been happy if we had been informed by what arts veracity was cultivated, and by what preservatives a Persian mind was secured against the temptations to falsehood.

There are, indeed, in the present corruption of mankind, many incitements to forsake truth, the need of palliating our own faults, and the convenience of imposing on the ignorance or credulity of others, so frequently occur ; so many immediate evils are to be avoided, and so many present gratifications obtained, by craft and delusion, that very few of those who are much entangled in life, have spirit and constancy sufficient to support them in the steady practice of open veracity.''

سچ اور جھوٹ کا رزم‌نامہ :

عہدِ قدیم کے مورخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانے میں فارس کے شرفاء اپنے بچوں کے لیے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے ؛ شہسواری ، تیر اندازی اور راست بازی - شہسواری اور تیر اندازی تو بے شک سہل آ جاتی ہوگی ، مگر کیا اچھی بات ہوتی اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ راست بازی کن کن طریقوں سے سکھاتے تھے اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغ دیوزاد آ کر ان کے دلوں پر شیشہٴ جادو مارتا تھا تو یہ اس چوٹ سے اس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے -

اس میں شک نہیں کہ دنیا بری جگہ ہے - چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں جو اس مشتِ خاک کو اس دیوِ آتش زاد کی اطاعت کے لیے مجبور کرتی ہیں - انسان سے اکثر ایسا جرم ہوتا ہے کہ اگر قبولے تو مرنا پڑتا ہے ، ناچار مکرنا پڑتا ہے - کبھی ابلہہ فریبی کرکے جاہلوں کو پھنساتا ہے ، جب لقمہ رزق کا پاتا ہے - اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکر و دغا ان کی چاٹ لگاتی ہے اور جزوی جزوی خطائیں ہو جاتی ہیں جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے - غرض بہت کم انسان ہوں گے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے رستے میں ہر دم ثابت قدم ہی رہیں -

——: o :——

"I was musing on this strange inclination which every man feels to deceive himself, and considering the advantages and dangers proceeding from this gay prospect of futurity, when, falling asleep, on a sudden I found myself placed in a garden, of which my sight could

descry no limits. Every scene about me was gay and gladsome, light with sunshine, and fragrant with perfumes ; the ground was painted with all the variety of spring, and all the choir of nature was singing in the groves. When I had recovered from the first raptures, with which the confusion of pleasure had for a time entertained me, I began to take a particular and deliberate view of this delightful region. I then perceived that I had yet higher gratifications to expect, and that at a small distance from me, there were brighter flowers clearer fountains, and more lofty groves, where the birds, which I yet heard but faintly, were exerting all the power of melody. Tne trees about me were beautiful with verdure, and fragrant with blossoms ; but I was tempted to leave them by the sight of ripe fruits, which seemed to hang only to be plucked. I therefore walked hastily forwards, but found, as I proceeded, that the colours of the field faded at my approach, the fruit fell before I reached it, the birds flew still singing before me, and though I pressed onward with great celerity, I was still in sight of pleasures of which I could not yet gain the possession, and which seemed to mock my diligence, and to retire as I advanced."

گلشنِ امید کی بہار :

میں ایک رات انھی خیالات میں حیران تھا ، اور سوچ رہا تھا کہ انسان کے دل میں یہ شوق کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے جس سے اپنے تئیں آپ دھوکا دیتا ہے ، اور زمانۂ آیندہ پر رنگ آمیزیاں چڑھا کر خود اپنے لیے امید و بیم اور نفع و نقصان کے سامان تیار کر لیتا ہے ؟ یکایک آنکھ لگ گئی ، دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغِ نوبہار میں ہوں جس کی وسعت کی انتہا نہیں ۔ امید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے ۔ آس پاس سے لے کر جہاں تک نظر کام کرتی ہے ، تمام عالم رنگین و شاداب ہے ۔ ہر چمن رنگ روپ کی دھوپ سے چمکتا ، خوشبو سے مہکتا ، ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے ۔ زمین فصل بہار کی طرح گل ہائے گوناگوں سے بوقلموں ہو رہی ہے اور رنگا رنگ کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں ۔ یہ سماں بہار کا دیکھ کر دل پر ایک عالم طاری ہوا کہ سر تا پا محو ہو گیا ۔ جب ذرا ہوش آیا

تو ان چمن ہائے دل کشا کو نظرِ غور سے دیکھنے لگا، اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف زیادہ ہو۔

پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دور آگے رنگیلے چمکیلے پھول کھلے ہیں، آبِ زلال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ اونچے اونچے درخت جھنڈ کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ جو جانور دھیمی دھیمی آواز سے بولتے سنائی دیتے تھے، یہاں خوب زور شور سے چہکار رہے ہیں۔ چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں اور پھول اپنی خوشبو سے مہک پھیلاتے ہیں۔ مگر پھر یہاں سے جو نظر اٹھائی تو اور ہی طلسمات نظر آیا؛ یعنی دیکھا کہ سامنے جو درخت جھوم رہے ہیں ان کے تیار میوے زمین کو چوم رہے ہیں۔ اس لطف نے اور آگے بڑھنے کو للچایا، چنانچہ قدم اٹھایا۔ مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا زیادہ حیران ہوتا گیا، کیونکہ جو ہریاول سامنے سے لہلہاتی دکھائی دیتی تھی، پاس پہنچ کر اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ اور میوے تو گر ہی چکے تھے، بلبلیں جو چہچہے بھر رہی تھیں، وہ آگے آگے اڑتی چلی جاتی تھیں۔ اگرچہ میں بہت پھرتی سے پہنچا تھا اور جو بہاریں تھیں وہ ہر ہر قدم پر سامنے ہی تھیں، مگر تو بھی ہاتھ نہ آ سکیں۔ گویا میرے شوقِ آرزو کو ڈہکاتی تھیں کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا وہ اور بھی آگے بڑھتی جاتی تھیں۔

——: o :——

"Life," says Seneca, "is a voyage, in the progress of which we are prepetually changing our scenes : we first leave childhood behind us, then youth, then the years of ripened manhood, then the better and more pleasing part of old age." The perusal of this passage having excited in me a train of reflections on the state of man, the incessant fluctuation of his wishes, the gradual change of his disposition to all external objects, and the thoughtlessness with which he floats along the stream of time, I sunk into a slumber amidst my meditations, and on a sudden, found my ears filled with the tumult of labour, the shouts of alacrity, the shrieks of alarm, the whistles of wind and the dash of waters.

My astonishment for a time repressed my curiosity ; but soon recovering myself so far as to inquire wither we were going, and what were the cause of such clamour and confusion. I was told that we were launching into the ocean of life, that we had already passed the straits of infancy, in which multitudes had perished, some by the weakness and fragility of their vessels and more by the folly, perversencess, or negligence of those who undertook to steer them ; and that we were now on the main sea, abandoned to the winds and billows, without any other means of security than the care of the pilot, whom it was always in our power to choose among great numbers that offered their direction and assistance.''

سیرِ زندگی :

ایک حکیم کا قول ہے کہ "زندگی ایک میلہ ہے ، اور اس عالم میں جو رنگا رنگ کی حالتیں ہم پر گزرتی ہیں ، یہی اس کے تماشے ہیں - لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو جوان ہوئے اور پختہ سال انسان ہوئے - اس سے آگے بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمرِ انسانی کا عطر وہی ہے -" جب اس فقرے پر غور کیا اور آدمی کی ادلتی بدلتی حالت کا تصوّر کیا تو مجھے انواع و اقسام کے خیالات گزرے - اول تو وقت بوقت اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کا بدلنا ہے کہ ہر دم ادنٰی ادنٰی چیز کا محتاج ہے - پھر اس کی طبیعت کا رنگ پلٹتا ہے کہ ابھی ایک چیز کا طلب گار ہوتا ہے ، ابھی اس سے بیزار ہوتا ہے ، اور جو اس کے برخلاف ہے ، اس کا عاشقِ زار ہوتا ہے -

پھر غفلت ہے کہ وقت کے دریا میں تیراقی پھرتی ہے - لطف یہ ہے کہ سب خرابیاں دیکھتا ہے اور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا - میرا دل ان خیالات میں غرق تھا کہ دفعتاً درد و مصیبت کی فریاد ، خوشی کے ولولے ، ڈر کی چیخیں ، ہواؤں کے زور ، پانی کے شور ، ایسے اٹھے کہ میں بے اختیار اچھل پڑا - اول تو دل بہت حیران ہوا ، بعد تھوڑی دیر کے حواس ٹھکانے ہوئے تو آس پاس کچھ لوگ نظر آئے - پوچھنے لگا کہ کس عالم میں ہیں اور کہاں جاتے ہیں ، اور اس عمل کا کیا سبب ہے ؟ ایک شخص برابر سے بولا کہ صاحب ! کہاں جاتے ہیں ،

دریائے حیات میں تیر رہے ہیں - پہلے تو لڑکپن کی نہر تھی کہ جس میں کشتیوں کی کمزوری سے ، کچھ ملاحوں کی غفلت سے ، کچھ ان کی بیوقوفی سے ، لاکھوں بھائی بند غارت ہوگئے - وہ نہر تو ہم اتر آئے ہیں ، اب سانجھدار سمندر ہے اور ہم ہیں - کبھی طوفان ہے ، کبھی گرداب ہے ، کبھی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں - یہاں ملاحوں کی ہوشیاری اور چالاکی کے سوا کوئی صورت بچاؤ کی نہیں - ملاح بھی ان لاکھوں کے انبوہ میں سے انتخاب کیے ہیں ، جو رستہ بتانے اور پار اتار دینے کے دعوے باندھے بیٹھے ہیں - مگر حقیقت میں نہ یہاں ناخدا کی پیش آتی ہے ، نہ ملاح کی ، فقط خدا کی آس ہے اور بس -

——: o :——

"It is a celebrated thought of Socrates, that if all the misfortunes of mankind were cast into a public stock, in order to be equally distributed among the whole species, those who now think themselves the most unhappy, would prefer the share they are already possssssed of before that which would fall to them by such a division. Horace has carried this thought a great deal further in the motto of my paper, which implies, that the hardships or misfortunes we lie under are more easy to us than those of any other person would be, in case we would change condition with him.

As I was ruminating upon these two remarks, and seated in my elbow chair, I insensibly fell asleep, when on a sudden, methought, there was a proclamation made by Jupiter, that every mortal should bring his griefs and calamities, and throw them together in a heap. There was a large plain appointed for this purpose. I took my stand in the centre of it, and saw with a great deal of pleasure the whole human species marching one after another, and throwing their several loads, which immediately grew up into a prodigious mountain, that seemed to rise above the clouds."

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا :

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہلِ دنیا کی مصیبتیں

ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں ، تو جو لوگ اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے -

ایک اور حکیم اس لطیفے کے مضمون کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے - وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو غنیمت سمجھتا -

میں ان دنوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی - خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطانِ افلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے ، خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہلِ عالم اپنے اپنے رنج و الم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں - چنانچہ اس مطلب کے لیے ایک میدان کہ میدانِ خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا ، تجویز ہوا اور لوگ آنے شروع ہوئے - میں بیچوں بیچ کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا - دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے - لیکن جو بوجھ گرتا ہے ، مقدار میں اور بھی بڑا ہو جاتا ہے ، یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا -

——: o :——

"The sciences having long seen their votaries labouring for the benefit of mankind without reward, put up their petition to Jupiter for a more equitable distribution of riches and honours. Jupiter was moved at their complaints, and touched with the approaching miseries of men whom the Sciences, wearied with perpetual ingratidude, were now threatening to forsake, and who would have been reduced by their departure, to feed in dens upon the mast of trees, to hunt their prey in deserts, and to perish under the paws of animals stronger and fiercer than themselves.

A synod of the celestials was therefore convened, in which it was resolved that Patronage should descend to the assistance of Sciences. Patronage was the daughter of Astrea, by a mortal father, and had

been educated in the School of Truth, by the goddess whom she was now appointed to protect. She had from her mother that dignity of aspect, which struck terror into false merit, and from her mistress that reserve, which made her only accessible to those whom the Sciences brought into her presence.

She came down with the general acclamation of all the powers that favour learning. Hope danced before her, and liberality stood at her side, ready to scatter by her direction the gifts which Fortune, who followed her, was commanded to supply. As she advanced towards Parnassus, the clouds, which had long hung over it, were immediately dispelled. The shades, before withered with drought, spread their original verdure, and invigorated their scents : the Muses tuned their harps and exerted their voices : and all the concert of nature welcomed the arrival."

علوم کی بدنصیبی :

علوم و فنون نے دیکھا کہ مدت گزر گئی ، ہمارے مرید اور خدمت گزار فقط اپنی ارادتِ دلی سے انسان کے فائدوں کے لیے محنت کر رہے ہیں اور جس صدقِ دل سے جانفشانی اور عرق ریزی کرتے ہیں ، اس کا صلہ کچھ نہیں ملتا ۔ بلکہ جن بے لیاقتوں کو جوہرِ کمال سے کچھ واسطہ نہیں ، اور انسان کی نفع رسانی کی کچھ بھی پرواہ نہیں رکھتے ، وہ کامیابی اور عیش و عشرت کی بہاریں لوٹ رہے ہیں ۔ سب کو اس بات کا بہت رنج ہوا اور سلطانِ آسمانی کے دربار میں عرض کی ؛ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ "انصاف و عدالت کے بموجب تمام مریدانِ خدمت گزار کو بمقتضائے انصاف عزت اور دولت کے انعام مرحمت ہونے واجب ہیں ۔" دربار میں مشتری صدرِ اعلیٰ تھا اور عطارد میر منشی ۔ جب یہ عرضی پڑھی گئی تو جو جو خدمتیں اور ادائے خدمت میں مشقتیں تھیں ، سب جتائی اور دکھائی گئیں اور حق تلفیوں کا دعویٰ کیا گیا ۔ معلوم ہوا کہ فی الحقیقت عالمِ خاک میں علوم و فنون کی کوششوں اور کارگزاریوں کا شکریہ کسی نے ادا نہیں کیا ۔ اب وہ آئے دن کے دکھ بھرتے بھرتے ایسے دق ہوگئے ہیں کہ یقین ہے چند روز میں دنیا کو چھوڑ کر عالمِ بالا کی طرف چلے آئیں ۔ اور اگر وہ دنیا میں نہ رہے تو حضرت

انسان ، جنھوں نے یہ شوکت و شان بنائی ہے ، حیوانوں سے بدتر رہ جائیں گے - پھل پھلاری ، گھاس پاس چرتے پھریں گے ، جنگلوں کے جانور بن جائیں گے ، اور جو ان سے زیادہ وحشی ہوں گے وہ انھیں پھاڑ کھائیں گے - اس کے فیصلے کے لیے عالمِ بالا میں کمیٹی ہوئی - قاعدہ ہے کہ جو اراکینِ دربار کا رنگ ہوتا ہے ، وہی کل دربار کا رنگ ہوتا ہے - چنانچہ سب کا اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ ضرور کسی کو بھیجنا چاہیے -

ملکۂ کوکب جمال کی ایک بیٹی تھی کہ باپ اس کا عالمِ خاکی سے تھا ، مگر اس کے نورِ جمال اور حسنِ کمال نے تمام عالمِ بالا کو روشن کر رکھا تھا ، اور صداقت اور حقیقت کے رستے تعلیم پائی تھی - اسے حضور سے ملکۂ علم افروز کا خطاب عطا ہوا اور عقل کا تاج سر پر رکھا گیا ، جس میں آفتاب کی طرح فہم و ادراک کی شعاعیں جگمگاتی تھیں - رفعت کا تخت پھولوں سے سجایا ، اس ملکۂ موصوفہ کو جلوہ گر کرکے اس طرف روانہ کیا - آسمان کے تارے آتارے اور زمین نے بجائے غبار نور اڑایا - اس نے بھی عالم میں آکر باپ کی طرف سے وہ شان و شوکت ، لیاقت دکھائی ، جس سے تمام بے لیاقت تھرا گئے ، اور ماں کی طرف سے وہ روشنی پھیلائی کہ کرۂ خاک ، نور کی قندیل ہوگیا -

——: o :——

"Wit and Learning were the children of Apollo, by different mothers : Wit was the offspring of Eurphrosyne, and resembled her in cheerfulness and vivacity : Learnlng was born of Sophia, and retained her seriousness and caution. As their mothers were rivals, they were bred up by them from their birth in habitual opposition, and all means were so incessantly employed to impress upon them a hatred and contempt of each other, that though Apollo, who foresaw the ill effects of their discord, endeavoured to soften them, dividing his regard equally between them, yet his impartiality and kindness were without effect ; the maternal animosity was deeply rooted, having been intermingled with their first ideas, and was confirmed every hour, as fresh opportunities occured of exerting it. No sooner were they of age to be

received into the apartments of other celestials, than Wit began to entertain Venus at her toilet, by aping the solemnity of Learning, and Learning to divert Minerva at her loom, by exposing the blunders and ignorance of Wit."

علمیت اور ذکاوت کے مقابلے :

کہتے ہیں کہ اقلیمِ خیال میں ایک وسیع ولایت تھی کہ جس کا نام ملکِ فصاحت اور وہاں کے بادشاہ کا لقب ملک الکلام تھا ۔ بادشاہ مذکور کے محلوں میں دو بیبیاں تھیں ؛ ایک کا نام فرحت بانو اور دوسری کا نام دانش خاتون تھا ۔ دانش خاتون کا ایک بیٹا تھا ، یہ سیدھا سادا شخص حسنِ متانت میں باپ کا خلف الرشید اور تمکنت اور سنجیدگی میں ماں کی تصویر تھا ۔ اسے علم کہتے ہیں ۔ فرحت بانو کی بیٹی ذکاوت تھی کہ باپ کے سبب سے خوش بیانی میں اسمِ بامسمیٰ اور ماں کے اثر سے زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی میں گلاب کے تختے کو شرمندہ کرتی تھی ۔ چونکہ فرحت بانو اور دانش خاتون دونوں سوکنیں تھیں ، دونوں بچوں نے بگاڑ کا دودھ پیا اور بگاڑ ہی میں پرورش پائی تھی ، یعنی ابتدا سے ایسی باتیں دل پر نقش ہوئی تھیں کہ ایک کو ایک خاطر میں نہ لاتا تھا ، بلکہ ہر ایک دوسرے کی صورت سے بیزار تھا ۔ باپ نے دیدۂ دور اندیش سے ان کی نا اتفاقی کے نتیجے پہلے ہی دیکھ لیے تھے ۔ اس لیے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ان کے دل اپنائیت کی گرمئی محبت سے ملائم ہوں ۔ آخر صورت یہ نکالی کہ اپنی نظرِ محبت کو دونوں میں تقسیم کر دیا ۔ مگر باپ کی شفقتِ منصفانہ نے کچھ اثر نہ کیا ، کیونکہ ماؤں کی طرف کی عداوت دور تک جڑ پکڑے ہوئے تھی ، اور بچپنے کے خیالات کے ساتھ مل کر آہستہ آہستہ بہت دور تک پہنچ چکی تھی ۔ چنانچہ نئے نئے موقعے جو پیش آتے تھے ، ان میں عداوت مذکور اور بھی پختہ ہوتی جاتی تھی ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ دونوں کے دونوں خوبی و کمال کی جان اور تعلیم و تہذیب کے پُتلے تھے ۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو عالمِ بالا کے پاک نہادوں کی نظر ان پر پڑنے لگی اور وہاں کی مہمانیوں میں آنے جانے لگے ۔ چند روز کے بعد ذکاوت نے باپ کے اشارے سے اپنے نشاط محل میں بڑے بڑے اہلِ کمال جمع کرکے رقاصۂ فلک ، یعنی زہرہ ، کی ضیافتیں کرنی شروع کیں ۔ مگر ان جلسوں میں علم کا سانگ بھرا اور اس میں اس خوبی سے اس کی ہجو کی کہ محفل کو لٹا لٹا دیا ۔

علم نے بہت برا مانا - چنانچہ اس کے توڑ پر قاضیؑ افلاک یعنی مشتری کی ضیافت کی اور اپنے زورِعلم سے شہزادی ذکاوت کی بے اصل سخن سازی اور بے علم طرازیوں کی قلعی کھولنی شروع کردی -

——: o :——

"There are two kinds of immortality ; that which the soul really enjoys after this life, and that imaginary existence by which men live in their fame and reputation. The best and the greatest actions have proceeded from the prospect of the one or the other of these ; but my design is to treat only of those who have chiefly proposed to themselves the latter, as the principal reward of their labours. It was for this reason that I excluded from my Tablets of Fame all the great founders and votaries of religion ; and it is for this reason also, that I am more than ordinary anxious to do justice to the persons of whom I am now going to speak ; for, fame was the only end of all their enterprises and studies, a man cannot be too scrululous in allotting them their due proportion of it. It was this consideration which made me call the whole body of the learned to my assistance ; to many of whom I must own my obligations for the categories of illustrious persons, which they have sent me in upon this occasion. I yesterday employed the whole afternoon in comparing them with each other ; which made so strong an impression upon my imagination, that they broke my sleep for the first part of the following night, and at length threw me into a very agreeable vision, which I shall beg leave to describe in all its particulars."

شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار :

بقائے دوام دو طرح کی ہے ؛ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی کہ اس کے لیے فنا نہیں - دوسری وہ عالمِ یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرتِ دوام کی عمر پاتے ہیں - حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے ، یا ثواب

آخرت کے لیے یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے لیے ہوئے - لیکن میں اس دربار میں انھی لوگوں کو لاؤں گا جنھوں نے اپنی محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزمہائے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور ناموری کو سمجھا - اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے ، ان کے نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں ، مگر بڑا فکر یہ ہے کہ جن لوگوں کا ذکر کرتا ہوں ، ان کی حق تلفی نہ ہو جائے ، کیونکہ جن بیچاروں نے ساری جانفشانی اور عمر بھر کی محنتوں کا اجر فقط نام کو سمجھا ، ان کے حصے میں کسی قسم کا نقصان ڈالنا سخت ستم ہے - اس لحاظ سے مجھے تمام مصنفین اور مورخین سے مدد مانگنی پڑی - چنانچہ اکثروں کا نہایت احسان مند ہوں کہ انھوں نے ایسے ایسے لوگوں کی ایک فہرست بنا کر مجھے عنایت کی ، اور مجھے بھی کل دوپہر سے شام تک اسی کے مقابلے میں گزری - ناموران موصوف کے حالات ایسے دل پر چھائے ہوئے تھے کہ انھوں نے مجھے سوتے سوتے چونکا دیا - میں اس عالم میں ایک خواب دیکھ رہا تھا - چونکہ بیان اس کا لطف سے خالی نہیں ، اس لیے عرض کرتا ہوں -

——: o :——

"Our defects and follies are too often unknown to us ; nay they are so far from being known to us, that they pass for demonstrations of our worth. This makes us easy in the midst of them, fond to show them, and to be esteemed for them. Then it is that a thousand unaccountable conceits, gay inventions, and extravagant actions, must afford us pleasures, and display us to others in colours which we ourselves take a fancy to glory in. Indeed there is something so amusing for the time in this state of vanity and ill-grounded satisfaction, that even the wiser world has chosen an exalted word to describe its enchantments, and called it, 'The Paradise of Fools.'

...Methought I was transported to a hill, green, flowery, and of an easy ascent. Upon the broad top of it resided squint-eyed Error, and Popular Opinion with many heads ; two that dwelt in sorcery, and were famous for bewitching people with the love of themselves.

To these repaired a multitude from every side, by two different paths woich leads towards each of them. Some who had the most amusing air went directly themselves to Error, without expecting a conductor; others of softer nature went first to Popular Opinion, from whence as she influenced and engaged them with their own praises, she delivered them over to his government."

جنّت الحمقا :

دنیا میں اکثر قباحتیں اور حماقتیں ایسی ہیں کہ ہم سب ان میں آلودہ ہیں ، مگر معلوم نہیں ہوتیں - درحقیقت وہ ہماری رسائیٔ فہم سے بہت اونچے طاق پر رکھی ہیں ، اور کچھ ایسے ڈھب سے سجائی گئی ہیں کہ ہر بدی عین خوبی نظر آتی ہے - لطف یہ ہے کہ وہ آلودگی ہمیں کچھ بری بھی نہیں معلوم ہوتی ، بلکہ بجائے اس کے رفع کرنے یا چھپانے کے خود دکھاتے ہیں اور آرزوئیں کرتے ہیں کہ اپنی قباحتوں میں ترقیاں کریں اور انھی میں ہماری قدردانیاں ہوں - چنانچہ سیکڑوں واہیات ، ہزاروں لغو خیالات ، نئے مسخرہ پن ، ظرافتوں کے چمن ہیں کہ وہی ہماری تفریح طبع اور خوش دلی کا سرمایہ ہو رہے ہیں - اور یہ رنگینیاں ہمیں ایسے ایسے رنگوں میں رنگین کرکے ابنائے جنس کے سامنے جلوہ دیتی ہیں کہ ہم بھی انھی میں خلعتِ افتخار لیتے ہیں - اس فخرِ بیہودہ اور خیالِ بے بنیاد کی خوشی میں خدا جانے کیا لطف دیکھا ہے کہ سیانے دنیاداروں نے اس کی دل فریبیوں کا اشارہ کرنے کے لیے ایک لطیف اصطلاح چھانٹی ہے ، یعنی "جنّت الحمقا" -

... ابھی سوتے سوتے معلوم ہوا گویا کسی نے مجھے ایک پہاڑ پر پھینک دیا ہے - مگر عجیب پہاڑ ہے کہ سبزے سے لہلہاتا ، پھولوں سے چہچہاتا ، جابجا پانی لہراتا ہے - چڑھائی اس کی ہمتِ بلند کا نمونہ ہے ، مگر باوجود اس کے اعتدال پر ہے کہ دم نہیں چڑھنے دیتی ، بلکہ ساعت بہ ساعت سینے کو قوت حاصل ہوتی ہے - میں ادھر اُدھر پھرنے لگا - اتنے میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو میدن فراخ پایا ، اور دور سے نظر آیا کہ ایک جگہ آبِ رواں میں پاؤں لٹکائے کوئی شہزادی بیٹھی ہے کہ زیور اور لباس سے طاؤس مرصّع کا عالم ہے مگر آنکھ سے بھینگی ہے اور اس بھینگی آنکھ پر ایک رنگین عینک بھی لگائے ہے کہ اسی سبب سے اسے کوئی شے حالتِ اصل پر نظر نہیں آتی - چنانچہ معلوم ہوا کہ ملکۂ غلط فہمی

یہی ہے اور کل اہلِ عالم کی غلط فہمی گویا اسی کی نگاہ پر منحصر ہے ۔

—— : o : ——

"It is indeed much easier to describe what is not humour than what is ; and very difficult to define it otherwise than as Cowley has done wit, by negatives. Were I to give my own notions of it, I would deliver them after Plato's manner, in a kind of allegory, and by supposing Humour to be a person, deduce to him all his qualifications, according to the following genealogy. Truth was the founder of the family, and the father of Good Sense. Good Sense was the father of Wit, who married a lady of collateral line called Mirth, by whom he lad issue Humour. Humour therefore being the youngest of this illustrious family and descended from parents of such different disposition, is very various and unequal in his temper ; sometimes you see him putting on grave looks and a solemn habit, sometimes airy in his behaviour and fantastic in his dress ; insomuch that at different times he appears as serious as a judge, and as jocular as a Merry - Andrew . But as he has a great deal of the mother in his constitution, whatever mood he is in, he never fails to make the company laugh.

But since there is an impostor abroad, who takes upon him the name of this young gentleman and would willingly pass for him in the world, to the end that well - meaning persons may not be imposd upon by cheats, I would desire, when my readers when they meet with this pretender, to look into his parentage, and to examine him strictly, whether or not he be remotely allied to Truth, and lineally descended from Good Sense; if not they may conclude him a counterfeit."

خوش طبعی :

خوش طبعی کی تعریف میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ کیا شے ہے ، البتہ یہ کہنا آسان ہے کہ وہ کیا شے نہیں ہے ۔ میں اگر اس کی نسبت کچھ خیالات بیان کروں تو افلاطون حکیم الٰہی کی طرح کنایے اور استعارے سے بیان کروں ۔

اور ظرافت کو ایک شخص قرار دے کر اس سے وہ صفتیں منسوب کروں جو کہ نسب نامہ مندرجہ ذیل میں درج ہیں - یہ واضح ہو کہ سچ ، خوش طبعی کے خاندان کا بانی مبانی ہے - اس گھرانے میں حسنِ ادب ایک نہایت معقول شخص تھا - اس کا بیٹا حسنِ بیان ہوا - اس نے اپنے ایک برابر کے خاندان میں شادی کی - اس کی دلھن کا نام خندہ جبیں تھا کہ آٹھ پہر ہنستی ہی رہتی تھی - چنانچہ اس کے گھر میں میاں خوش طبع پیدا ہوئے -

چونکہ خوش طبع سارے خاندان کا لبِ لباب تھا ، اس لیے اس کی طبیعت بوقلموں اور گوناگوں تھی - کبھی تو نہایت سنجیدہ اور معقول وضع اختیار کر لیتا اور کبھی رنگین بانکا بن جاتا تھا - کبھی ایسا بن کر نکلتا گویا قاضی القضاۃ یا شیخ الاسلام چلے آتے ہیں اور کبھی ایسے مسخرے بن جاتے کہ بھانڈوں کو بھی طاق پر بٹھاتے - لیکن چونکہ ماں کے دودھ کا بڑا اثر ہوتا ہے ، اس لیے کسی حالت میں وہ اہلِ محفل کو ہنسائے بغیر نہ رہتا تھا - اس کے ہمسائے میں ایک مکر باز ، جعل ساز بھی رہتا تھا کہ اس نے بھی خوش طبع اپنا نام رکھ لیا تھا اور لوگ بھی اس بدذات کو اسی کا قائم مقام سمجھتے تھے - پس اس خیال سے کہ نیک مرد ، ناواقف اس کے دھوکے میں نہ آئیں ، میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کے پڑھنے والے اگر کبھی ایسے شخص سے ملیں تو اس کی نسل کو اچھی طرح سمجھ لیں - اور غور سے دیکھیں کہ دور نزدیک کچھ رشتہ اس کا سچ کے قبیلے سے جا ملتا ہے یا نہیں - وہ حسنِ ادب کے گھرانے سے پیدا ہوا ہے یا کسی اور سے - اگر یہ نہ ہو تو وہی جعل ساز ، بہروپیا سمجھیں -

——: o :——

"Criticism from whom they derive their claim to decide the fate of writers, was the eldest daughter of Labour and Truth; she was, at her birth, committed to the care of Justice, and brought up by her in the palace of Wisdom. Being soon distinguished by the celestials, for her uncommon qualities, she was appointed the governess of Fancy, and empowered to beat time by the chorus of the Muses, when they sung before the throne of Jupiter.

When the Muses condescended to visit this lower world, they came accompanied by Criticism to whom, upon her descent from her native regions, Jupiter gave a sceptre, to be carried aloft in her right hand, one end of which was tinctured with ambrosia and inwreathed with a golden foliage of amaranthus and bays ; the other end was encircled with cypress and poppies, and dipped in the water of oblivion. In her left hand she bore an unextinguishable torch, manufactured by labour and lighted by Truth of which it was the particular quality immediately to show every thing in its true form, however it may be disguised to common eyes. Whatever Art could complicate or Folly could confound, was upon the first gleam of the torch of Truth, exhibited in its distinct parts and original simplicity : it darted through the labyrinths of sophistry, and showed at once all the absurdities to which they served for refuge ; it pierced through the robes which rhetoric often sold to falsehood, and detected the disproportions of parts which artificial veils had been contrived to cover."

نکتہ چینی :

حقیقتِ حال یہ ہے کہ نکتہ چینی ، جس کی بدولت ان لوگوں نے مصنفوں کی قسمت کے فیصلے کرنے کا اختیار پایا ہے ، اصل میں خواجہ حق پرست اور محنت خاتون کی سب سے بڑی بیٹی تھی ۔ جب وہ پیدا ہوئی تو پرورش کے لیے انصاف کے سپرد ہوئی ۔ چنانچہ اس نے دانش کے محلوں میں پال کر تربیت کیا ۔ وہاں دن رات علوم کی جواہر کاری اور فنون کی مرصّع نگاری کو دیکھا کرتی اور صبح و شام عقل آرائی کے باغوں میں جی بہلایا کرتی ۔ جب بڑی ہوئی تو عالمِ بالا کے بزرگوں نے اسے حسنِ کمال اور کمالِ حسن میں بے مثال دیکھ کر ملک خیال کا تاج سر پر رکھ دیا کہ چند روز کے بعد مملکتِ خیال کی ملکہ ہوکر عالمِ بالا کی پریوں میں داخل ہوگئی ۔ وہاں کی پریاں موسیقی ، ناچ رنگ ، سانگ ، شاعری ، افسانہ ، تاریخ وغیرہ اپنے اپنے فن کی مالک تھیں ۔ چونکہ انھیں بھی ملکِ خیال سے تعلق تھا ، اس لیے ملکۂ نکتہ چینی نے ان کے کلام میں دخل پیدا کر لیا ۔ جب انھوں نے عالمِ خاک کی طرف نزول کیا تو ملکۂ نکتہ چینی کہ خود

فرماں روائے ملک ِ خیال تھی ، وہ بھی ان کے ساتھ روئے زمین پر آئی ۔ محل سے چلتے وقت انصاف یعنی اس کے استاد نے ایک پھولوں کی چھڑی دی تھی کہ اسے تمغۂ شاہی کی طرح ہر وقت اپنے داہنے ہاتھ میں رکھا کرے ۔ عالم ِ بالا کے دربار میں دستور تھا کہ جس رات کوئی پری اکھاڑا جیتا کرتی تو اس کی مبارک باد میں اسے ایک ہار ملا کرتا تھا جس میں گلہائے جنت کی کلیاں اور امرت کے درخت کی کونپلیں پروئی ہوتیں ۔ چنانچہ عصائے مذکور کے ایک سرے پر وہی ہار اور طرّے سجا کر انہیں آب ِ حیات کے چشمے سے شاداب کیا جاتا اور دوسرے میں سرو بے ثمر کی پتیاں اور پوست کے ڈوڈے باندھ دیے جاتے ۔ یہ دریائے محویت کے پانی میں ڈوبی ہوئی تھی جس سے افیون کا گھولوا اور پوست کا پانی ٹپکتا تھا ۔ ملکۂ موصوف کے بائیں ہاتھ میں ایک مشعل بھی تھی کہ اس کی روشنی کبھی بجھتی نہ تھی ۔ اس مشعل کو خود محنت خاتون نے بنایا تھا اور حق پرست نے روشن کیا تھا ۔ بڑا جوہر اس میں یہ تھا کہ چیز کیسی ہی مخفی ہو ، اس کی روشنی سارا حال جوں کا توں آئینہ کر دیتی تھی ۔ ملکۂ ہنر کی الجھاوٹ اور حمق کی خرابی کام کو کیسا ہی درہم برہم کر کے اُلجھا دے ، مشعل ِ حق کی روشنی پڑتے ہی اس کی سدھاوٹ کا بال بال روشن ہو جاتا تھا ۔ ظاہر آرائی اور غلط نمائی کے پیچوں میں اس کی شعاع سوئی کی طرح بیٹھ جاتی تھی ۔ اور جن جن ایچ پیچ میں ان کے لغویات پیچیدہ تھے ، انہیں دفعۃً کھول دیتی تھی ۔ بہت سے زرق برق لباس کہ فصاحت اور عبارت آرائی نے جھوٹ کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے ، یہ ان کے بھی بخیے کھول دیتی ۔ اور گھٹت بڑھت کی پُتلیاں ، جو بناوٹ کے کپڑے پہن کر ٹھیک ٹھاک بن بیٹھتی تھیں ، انہیں بھی جھٹ پکڑ لیتی تھی ۔

—: o :—

"I must here inform my reader that the frontiers of the enchanted region, which I have before described, were inhabited by the species of Mixed Wit, who made a very odd appearance when they were mustered together in an army. There were men whose bodies were stuck full of darts, and women whose eyes were burning-glasses ; men that had hearts of fire, and women that had breasts of snow. It would be endless to describe several monsters of the like nature, that com-

posed this great army, which immediately fell asunder, and divided itself into two parts, the one half throwing themselves behind the banner of Truth, and the other behind those of Falsehood.

The goddess of Falsehood was of a gigantic stature, and advanced some paces before the front of her army ; but as the dazzling light which flowed from Truth began to shine upon her, she faded insensibly ; insomuch that in a little space she looked rather like a huge phantom than a real substance. At length as the goddess of Truth approached still nearer to her she fell away entirely, and vanished amidst the brightness of her presence so that there did not remain the least trace or impression of her figure in the place where she had been seen.

As at the rising of the sun the constellations grow thin, and the stars go out one after another, till the whole hemisphere is extinguished ; such was the vanishing of the goddess ; and not only of the goddess herself but of the whole army that attended her, which sympathised with their leader, and shrunk into nothing, in proportion as their goddess disappeared."

مرقعِ خوش بیانی :

شائقینِ سخن ذرا اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ سرحدی ملک خوش بیانیِ مرکب کے فرقہ ہائے مختلفہ سے آباد تھا - یعنی کچھ اصل کچھ بداصل - چنانچہ ان کی فوج کی عجیب شان تھی - مردوں کے جسموں پر برچھیاں چبھی ہوئی تھیں ، عورتوں کی آنکھوں کی جگہ آتشی شیشے لگے ہوئے تھے - اگر مردوں کے دل انگارے تھے تو عورتوں کی چھاتیاں برف کی تھیں - غرض کہ جیسے عجائب وغرائب مخلوقات سے یہ لشکر آراستہ تھا ، اس حالت کی رنگارنگی بیان کے احاطے میں محصور نہیں ہوسکتی - چنانچہ جس وقت حریف کا نشان نمودار ہوا ، دفعتاً ان میں ایک ہل چل مچی اور فوراً دو حصے ہو کر ، ایک حصہ سچ کے سایۂ علم میں جا کھڑا ہوا ، دوسرا اوت مہابھوت یعنی جھوٹے دیوتا کے نشان کے نیچے ہوگیا - دیو دروغ اپنا کالا پہاڑ سا ڈیل ڈول لیے چند قدم آگے بڑھا مگر جونہی سچ کی روشنی اس پر پڑنی شروع ہوئی وہ اس طرح بے معلوم تحلیل ہونا شروع ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں

اصلی جسم کی جگہ فقط ایک پرچھائیں سا نظر آنے لگا ۔ آخر ادھر سے سچ بھی آگے بڑھا ۔ جب اس کی روشنی پاس آئی تو وہ دیو روسیاہ بالکل نیست و نابود ہو گیا ۔

تم نے آفتاب کو دیکھا ہوگا کہ جوں جوں نکلتا آتا ہے ، چھوٹے موٹے تارے برابر چھپتے جاتے ہیں ، یہاں تک کہ ان کا نقشِ وجود سامنے کے نصف کترے سے بالکل محو ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح یہاں معلوم ہوا کہ دیو دروغ یعنی اوت مہا بھوت تو بالکل نیست و نابود ہو گئے ، اور نہ فقط دیو دروغ بلکہ سارا لشکر شیطان جو ہمدردی اور جاں نثاری کو حاضر تھا ، دم میں ہوا ہو گیا ۔

"How we are tortured with the absence of what we covet to possess, when it appears to be lost to us ! What excursions does the soul make in imagination after it ! and how does it turn into itself again, more foolishly fond and dejected at the disappointment. Our grief, instead of having recourse to reason, which might restrain it, searches to find a further nourishment. It calls upon memory to relate the several passages and circumstances of satisfaction which we formerly enjoyed ; the pleasures we purchased by those riches that are taken from us ; or the power and splendour of our departed henours ; or the voice, the words, the looks, the temper, and affections of our friends that are deceased, It needs must hoppen from hence that the passion should often swell to such a size as to burst the heart which contains it, if time did not make these circumstances less strong and lively, so that reason should become a more equal match for the passion, or if another desire which becomes more present did not overpower them with a livelier representation. These are thoughts which I had when I fell into a kind of vision...I found myself upon a naked shore, with company whose afflicted countenances witnessed their conditions. Before us flowed a water, deep, silent, and called the River of Tears, which issuing from two fountains on an upper ground, encompassed an island that lay before us. The boat which plied it was old and shattered, having been sometimes overset by the impatience and haste of single passengers to arrive at the other side.

This immediately was brought to us by Misfortune who steers it, and were all preparing to take our places, when there appeared a woman of a mild and composed behaviour, who began to deter us from it, by representing the dangers which would attend our voyage. Hereupon some who knew her for Patience, and some of those who too until then cried the loudest, were persuaded by her, and returned back."

سیرِ عدم :

جب کوئی نہایت چاہیتی چیز ہمارے ہاتھ سے نکل جائے اور معلوم ہو کہ اب ہاتھ نہ آئے گی ، تو کیسا دل بےقرار ہوتا ہے ۔ جان صحرائے تصور میں کبھی اس کے پیچھے بھٹکتی پھرتی ہے مگر جب تھک ہار کر ناچار ہو جاتی ہے تو اداس بے آس ہو کر آتی ہے اور اپنے ٹھکانے پر گر پڑتی ہے ۔ عقل و فہم البتہ دلِ غمگین کو سہارا دے سکتے ہیں ، مگر دل ایسا بھولا بھالا شخص ہے کہ ذرا نہیں سمجھتا اور جو غذا اس کے جی کو بھاتی ہے ، اسی کو ڈھونڈتا ہے ۔ درحقیقت یاد ، جو دل کی ہمسائی ہے ، وہ ہمیشہ غم کو خانۂ دل میں بلاتی ہے ، اور ایامِ گزشتہ میں جو مزے اٹھائے ہیں ، یا دولت کھو کر عیش اڑائے ہیں ان کی گزری ہوئی بہاروں کے افسانے سناتی ہے ۔ کسی کو اس دولت و عظمت کا غبار اڑتا دکھائی دیتا ہے جس کی سواری گزر گئی ، کسی کو اقربا کی آوازیں اور دوستوں کی باتیں سناتی ہے جو شہرِ خموشاں میں پڑے سوتے ہیں ۔ کبھی عزیزوں کی صورتوں اور ان کی طبیعتوں کی تصویریں دکھاتی ہے ۔ کبھی پیاروں کے پیار اور ان کی محبتوں کے افسانے سناتی ہے ۔ دل نے حسرت و اشتیاق کو بھی اپنے گوشے میں رکھ چھوڑا ہے ۔ وہ ان باتوں سے ایسے پھولتے اور پھلتے ہیں کہ دل پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے ، مگر زمانہ اور اس پر وقت کا گزر جانا حالاتِ مذکورہ کو کچھ کچھ کمزور کرتا ہے ۔ ساتھ اس کے یا تو عقل و فہم آ کر حسرت و اشتیاق کو دباتے ہیں یا کوئی اور باہر کا شعور ان سے بھی زبردست آتا ہے ، وہ ان کا زور گھٹاتا ہے ۔

میں ان ہی خیالات میں پڑا تھا جو نیند آ گئی ۔ دیکھتا ہوں کہ گویا ایک چٹیل میدان ، صحرائے بیابان ، سمندر کا کنارہ ہے ، اور میں وہاں بہت سے لوگوں

میں کھڑا ہوں کہ جن کے سوگوار چہرے ان کے دل کے غم و اندوہ کی گواہی دیتے ہیں - ہمارے سامنے جو دریا بہہ رہا ہے اس کا چپ چاپ بہاؤ اور سناٹے کا چڑھاؤ پکار رہا تھا کہ یہاں تھاہ کا پتا نہیں - اس دریا کو دریائے اشک کہتے ہیں - اسی دریا میں ایک ٹوٹی پھوٹی سی کشتی بھی پڑی ہوئی تھی - چنانچہ معلوم ہوا کہ بہت سے مسافر، دریا پار جانے والوں نے اضطراب اور بے صبری سے اس میں بیٹھ کر اسے خراب کر دیا ہے - مصیبت اس کشتی پر ملاحی کرتی تھی - چنانچہ وہ فوراً ہمارے پاس لے آئی - ہم بھی سوار ہونے کو تیار تھے کہ اتنے میں ایک بی بی ، دیرینہ سال ، شرم و حیا کا برقع اوڑھے ، حلم کی لاٹھی ٹیکتی آئی - شفقتِ مادرانہ سے ایک ایک کا نام پکارا اور قعرِ دریا کے خطر بیان کرنے لگی تاکہ ہم کسی طرح اپنے ارادے سے باز رہیں - اکثر لوگوں نے اسے پہچان لیا کہ بی بی صابر خاتون ہیں - چنانچہ بعض اشخاص ، جو رو رو کر آنکھوں سے دریا بہا رہے تھے ، انھوں نے اس کا کہا مانا اور پیچھے ہٹ آئے -"

ضمیمہ ۸

دربار اکبری کی تصنیف

میر ممتاز علی نے "دربار اکبری" کا پہلا ایڈیشن ۱۴ ستمبر ۱۸۹۸ع میں شائع کیا تھا۔ وہ دیباچے میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے آزاد کے مسودے میں کافی ترمیم و تصحیح کی ہے اور تقریباً ۱۶۵ صفحات کا ضمیمہ اضافہ کیا ہے۔ کتاب کی تصنیف کے بارے میں ان کے اس بیان ہی کو کافی خیال کیا جاتا رہا تا آنکہ آغا ابراہیم نے اگست ۱۹۱۰ع میں اس کی تردید کردی۔

میر ممتاز علی کے ارشاد کے مطابق آزاد اپنے زمانۂ دیوانگی میں اس کتاب کی اشاعت کے خلاف تھے اور انھیں اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں اسے چوری کرکے شائع نہ کر دیا جائے۔ اس لیے انھوں نے اس کو کئی اور مسودات کے ساتھ راوی میں پھینک کر ضائع کر دیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے جو متن استعمال کیا ہے وہ کئی لوگوں کا لکھا ہوا ابتدائی مسودہ تھا جسے غالباً آزاد کے شاگردوں نے نقل کیا تھا۔ آزاد کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اجزا میں اس قدر ترمیمات کی گئی تھیں اور الفاظ کے الفاظ اور سطروں کی سطریں کاٹ دی گئی تھیں کہ ان کا پڑھنا از حد دشوار تھا۔ علاوہ ازیں مسودے کے حاشیے میں آزاد نے ابتداً جابجا چھوٹے چھوٹے پرزے ٹانک رکھے تھے جن میں سے بعض اپنے اپنے مقام سے الگ ہوگئے تھے، اور یہ معلوم کرنا مشکل ہوگیا تھا کہ ان کا اصل موقع محل کیا ہے۔ لہذا میر صاحب ہی کو کئی جگہ خلا پُر کرنے پڑے اور کتاب کی اصلاح اور درستی کرنی پڑی۔ میر ممتاز علی کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے ذیل کے اجزا اضافہ کیے:

ص ۲۹۸ سطور ۷ - ۱۸

ص ۵۴۹ سطور ۱۶ - ۲۵

ص ۶۹۰ سطور ۲۱ تا آخرِ صفحہ

ص ۶۹۹ سارا صفحہ

ص ۷۰۰ سطور ۱ - ۵

ضمیمے کی تیاری کے سلسلے میں میر ممتاز علی لکھتے ہیں :

"مصنف نے بعض اُن امرائے دربار کے حالات کے ذیل میں ، جن کے تذکرے کے لیے یہ کتاب بالخصوص موضوع ہے ، بعض دیگر اشخاص کی طرف اشارہ کیا تھا - ان اشخاص کے حالات کے لیے ضمیمہ لکھنے کا ارادہ تھا - مصنف نے جابجا اپنی کتاب میں اس ضمیمے کا حوالہ بھی دیا ہے - یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آیا مصنف نے کوئی ضمیمہ لکھا بھی اور وہ لکھا ہوا تلف ہوگیا یا اس کے لکھنے تک کی نوبت نہیں آئی - مسودہ کے ساتھ ضمیمہ کی صورت کے چند اجزا مجھے ملے جو فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں - مگر یہ ضمیمہ اس کتاب کے ساتھ شامل ہونے کے قابل نہ تھا - اول تو وہ فارسی زبان میں ہے ، دوسرے نہایت مختصر ، یعنی ہر شخص کے حالات کے لیے زیادہ سے زیادہ سات سطریں اور بعض اوقات صرف ایک آدھ سطر دی گئی ہے -

میں نے اس فارسی ضمیمے کو چھوڑ کر ایک ضمیمہ تیار کیا جس میں ستر ایسے اشخاص کا حال درج ہے ... اس تتمہ کے تیار کرنے میں بھی میں نے کوشش کی ہے کہ اگر مصنف نے اپنی اس کتاب میں یا کسی اور جگہ ان اشخاص کی نسبت کچھ لکھا ہو تو سب سے پہلے مصنف کا کلام جمع کروں - مجھے مصنف کی بعض یاد داشتیں مل گئیں جو ضمیمے کی نسبت لکھ رکھی تھیں - اور ان کی مدد سے مجھے تتمے کی تیاری میں کسی قدر سہولت ہوگئی - خاندانِ صفویہ کا حال تمام و کمال مصنف کا لکھا ہوا مل گیا -"

آغا محمد ابراہیم اس امر کی تردید کرتے ہیں کہ مسودہ ، جیسا کہ میر ممتاز علی نے بیان کیا ہے ، برباد کر دیا گیا تھا - ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے والد کی دیوانگی کا آغاز ہوتے ہی مسودہ اپنے قبضے میں لے لیا تھا - وہ اس سے بھی انکار کرتے ہیں کہ ضمیمہ میر ممتاز علی نے تیار کیا تھا - وہ لکھتے ہیں کہ اشاعت کے بعد میر صاحب نے مسودہ انھیں (آغا ابراہیم کو) لوٹا دیا - اور جو لوگ بھی

خواہاں ہوں انھیں آزاد کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اکبر کے درباریوں کے پچاس عدد خاکے دکھانے کو تیار ہوں۔

مولوی خلیل الرحمان واحد شخص تھے جو اس مسئلے پر روشنی ڈال سکتے تھے، لیکن انھوں نے بڑی خوش خلقی اور ثابت قدمی سے معذرت کرتے ہوئے انکار کر دیا۔ وہ لکھتے ہیں :

"درحقیقت میں نے ہی آغا محمد ابراہیم اور میر ممتاز علی میں مصالحت کرائی تھی لیکن میرے ان دونوں خاندانوں سے گہرے تعلقات ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ان گئے گزرے واقعات کو تازہ کرکے انھیں ناراضگی کا موقع دوں۔" (دیکھیے صفحہ ٢٨٦)

لیکن انھوں نے ایک اور سلسلے میں کچھ ایسی باتیں لکھ دی ہیں جن سے یقین ہوگیا کہ مسودے کا ضائع کرنا محض ڈھکوسلا ہے۔ (دیکھیے صفحہ ٢٨٢)

ساری بات اس نقطے پر آ رہتی ہے : کیا میر ممتاز علی نے واقعی ضمیمہ اور وہ حصے تحریر کیے جن کا انھوں نے دعویٰ کیا ہے؟ اس کا تصفیہ طرز تحریر کی اندرونی شہادت سے کیا جا سکتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ اجزا بھی آزاد ہی کے اسلوب میں لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ عبارت ملاحظہ ہو جسے میر ممتاز علی اپنی تحریر قرار دیتے ہیں :

"پہلے ایک سرنگ اڑی اور سامنے کا برج اڑا۔ قلعے کے محافظ جو اس پر کھڑے تھے سب اڑ گئے۔ اگرچہ زمین ہل گئی اور ہوا اندھیر ہوگئی اور گڑگڑاہٹ کے صدمے سے دل سینوں میں ہل گئے، مگر بہادر جو کمر بستہ گھات میں کھڑے تھے بے تحاشا دوڑ پڑے۔ گڑگڑاہٹ میں اور پیش قدمی کے ولولوں میں سردار، سپاہی کوئی نہ سمجھا کہ ابھی دوسری سرنگ باقی ہے۔ اس وقت غوغائے قیامت کا نمونہ نمودار ہوا، کیونکہ باہر سے حملہ آور اور اندر سے محافظوں کو ساتھ ہی لے اڑی۔ ایسا غل اور شور ہوا کہ شورِ محشر بھی گرد ہوگیا۔ ہندو مسلمان یکساں دہائی دیتے تھے۔ آدمی پتھر کی چیلوں کی طرح ہوا میں اڑتے نظر آتے تھے۔ ٣-٣، ٤-٤ کوس پر جا گرے۔ ہاتھ مشرق میں

گرے پاؤں مغرب میں - ۵۰ ۵۰ کوس سے زیادہ اس کے صدمے کا اثر پہنچا -

ہمارے پاس داخلی شہادت کی بنا پر یہ باور کرنے کی معقول وجوہ ہیں کہ تقریباً سارے کا سارا ضمیمہ ، یا کم سے کم اس کا بیشتر حصہ ، آزاد کے سوا اور کسی کی تحریر نہیں ہو سکتا - ضمیمے سے چند اقتباسات پیش کرکے اس رائے کی توثیق ممکن نہیں ، کیونکہ اس طرح زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ثابت ہوگا کہ من حیث المجموع آزاد ہی کی تحریریں ہیں - اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ میر ممتاز علی بھی تمام و کمال ان کا مصنف ہونے کا دعویدار نہیں - امر واقعہ کچھ بھی ہو ، جن لوگوں نے آزاد کے طرز تحریر کا بہ امعان نظر مطالعہ کیا ہے ، وہ یہ کہنے میں تامل نہیں کریں گے کہ غالباً سارے کا سارا ضمیمہ ان ہی کے قلم سے ہے - ہم نے اس قضیے کا کسی رو رعایت کے بغیر مطالعہ کیا ہے ، اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دونوں اصحاب اپنے اپنے دعووں میں بہت دور نکل گئے ہیں - ایک کتاب کی تصنیف میں معتد بہ حصے کا دعویدار ہے اور دوسرا اس دعوے کو بالکل خارج از امکان قرار دینے پر مصر ہے - مسودے کا تلف کر دینا محض افسانہ ہے - لیکن یہ من گھڑت بات میر ممتاز علی کی نہیں - ہمیں یہ باور کرنے کی کافی معقول وجہ نظر آتی ہے کہ آزاد نے مسودے کو تباہ کرنے کی دھمکی دی ہوگی اور میر صاحب یہ سمجھے ہوں گے کہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا کر ڈالا - آزاد کی خط و کتابت سے پتا چلتا ہے کہ وہ مسودے پر آخری نظر ثانی کرنے سے پہلے دیوانے ہوگئے تھے - یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آزاد کو اپنے مسودوں میں بار بار درستی اور اصلاح کرنے کی عادت تھی - وہ کاغذ کے پرزوں ، پرانے خطوط ، یہاں تک کہ استعمال شدہ لفافوں پر بھی کچھ نہ کچھ لکھ کر مسودے پر چپکا دیتے تھے - اس سے میر ممتاز علی کو یقین ہوگیا ہوگا کہ یہ مسودہ آزاد کا آخری مکمل مسودہ نہیں - حق تو یہ ہے کہ انہوں نے کہیں بھی سارے ضمیمے کے مصنّف بلا شرکت غیرے ہونے کا دعویٰ نہیں کیا - وہ تو صرف اتنا کہتے ہیں کہ انہوں نے ضمیمے کی بنیاد آزاد کے فراہم کردہ مواد پر رکھی ہے اور پھر حتی الوسع آزاد کے اپنے ہی الفاظ میں تحریر کیا ہے - میر ممتاز علی نے دیباچے میں جو کچھ کہا ہے اس سے آغا محمد ابراہیم کے اس الزام کی تائید نہیں ہوتی کہ وہ سارے ضمیمے کو تمام تر اپنی تصنیف قرار دیتے ہیں - علاوہ ازیں آغا ابراہیم نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ آزاد کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کوئی

پچاس خاکے دکھا سکتے ہیں ، لیکن کتاب اپنی موجودہ شکل میں ۷۰ خاکوں پر مشتمل ہے ۔ ظاہر ہے کہ آغا ابراہیم باقی ۲۰ خاکوں کی توجیہ پیش نہیں کر سکتے ۔

معاملہ بڑا پیچیدہ اور مشکلات سے پُر ہے ۔ اس لیے محض داخلی شہادت سے آخری فیصلہ محال ہے ۔ شاید میر ممتاز علی کے استعمال کردہ مسودے پر ، جو آزاد کے پوتوں کے پاس ہونا چاہیے ، ہم اس قضیے کا کوئی حتمی فیصلہ کر سکیں ۔ مگر اس تک رسائی کا فی الحال کوئی امکان نہیں ۔

زیادہ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ آغا ابراہیم تقریباً بارہ برس تک اس معاملے میں چپ سادھے رہے ۔

اس عقدے کا حل یہ ہے کہ میر ممتاز علی نے جو مسودہ استعمال کیا تھا وہ انھی کے قبضے میں رہا ۔ اس لیے انھوں نے مسودے کی تیاری میں شرکت کا دعویٰ کیا ۔ آغا ابراہیم تردید سے قاصر تھے ۔ لیکن کئی سال بعد جب میر ممتاز علی کو ہائی کورٹ میں کوئی کام پڑا تو انھوں نے آغا ابراہیم کی مدد طلب کی ، جو اس وقت ہائی کورٹ میں ریڈر تھے ۔ تب انھوں نے کسی طرح ان سے مسودہ واپس لے لیا ۔ اور جب یہ ہاتھ آ گیا تو وہ اس دعوے کی ، جو میر صاحب نے اپنے دیباچے میں کر رکھا تھا ، بخوبی تردید کر سکتے تھے ۔ جب آغا ابراہیم نے ۱۹۱۰ع میں "دربار اکبری" کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو دیباچے میں اس دعوے کی تردید کردی ۔ یہ اطلاع مجھے آغا محمد باقر سے ملی ۔

تدوینِ دیوانِ ذوق

ہم نے اس موضوع پر اپنے مضمون "ترتیبِ دیوانِ ذوق" میں مفصّل بحث کی ہے، اس لیے جو قارئین اس پُر لطف موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اسے ہمارے مذکورہ مقالے میں ملاحظہ فرمائیں۔ ہم یہاں صرف اتنا عرض کر دیتے ہیں کہ آزاد نے دیوانِ ذوق میں کوئی دو درجن غزلیات اور قصیدوں پر توضیحی نوٹ لکھے ہیں، جن میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ نظر ثانی کے نور سے فیض یاب نہیں ہوئے۔ ہمارے پاس یہ ثابت کرنے کے لیے ناقابلِ تردید دستاویزی شہادت موجود ہے کہ یا تو آزاد کے پاس ان کے اصلی مسودات ایسی غیر تسلی بخش حالت میں پہنچے کہ ان کا پڑھنا مشکل تھا یا وہ صریحاً مسخ شدہ یا نامکمل تھے۔ بہتر ہوتا کہ وہ ان کو چھوڑ دیتے، لیکن وہ انھیں گوشہ گمنامی سے باہر نکالنے پر کمر بستہ تھے۔ اس لیے انھوں نے ان کی اصلاح و تہذیب کا تہیہ کیا۔ بعض درستیوں، ترمیموں اور اضافے کے لیے بے شک انھوں نے اپنے حافظے پر بھروسا کیا ہوگا لیکن بعض میں یہ وسیلہ بھی ناکام رہا اور انھوں نے اپنی ادارتی ذمہ داری ہی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ فرطِ جوش سے کئی قدم آگے بڑھ کر ان کو از سرِ نو لکھ ڈالا۔ بنابریں ہم اسے کلامِ ذوق تسلیم کرنے سے انکار کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ اس قسم کی از سرِ نو تحریر و تصنیف کے لیے، جسے "ایجاد بندہ" کہنا بے جا نہ ہوگا، ہم قارئین کی توجہ ان دو عکسی نقول کی طرف منعطف کراتے ہیں جو دو غزلوں سے تعلق رکھتی ہیں اور ضمیمے کے آخر میں درج ہیں۔ بعض مقامات پر ترمیمات اس قدر زیادہ نہیں پھر بھی ہیں تو سہی۔ ان غزلوں اور قصائد کی فہرست پیش کی جاتی ہے جن کے مسودات ہماری ملکیت میں ہیں۔ ان سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ گو یہ کلام الحاق نہیں، پھر بھی اس کا کلامِ ذوق ہونا شبہ سے خالی نہیں۔

بعض اشعار کم مشتبہ ہیں بعض زیادہ ۔ ذیل میں ان مسودات کا صاف متن پیش کیا جاتا ہے تاکہ قارئین ان کا آسانی سے مطالعہ فرمائیں :

غزلیات :

۱- آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا
۲- ہر گام پہ رکھے ہے وہ یہ ہوش نقش پا
۳- گزرے گر اس رہ سے وہ رکھ دیدۂ تر زیرپا
۴- دشمنِ جاں اس قدر سارا زمانہ ہوگیا
۵- چشمۂ کوہ سے ہے آب نکلتے دیکھا
۶- صبا سے ہو شگفتہ کس طرح دل گیر دل میرا
۷- اُن سے کچھ ذکر دلا اب نہیں لانا اچھا
۸- ڈھونڈ غربت میں فروغ اپنا تو ہو گھر سے جدا
۹- اشکِ تر لختِ جگر دونوں بہم دونوں جدا
۱۰- لعلِ لب و دندانِ صنم کا جس نے دل میں خیال کیا
۱۱- مجھ کو کیا کیا کچھ قلق اے سنگ دل پیدا ہوا
۱۲- آتشِ غم سے جلا دل جو مری جان مرا
۱۳- دیکھ لو آخری دیدار اگر دیکھتے ہو
۱۴- تم اشکِ سرمہ گوں عارض پہ کیا دکھاتے ہو
۱۵- اس قد کی دلا جو کہے تصویر دکھادو
۱۶- فلک نہ دیتا اگر چشمِ اشک بار مجھے
۱۷- جسے بیمارِ دل ہو اسے کیا یاد رہے
۱۸- قتل کرکے مجھے چل دیجو سنا یاد رہے
۱۹- تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے
۲۰- پری رُو خوش نظر کیا پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے
۲۱- برق کب سے آشیاں میرا اُٹھا کر لے گئی
۲۲- نہ اس حسرت زدہ کے کھینچ اپنا تیر پہلو سے
۲۳- بینی ہے تیری چینِ جبیں سے صنم پرے
۲۴- ذکرِ مژگاں تیرا جس کے رُو برو نکلا کرے

۲۵- خط تری مانگ کا جب یار نظر آتا ہے
۲۶- دکھلا دے خالِ ناف تو اے گل بدن مجھے
۲۷- تیر پہلو میں لگا دلبرِ جانی مانگے

قصائد:

۱- سحر جو گھر میں بشکلِ آئینہ تھا میں بیٹھا نزار و حیراں
۲- صبح سعادت، نورِ ارادت، تن بہ ریاضت، دل بہ تمنا
۳- خضر نصیب کی گر دنیا میں رہبری ہو

غزل نمبر ۱

پہلے مسودے کی نقل:

کیوں میرا سارا زمانہ ہو گیا
میں نے سوچا اور تھا یہ طور کیسا ہو گیا

دوست دشمن ہو گیا اپنا بگانہ ہو گیا
ہائے تاثیرِ غم الفت تجھے کیا ہو گیا
ہائے تاثیرِ محبت یہ غضب کیا ہو گیا

ہم نے تم سے دوستی کی تم ہو کرتے دشمنی
میں نے سوچا اور تھا یہ طور کیسا ہو گیا

جسکو اے ظالم تری مژگاں کا کھٹکا ہو گیا
سوکھ کر ایسا ہوا دبلا کہ کانٹا ہو گیا

جب نشہ اس کو شرابِ لالہ گوں کا ہو گیا
پہلے تھا گل رنگ مکھڑا پھر بھبھوکا ہو گیا
رنگِ روئے آتشیں اور اک بھبھوکا ہو گیا

تجھ میں تھا یا مجھ میں تھا پھر کہو کیا ہو گیا
دل کے جانے کا تو عالم کو ...

یک بیک پہلو سے دل غائب جو میرا ہوگیا
کس طرف دیکھیں کہاں ڈھونڈیں اچنبا ہوگیا

جب اُٹھا
دیکھ کر تابوت تیرے کشتۂ حسرت کا آہ
شور و غل تھا ماتمِ غم
شور و غل اک حسرت و افغاں کا برپا ہوگیا

تو نے جو عزمِ سفر کا ہم کو تھا بھیجا پیام
اپنے منہ سے کیوں نکالا تھا سفر کا تو نے نام
کُوچ لے ، دنیا سے اے ظالم ، ہمارا ہوگیا

خط لکھا مجھ کو تو کیا پورا نہیں ہے نام بھی
نام بھی خط پر لکھا میرا تو آدھا ہی لکھا
کیا کہوں قسمت کا لکھا آج پورا ہوگیا

ایک تو وہ شعلہ ، جب میں نے کہا ہو شعلہ رو
جب کہا میں نے جلایا کیوں مجھے اے شعلہ رو
اس لطیفہ سے بھڑک کر
سنتے ہی اس بات کے وہ آگ دونا ہوگیا

غیر کے گھر ہم سے تو اڑ کر اگر پہنچا تو کیا
کرتا ہے انکار کیوں جانے سے تو گھر غیر کے
تیرے جانے کا تو ہے
اب تو جانے کا ترے عالم میں چرچا ہوگیا

آتے ہیں آتا ہے مونہہ پر
گرم ہو کر آتا ہے مونہہ پر ترے طفلِ سرشک
دیکھ کیا اے چشمِ تر ابتر یہ لڑکا ہوگیا

کر دیا تیغِ نگہ نے تیری اک عالم کا خوں
نام بدنام اے صنم ناحق قضا کا ہوگیا

یادِ زلفِ عنبریں میں رات بھر آہیں بھریں
رات جو یاد آ گئی مجھ کو وہ زلفِ عنبریں
آسماں سارا دھویں سے دل کے کالا ہوگیا
وہ بھریں آہیں کہ سارا چرخ کالا ہوگیا

ذوق نے ہو زلف کو چھیڑا تو لے مجھ سے قسم
تُو نے خود چھیڑا اُسے اور برہم اتنا ہوگیا

اس کے غمزے نے ہے اک عالم کو مارا جان سے
نام بد اے ذوق ناحق ہے قضا کا ہوگیا

اسی غزل کے ایک اور مسودے کی نقل:

دشمن جاں اس قدر سارا زمانہ ہوگیا
ہائے تاثیرِ محبت اب تجھے کیا ہوگیا
دشمن جاں اور بھی وہ تو ہمارا ہوگیا
ہائے تاثیرِ غمِ الفت تجھے کیا ہوگیا

جب نشہ اس کو شرابِ لالہ گوں کا ہوگیا
رنگ رُوئے آتشیں اور اک بھبوکا ہوگیا

یک ایک پہلو سے دل غائب جو میرا ہوگیا
کس طرف دیکھیں کہاں ڈھونڈیں اچنبا ہوگیا

دیکھ کر تابوت تیرے کشتۂ حسرت کا آہ
شور و غُل و احسرتا کا ایک برپا ہوگیا

اپنے منہ سے کیوں نکالا تھا سفر کا تو نے نام
کوچ دنیا ہی سے اے ظالم ہمارا ہوگیا

ہو چکا دنیا میں رہنا آہ اب اپنا دلا
ہو چکا دنیا میں اب رہنا ہمارا ہم دموں
آج گھر میں غیر کے گر ان کا رہنا ہوگیا

وہ نگاہیں تیری قاتل ہیں کہ کشتہ اک جہاں
جس طرف کو آنکھ بھر کر تو نے دیکھا ہو گیا

نام بھی خط پر لکھا میرا تو آدھا ہی لکھا
کیا کہوں قسمت کا لکھا آج پورا ہو گیا

جب کہا میں نے کہ مجھ کو کیوں جلایا شعلہ رُو
سنتے ہی اس بات کو وہ آگ دونا ہو گیا

کرتا ہے انکار کیوں جانے سے تو گھر غیر کے
اب تو جانے کا ترے عالم میں چرچا ہو گیا

جب نشہ اس کو شرابِ لالہ گوں کا ہو گیا
پہلے تھا گل رنگ مکھڑا
روئے رنگِ آتشیں اور اک بھبوکا ہو گیا

تجھ میں تھا یا مجھ میں تھا پھر کہو کیا ہو گیا
یک بیک پہلو سے دل غائب جو میرا ہو گیا

دل کے جانے کا تو عالم کو
کس طرف دیکھیں کہاں ڈھونڈیں اچنبھا ہو گیا

جب اُٹھا
دیکھ کر تابوت تیرے کشتۂ حسرت کا آہ
شور و غل تھا ماتم و غم
شور و غُل اک حسرت و افغاں کا برپا ہو گیا

تو نے جو عزمِ سفر کا ہم کو تھا بھیجا پیام
اپنے منہ سے کیوں نکالا تھا سفر کا تو نے نام
کوچ دنیا ہی سے اے ظالم ہمارا ہو گیا

پھر چلو اے حضرتِ دل ہو چکا ملنا بس اب
ہو چکا دنیا میں اب رہنا ہمارا ہم دمو
آج گھر میں غیر کے پھر
آج گھر میں غیر کے گر ان کا رہنا ہو گیا

تو وہ ہے جس کی طرف جو
مرنا جینا اک جہاں کا ہے نگہ میں تیری آہ
ہیں نگاہیں تیری وہ قاتل کہ کشتہ اک جہاں
تو وہ ہے جس کی طرف جو تو
جس طرف کو آنکھ بھر کر تو نے دیکھا ہو گیا
تو وہ ہے جس کی طرف جو تو

گرم ہو کر آتے ہیں مونہہ پر مرے طفلِ سرشک
دیکھ کیا اے چشمِ تر ابتر یہ لڑکا ہو گیا

زلف تیری شانہ میں اور شانہ سے ہے کشمکش
میں نے گر چھیڑا ذرا تو اور برہم ہو گیا

کشتۂ حسرت کا تیرے جب جنازہ لے چلے
حسرتا وا حسرتا کا شور برپا ہو گیا

جس کو اے ظالم تری مژگاں کا کھٹکا ہو گیا
سوکھ کر اس غم سے وہ آخر کو کانٹا ہو گیا

رات جو یاد آ گئی مجھ کو وہ زلفِ عنبریں
یہ بھریں آہیں دھویں سے چرخ کالا ہو گیا

اس کے غمزے نے ہے اک عالم کو مارا جان سے
ایک عالم کو ترے غمزے نے مارا جان سے
نام بد اے ذوق ناحق ہے قضا کا ہو گیا
اے ستم گر نام بد ناحق قضا کا ہو گیا

اسی غزل کے ایک اور مسودے کی نقل :

کیوں میرا سارا زمانہ ہو گیا
دوست دشمن ہو گیا اپنا بگانہ ہو گیا
میں نے سوچا اور تھا یہ طور کیسا ہو گیا

ہم نے تم سے دوستی کی تم ہو کرتے دوشمنی
ہائے تاثیرِ محبت یہ غضب کیا ہو گیا
ہم نے سوچا اور تھا یہ طور کیسا ہو گیا

جس کو اے ظالم تری مژگاں کا کھٹکا ہو گیا
سوکھ کر ایسا ہوا دبلا کہ کانٹا ہو گیا

دشمن جاں کیوں مرا سارا زمانہ ہو گیا
میں نے سوچا اور تھا یہ طور کیسا ہو گیا

جب نشہ اس کو شرابِ لالہ گوں کا ہو گیا
پہلے تھا گل رنگ مکھڑا پھر بھبوکا ہو گیا

ہائے دل کھویا گیا دل اڑ گیا
گم ہوا یا اڑ گیا پہلو سے دل کیا ہو گیا
تھا یہیں تو تھا گیا کیونکر اچنبا ہو گیا
مجھ میں تھا یا تجھ میں تھا دل پھر بھلا کیا ہو گیا
تھا تو تجھ میں مجھ میں کب تھا پھر کہو کیا ہو گیا
کیا کہوں میں دل کے جانے کا اچنبا ہو گیا
دل کے جانے کا تو عالم کو

دل میں جس کے ہے خلش نوک مژہ کا ہو گیا
دل میں ہے جس کے کسی کی نوکِ مژگاں کا
جس کو اے ظالم تری مژگاں کا کھٹکا ہو گیا
سوکھ کر ایسا ہوا دبلا کہ کانٹا ہو گیا

جب اُٹھا تابوت تیرے کشتۂ حسرت کا آہ
شور و غل تھا ماتم و غم کا کہ برپا ہو گیا

تو نے جو عزمِ سفر کا ہم کو بھیجا تھا پیام
غیر کے گھر سے بھیجا پیام
کوچ ، لے دنیا سے اے ظالم ، ہمارا ہو گیا

پھر چلو اے حضرت دل ہو چکا ملنا بس اب
آج گھر میں غیر کے ہے ان کا رہنا ہو گیا

مرنا جینا اک جہاں کا ہے نگہ میں تیری کیا
تو وہ ہے جس کی طرف جو تو نے دیکھا ہو گیا

خط لکھا مجھ کو تو کیا پورا نہیں ہے نام بھی
دیکھا
خط لکھا مجھ کو تو لکھا نام بھی پورا نہیں
کیا کہوں قسمت کا لکھا آج پورا ہو گیا

ایک تو وہ
ایک تو شعلہ تھا جب میں نے کہا او شعلہ رو
بھڑک
لطیفہ سن کے پھر وہ آگ دونا ہو گیا

خط لکھا مجھ کو تو کیا پورا نہیں ہے نام بھی
نام بھی خط پر لکھا میرا تو آدھا ہی لکھا
کیا کہوں قسمت کا لکھا آج پورا ہو گیا

ایک وہ شعلہ تھا جب میں نے کہا او شعلہ رو
جب کہا میں نے جلایا کیوں مجھے او شعلہ رو
اس لطیفے سے بھڑک کر
سنتے ہی اس بات کو وہ آگ دونا ہو گیا

غیر کے گھر ہم سے تو اڑ کر اگر پہنچا تو کیا
کرتا ہے انکار کیوں جانے سے تو گھر غیر کے
تیرے جانے کا تو ہے
اب تو جانے کا ترے عالم میں چرچا ہو گیا

آتے ہی آتا ہے منہ پر
گرم ہو کر آتا ہے منہ پر ترے طفلِ سرشک
دیکھ کیا اے چشمِ تر اب تر یہ لڑکا ہو گیا

کر دیا تیغِ نگہ نے تیری اک عالم کا خوں
نام بدنام اے صنم ناحق قضا کا ہو گیا

زلف تیری شانے میں اور شانے سے ہے کش مکش
میں جب چھیڑا ذرا تو اور برہم ہو گیا
زلف کو چھیڑا تو لے مجھ سے قسم
تو نے خود چھیڑا اُسے اور برہم اتنا ہو گیا

یادِ زلفِ عنبریں میں رات بھر آہیں بھریں
رات یاد آ گئی مجھ کو وہ زلفِ عنبریں
آسماں سارا دھویں سے دل کے کالا ہو گیا
یہ بھریں آہیں کہ سارا چرخ کالا ہو گیا

اس کے غمزے نے ہے اک عالم کو مارا جان سے
نام بد اے ذوق ناحق ہے قضا کا ہو گیا

گر لیا گھر غیر کے
کیوں مکرتا ہے
غیر کے گھر جا کے تو مجھ سے مکرتا کیا ہے یار
اب تو جانے کا ترے عالم میں چرچا ہو گیا
غیر کے گھر جا کے تو مجھ سے اگر مکرا تو کیا
غیر کے گھر جا کے کب تک میں جو تھا — اب تک
ہم سے تو اُڑ کر
غیر کے گھر جا کے تو ہم سے بچ بچ کے اگر پہنچا تو کیا
تیرے جانے کا ہے اک عالم میں چرچا ہو گیا
تیرے جانے کا تو ہے
تیرے غمزے نے کیا
اس کے غمزے نے کیا اے ذوق اک عالم کا خوں
نام بدنام اے صنم ناحق قضا کا ہو گیا

ذوق نے ہو زلف کو چھیڑا تو لے مجھ سے قسم
چھیڑا مجھ کو تو نے یا میں نے تجھے انصاف کر
تو نے پہلے مجھ کو چھیڑا تھا کہ میں نے
میں نے ہو گر زلف کو چھیڑا تو لے مجھ سے قسم

غزل نمبر ۲

چشمۂ کوہ سے ہے آب نکلتے دیکھا
سخت دل پر ترا کافر نہ پگھلتے دیکھا

دم
ضعف سے سینہ میں اب دل کی یہ حالت ہے کہ یوں
ریگ کو شیشۂ ساعت میں نہ چلتے دیکھا

ہوں وہ اس باغ میں نخلِ گلِ آتش بازی
ہوں میں وہ دہر میں نخلِ گلِ آتش بازی
غیر شعلہ نہ جسے پھولتے پھلتے دیکھا

زلفِ شب رنگ ترے رخ پہ چھپا دیکھ کے ماہ
ہے تری جنبش کاکل سے فرو شورشِ دل
آگے کالے کے دیا سچ ہے نہ جلتے دیکھا

جو بلندی پہ چڑھا ہے وہ گرا ہے آخر
پاؤں دیوار سے سائے کا پھسلتے دیکھا

کیوں نہ وہ زلف
زلف وہ کیوں نہ دُرِ گوش پہ لہرائے سدا
کہ سرِ بیضہ سے ناگن کو نہ ٹلتے دیکھا

حکمِ انعام ہوا یا کوئی دشنام عطا
نہیں معلوم مگر ہونٹ ہے ہلتے دیکھا

جا چھپا شرم سے ظلمات میں جو آبِ حیات
تجھ کو ہونٹوں پہ مسی کیا کہیں ملتے دیکھا
تجھ کو دانتوں پہ مسی کو کہیں ملتے دیکھا

کج ادائی کا سبب ابروے جاناں کی نہ پوچھ
شاخِ آہو سے دلا خم کو نکلتے دیکھا

کودکِ اشک تجھے چشم میں دیکھا نہ قرار
کودکِ اشک نے پر چشم میں پایا نہ قرار
ورنہ گہوارے میں لڑکے کو بہلتے دیکھا
لڑکوں کو

اسی غزل کے ایک اور مسودے کی نقل :

کوہ کے چشموں سے پانی ہے
چشمۂ کوہ سے ہے آب نکلتے دیکھا
ترے دل کو مرے غم سے
سخت دل پر ترا کافر نہ پگھلتے دیکھا

آتا ہے مرا دم جس طرح
ضعف سے سینے میں اب دم کا یہ عالم ہے کہ یوں
ریگ کو شیشۂ ساعت میں نہ چلتے دیکھا

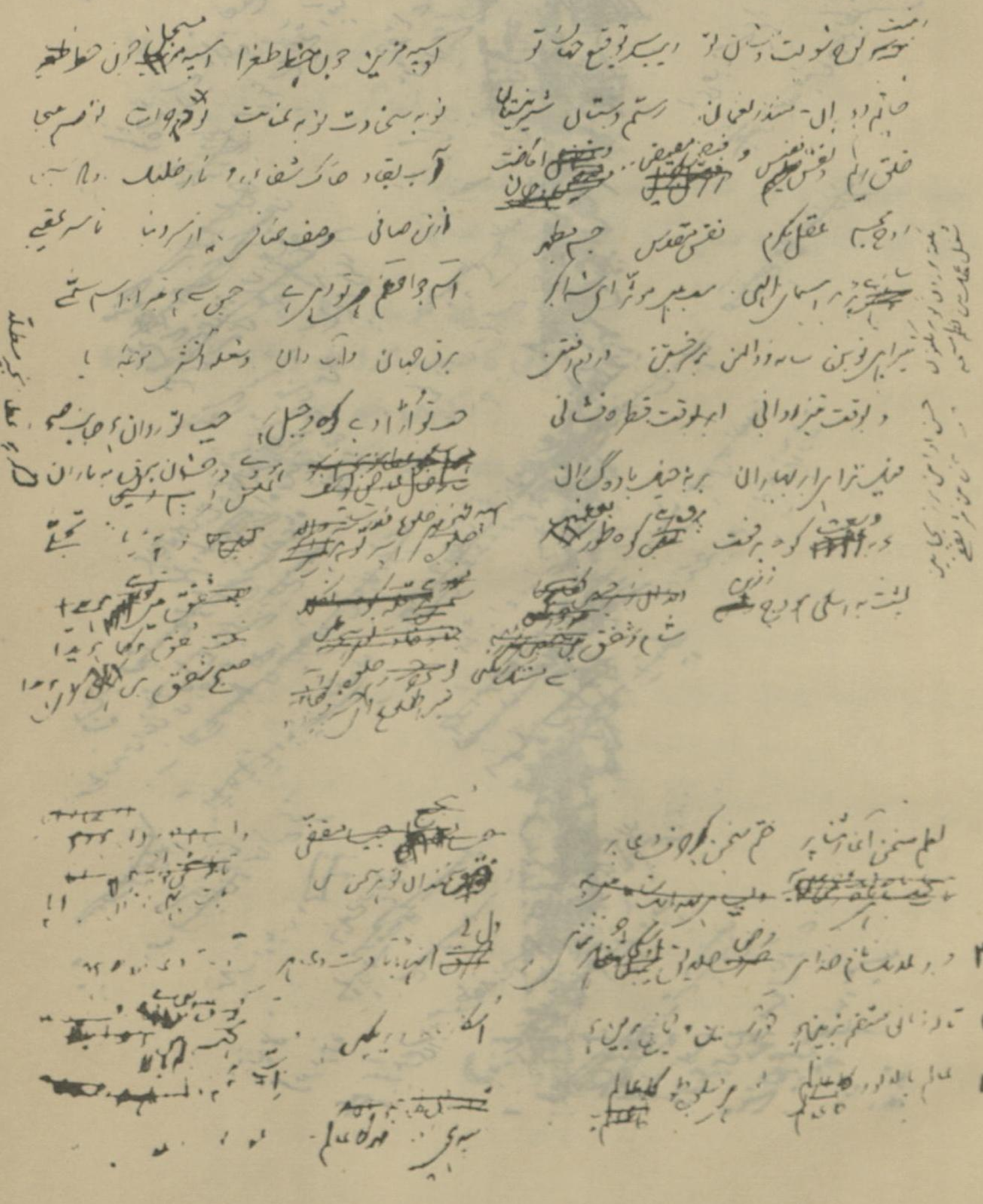
میں
ہوں وہ اس باغ میں نخلِ گلِ آتش بازی
پھولتے دیکھا اسے آہ
غیر شعلہ نہ جسے پھولتے پھلتے دیکھا

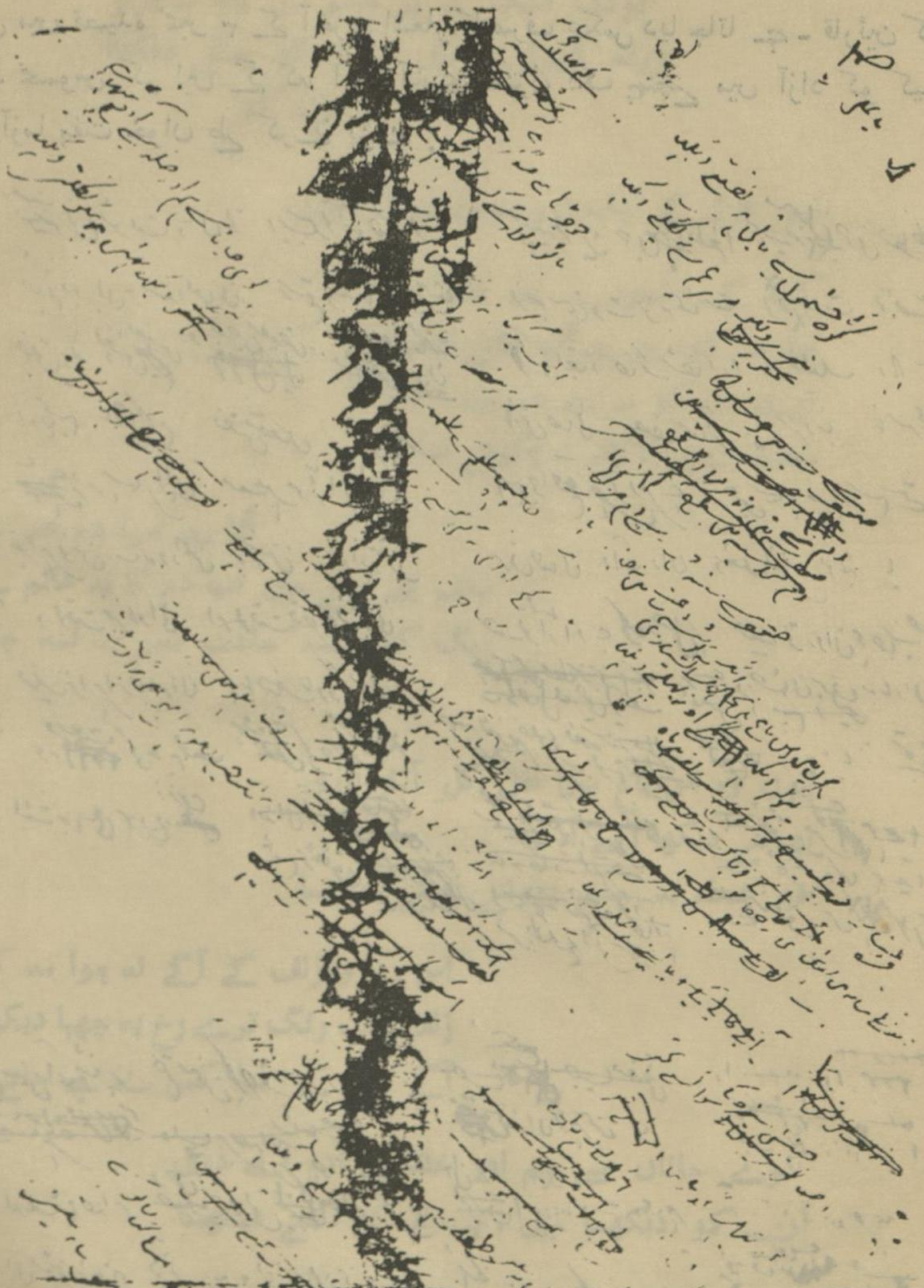
اس رخ و زلف کے آگے نہ ہوا مہ کو فروغ
زلفِ شب رنگ ترے رخ پہ چھپا دیکھ کے ماہ
آگے کالے کے دیا کس نے ہے جلتے دیکھا

کوئے جاناں سے ہم اور خلد سے آدم اے ذوق
اُن کو دیکھا نہیں ، پر تم کو نکلتے دیکھا

جنبشِ سبزہ کے سوا کس نے تجھے
اے صبا کس کو بجز جنبشِ سبزہ تو نے
مورچھل گورِ غریباں پہ ہے جھلتے دیکھا

ذیل میں قصیدہ نمبر ۳ کے آخری اشعار کا صرف عکس دیا جاتا ہے۔ قارئین کرام خود محسوس کر لیں گے کہ اپنی آخری منزل تک پہنچنے میں آزاد کو کیسے صبر آزما ہفت خواں طے کرنے پڑے:





جو چڑھا ہے وہ گرا ہے کہ یہاں جوں سایہ
جو بلندی پہ چڑھا ہے وہ گرا ہے آخر
کس نہ
پاؤں دیوار سے سائے کا پھسلتے دیکھا

زلف کیوں کر نہ
کیوں نہ وہ زلف درگوش پہ لہرائے سدا
کہ سر بیضہ سے ناگن کو نہ ٹلتے دیکھا

جا چھپا شرم سے ظلمات میں جو آب بقا
تجھ کو دانتوں پہ مسی کیا کبھی ملتے دیکھا

نہ گئی ہم سے ترے ابرو کی
کج ادائی کا سبب ابروے جاناں کا نہ پوچھ
کبھی خم ہے
شاخ آہو سے خم نکلتے دیکھا

———

دور جنوں

آزاد کی دیوانگی کے اسباب کا سلسلہ جنگ آزادی کے زمانے تک پہنچتا ہے۔ مولوی خلیل الرحمٰن لکھتے ہیں :

''ایام غدر کے مصائب کا طبیعت پر بہت ہی زیادہ اثر تھا۔ نہ پوچھیے۔ میں نے صبح کی ہوا خوری یا شام کی فرصت میں بارہا چھیڑا اور انجام آنسوؤں پر ہوا۔''

غدر کے بعد زندگی ایک بار پھر مسکرائی۔ اس کے باوجود کئی اور چرکے بھی تھے جو دل میں گہرے گھاؤ ڈالیں اور ان کی حزن پسندی کو اور گہرا کر دیں۔ آزاد کے پندرہ سولہ اولادیں ہوئیں جو بچپن یا عالم طفلی ہی میں داغ مفارقت دے گئیں۔ ۱۸۷۷ع میں ان کے مکان بنگلہ ایوب شاہ کو آگ لگ گئی جس میں ان کی بوڑھی پھوپھی، جس نے انھیں بچپن ہی سے پالا تھا، جل کر خاک ہو گئی۔ اس ناگہانی موت کے سانحۂ جاں کاہ سے انھیں شدید قلق ہوا۔

اس سے بھی زیادہ خوں چکاں سانحہ ان کی صاحب زادی امۃ السکینہ کی وفات تھی جس کا انھوں نے اپنے روزنامچے میں بہت حسرت سے ذکر کیا ہے۔ مولوی خلیل الرحمٰن لکھتے ہیں : ''وہ میرے قیام لاہور سے کچھ عرصہ پہلے انتقال کر گئی تھیں۔ لیکن اس کا نام آتے ہی ماں باپ آب دیدہ ہو جاتے تھے۔'' آزاد اس کی وفات کے بعد پوری طرح دیوانے نہیں ہوئے تو دیوانگی کے قریب ضرور تھے۔ اس سانحے سے ان کے قدم بری طرح لڑکھڑا گئے اور انھوں نے بڑی ہمت کرکے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن انجام کچھ زیادہ دور نہ تھا۔

آزاد کی صحت ان دنوں برابر بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ یہ بات ان کی فقرا اور

درویشوں سے بڑھتی ہوئی دل چسپی سے ظاہر ہے۔ وہ پہلے ایسے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ بڑھاپے میں فقرا سے دل چسپی قوائے فکر کے انحطاط کی علامت تھی۔

آزاد کو ایک مجذوب دھیان شاہ سے بہت عقیدت تھی جو خود کو لکھنؤ کے شاہی خاندان کا فرد قرار دیتا تھا اور نواں کوٹ لاہور میں میاں سلطان کی سرائے میں رہتا تھا۔ مولوی خلیل الرحمٰن لکھتے ہیں :

''قریباً روزانہ ان کے پاس جاتے تھے۔ آغا کو اور مجھے بھی تاکید کرتے رہتے تھے۔ دو تین مرتبہ مجھے بھی ساتھ لے گئے تھے۔''

مگر بالائے ایں ہمہ جو بات واقعی جلد تر دیوانگی طاری کرنے کا باعث ہوئی وہ ''دیوانِ ذوق'' پر شبانہ روز محنتِ شاقہ تھی۔ مولوی خلیل الرحمٰن لکھتے ہیں :

''اس پر قیامت یہ ہوئی کہ دیوانِ ذوق کی ترتیب شروع کر دی۔ اس میں دن رات کا انہماک و استغراق رہا۔ راتوں اسی آدھیڑ بن میں لگے رہتے۔ استاد کی غزلیں پوری کرتے۔ گرمیوں میں اس پر محنت زیادہ ہوئی۔ نیند میں کمی آ گئی۔ دیوان تو جوں توں کرکے چھپ گیا مگر مراق کی کیفیت پیدا ہو گئی۔''

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

''سخت گرمی، جون کا مہینہ۔ دیوانِ ذوق کی ترتیب میں دن رات کی بلا مبالغہ مصروفیت۔ کتب خانے گیا تو ہر طرف سے دروازے بند۔ دستک دے کر دروازہ کھلوایا اور فوراً بند کر دیا گیا۔ اندر اندھیرا گھپ۔ منّت سماجت کرکے دروازہ کھلوایا۔ دیکھا کہ دیوان متذکرہ بالا کے پانچ چھ (یا زیادہ ٹھیک یاد نہیں رہا کہ کتنے) مختلف الٹ پھیر کے ساتھ مسوّدے سامنے میز پر پڑے ہوئے ہیں۔''

اس زمانے میں، جیسا کہ مولوی خلیل الرحمٰن نے بیان کیا ہے، آزاد بے حد 'تنک مزاج ہو گئے تھے۔ من جملہ دیگر حکایات کے وہ مندرجہ ذیل لطیفہ بھی بیان کرتے ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ آزاد کس قدر چڑچڑے ہو گئے :

ایک مرتبہ میں اور مولوی ممتاز علی مرحوم ملنے گئے۔ ان دنوں وہ

امام باڑے میں رہتے تھے - میں مولانا سے ڈرنے لگا تھا کیوں کہ سخت سُست کہہ بیٹھتے تھے - اب ایک لطیفہ یہ ہوا کہ صحن میں دو چارپائیاں بچھی تھیں - ایک پر آزاد بیٹھے تھے - مولوی صاحب از راہِ ادب پائنتی بیٹھ گئے - میں بھی دوسری خالی چارپائی پر پائنتی بیٹھا - مجھ سے مولانا نے کہا کہ ''میاں! کس لیے وہاں بیٹھے ہو، سرہانے ہو بیٹھو -'' میں نے فوراً تعمیل کی - مولوی صاحب سے بھی انھوں نے دو تین مرتبہ کہا کہ ''آگے کو ہو بیٹھو -'' انھوں نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ ''اچھا بیٹھا ہوں -'' آخر مولانا کو غصہ آ گیا - وہ کہنے لگے کہ بے وقوف، گدھا، احمق میری ادوائن ٹوٹی جا رہی ہے، یہ کہتا ہے اچھا بیٹھا ہوں - مولوی صاحب جھٹ اوپر ہو بیٹھے مگر بہت شرمندہ - یہ لطیفہ تو ہو چکا - اسی وقت چوڑھی آئی اور وہ جھاڑو دینے لگی - اس سے بڑی گرد اڑی - اب کیا تھا، آزاد چیخ اٹھے اور بہ آوازِ بلند فرمانے لگے ''ابرو کی ماں! کتنی دفعہ تم سے کہا کہ چوڑھی کے آنے سے پہلے چھڑکاؤ کرا دیا کرو -'' انھوں نے کہا ''ابھی بہشتی نہیں آیا - چوڑھی سے کہہ دو کہ جھاڑو نہ دے -'' اس کا جواب مولانا نے دیا ''بہشتی نہیں آیا تھا تو تم ہی نے ذرا کھڑے ہو کر مُوت دیا ہوتا کہ گرد تو بیٹھ جاتی -'' آغا صاحب کی والدہ ماجدہ پر جو اثر ہوا ہو اس کا اندازہ آپ کر لیجیے - انھوں نے پان دینے کے لیے مجھے بلایا تو وہ آنسوؤں سے رو رہی تھیں - مجھ سے صرف اتنا کہا ''بوڑھے ہو کر ان کی عقل بالکل خراب ہو گئی - جو کچھ منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں - میرا سفید چونڈا رہا کہ گیا -'' غرض جب ہم وہاں سے اٹھے تو گھر پہنچنے تک ہم دونوں کے درمیان یہی تذکرہ رہا - میرے منہ سے نکلا کہ ''کہیں پھر تو یہ پاگل نہ ہو جائیں گے -'' مولوی ممتاز علی نے فرمایا کہ ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو -''

غالباً وہ ڈرتے تھے کہ کہیں یہ شگون بد نہ ثابت ہو اور آزاد سچ مچ دیوانہ بن جائیں -

اسی زمانے میں گھر والوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ عارضۂ وہم

میں مبتلا ہیں ۔ آزاد خیالی چیزوں سے باتیں کرتے رہتے اور مُردوں کی ارواح سے مخاطب ہوتے ۔ اتفاقاً ان کے صاحب زادے ان دنوں روحوں کو بلانے اور ان سے بات چیت کرنے کا آلہ بلینیجٹ خرید لائے اور والد سے کہا کہ وہ اس کو آزمائیں ۔ اس سے دیوانگی کی علامات اور بھی نمایاں ہوگئیں اور انھیں اس کے سوا اور کوئی کام نہ رہا کہ ارواح کو بلائیں اور ان سے باتیں کریں ۔

اب ان کے اہلِ خانہ کے شبہات اور بھی قوی ہوگئے اور انھوں نے حکیم بزرگ شاہ کا علاج کروانا شروع کیا ۔ اس نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن آزاد کو دوا پینے سے وحشت تھی ۔ اور جو لوگ انھیں دوا پلانے کی کوشش کرتے وہ انھیں سخت سست کہتے ۔ نیند حرام ہوگئی اور وہ دن بدن زیادہ نڈھال ہوتے گئے ۔

آخر طے پایا کہ ڈاکٹر سے علاج کرایا جائے ۔ اس کی تشخیص بھی وہی تھی — بے خوابی ۔ چونکہ آزاد دوا نہیں پیتے تھے اس لیے مولوی خلیل الرحمٰن نے تجویز کیا کہ دوا دہی میں ملا کر دی جائے کیونکہ وہ دہی کے بڑے شوقین تھے ۔ لیکن یہ داؤ بھی ناکام رہا ۔ انھیں شک پڑگیا اور دہی کھانا بھی چھوڑ دیا ۔

بے خوابی کی شکایت بڑھتی چلی گئی ۔ چلتے پھرتے شعر پڑھتے ، شاعروں کو بلاتے ، خیالی آوازیں سنتے اور موہوم ہستیوں سے بات چیت کرتے رہتے ۔

اب ان کی دیوانگی میں کوئی شک باقی نہیں رہا تھا ۔ ان کے ایک دوست حافظ کریم بخش کے مشورے پر ، جو کسی کام کے سلسلے میں لاہور آئے تھے ، انھیں دہلی لے جا کر حکیم محمود خاں اور پھر حکیم عبدالمجید کا علاج شروع کیا گیا مگر تکلیف بڑھتی چلی گئی ۔ جب علاج سے مایوس ہوگئے تو ان کے صاحب زادے انھیں پھر لاہور لے آئے ۔ اب اکبری منڈی میں ان کی حویلی بن چکی تھی ۔ اسی حویلی میں رہائش اختیار کی گئی اور وہ ۱۹۱۰ء تک تا دمِ حیات اسی میں متمکن رہے ۔

آزاد تقریباً ڈیڑھ سال دہلی میں رہے ۔ ان کا زیادہ تر وقت مولوی ذکاء اللہ کے ہاں گزرا ، جہاں ان کی بڑی احتیاط اور خلوص سے دیکھ بھال کی گئی ۔ مگر آزاد جنوں کے عالم میں انھیں اپنا بدترین دشمن خیال کرتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ ذکاء اللہ نے انھیں اپنے گھر والوں سے جدا کر رکھا ہے اور ان پر بڑی سختی برتتا ہے ۔

آزاد کی دیوانگی پر گفتگو کرتے ہوئے مولوی خلیل الرحمٰن لکھتے ہیں :

”دیوانگی عجیب تھی ۔ پانچ دس منٹ ، بعض اوقات آدھا پونا گھنٹا ، بہت اچھی طرح باتیں کر رہے ہیں ۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ پر کوئی اثر نہیں ، حافظہ اور دل اچھا ہے ۔ اور یکایک دیوانگی شروع ہو گئی ۔ لوگ دھوکے میں رہ جاتے تھے اور حیران ہوتے تھے ۔ یہی زمانہ تھا کہ ''دربارِ اکبری'' کا مسوّدہ نکالا گیا ۔ ایک روز ایک خاص کام کے لیے میں مولانا کے پاس گیا ۔ آغا ڈیوڑھی میں رہے ۔ مجھے دیکھتے ہی چور چور کا شور مچایا اور مسودے کی چوری لگائی ۔ میں واپس ہوا تو میرے پیچھے پیچھے مولانا ! آغا کہیں چھپ رہے ۔ مولانا پولیس کی تلاش میں رہے ، میں بھاگ آیا ۔ تیسرے چوتھے روز اسی حیثیت سے پھر گیا ۔ آغا پیچھے رہے ۔ مجھے دیکھ کر بہت اخلاق سے پیش آئے ۔ بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے اور اچھی طرح ہوش میں ۔ کچھ بگڑنے لگے تھے کہ ایک بڑھیا آئی ۔ مولانا نے پوچھا ”مائی کیا کہتی ہے ؟'' اس نے کہا ”تھوڑی جئی مستی چاہی دی اے ، اوہ صبون والا کدر گیا ؟“ (ڈیوڑھی میں ایک شخص صابن بنایا کرتا تھا ، اور مستی اس چیز کو کہتے ہیں جو صابن کے اوپر آ جاتی ہے) ۔ مولانا از راہِ شفقت اٹھ کر بڑھیا کے پاس پہنچے اور کہنے لگے : ''مائی ، اب تو ہم بوڑھے ہو گئے ۔ اب مستی کہاں !'' وہ غریب شرمندہ ہو کر چلی گئی اور میں موقع پا کر بھاگ آیا ۔

ایک اور واقعہ سن لیجیے ۔ مولوی صاحب کی صبح کی ہوا خوری اس حالت میں بھی ختم نہیں ہوئی ۔ ایک روز میں دفتر کو جا رہا تھا ۔ ہائی کورٹ کے سامنے جو نلکا سڑک پر ہے ، وہاں دور سے مولانا نظر آئے ۔ میں سخت پریشان ہوا کہ برسوں سے نہیں ملا ہوں ۔ دیکھیے کیسی بنتی ہے ۔ مولانا نے بھی مجھے دیکھ لیا ۔ کھڑے ہو گئے ۔ مجھ سے کہنے لگے کہ تم بہت عرصے سے نہیں ملے ۔ کہیں باہر گئے تھے کہ یہیں ہو ؟ میں نے عذر کیا ۔ کچھ اور باتیں بالکل ہوش کی کرتے رہے ۔ میرے ایک ایک لڑکے کی نام بنام خیریت پوچھی ۔ پڑھنے لکھنے کو پوچھا ۔ میں

نے کہا فلاں فلاں نے ایم - اے کیا ہے - ایک بی - اے میں ہے وغیرہ - سن کر بہت خوش ہوئے، بہت مبارک باد دی - عربی پڑھوانے پر زور دیا - تقریباً آدھ گھنٹہ گرفتار رہا - مجھے دفتر کی جلدی - شامت جو آئی تو پوچھ بیٹھا کہ ''آپ کی بہت دن سے زیارت نہیں ہوئی -'' بس پھر کیا تھا - کہنے لگے ''تو ایسا بے ایمان پاجی ہے - تو نے میری کب خبر لی - میرے اوپر کیا کیا بن گیا، تو نے کروٹ نہیں لی - پاجی پوچھتا ہے 'بہت دن سے زیارت نہیں ہوئی -' ارے تجھے خبر بھی ہے، میرے ساتھ کیا دغا ہوئی -'' میں نے پوچھا ''خیریت ؟'' کہنے لگے ''میرے ساتھ ذکاء اللہ نے پھر دغا کی - اس کی ماں کی ... اس کی بہن کی ... میں ایک روز ہوا خوری میں دہلی پہنچ گیا - ذکاء اللہ نے بڑی خاطر سے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے مکان میں ٹھیرایا - مجھے کیا معلوم کہ اس کے دل میں کیا دغا ہے - اس کے مکان کے قریب ایک برات آ کر ٹھیری - مجھ سے کہنے لگا کہ آزاد ! تو بھی برات دیکھ آ - میں گیا، برات والوں نے مجھے دیکھا تو شور مچایا کہ آزاد آیا، آزاد آیا - مجھے بڑی خاطر سے دولھا کے برابر بٹھا دیا - مجھے کیا خبر کہ ذکاء اللہ نے، اس کی ... کیا فریب کیا ہے - اب جو نکاح بندھنے لگا تو نکاح اور مہر کے ساتھ مجھے بھی باندھا دیا اور ایسا جکڑا کہ رسّوں کے بندھنوں سے اب تک میرے بدن میں درد ہو رہا ہے - جس طرح ہو سکا، میں رسّوں کو توڑ کر ابھی چلا آ رہا ہوں -'' کچھ نہ پوچھیے کہ مجھے کتنی ہنسی آئی - یقین کیجیے کہ ریل کے دفتر تک میں ہنستا ہی چلا گیا - بار بار خیال آتا تھا کہ دیکھنے والے کیا کہتے ہوں گے -''

خوش قسمتی سے ہمارے پاس آزاد کے آخری ایام کی ایک تصویر ان کے شاگرد سید ناصر نذیر فراق دہلوی کے قلم سے بھی موجود ہے - وہ لکھتے ہیں :

استاد امام باڑہ کے برآمدے میں بیٹھے تھے اور جس ہیئت سے بیٹھے تھے اسے دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آ گیا - ایک میلی سی اچکن گلے میں تھی جس کی چولی میں پورے بٹن بھی نہ تھے - ایسا ہی میلا کچیلا

ڈبل زین کا پیجامہ تھا - سر پر مغلئی وضع کی چکٹ ٹوپی اور پاؤں میں بہت ہی بوسیدہ جوتی تھی - ایک بورے پر بیٹھے تھے - ایک مٹی کی رکابی میں شوربا تھا اور ایک چنگیر میں چپاتیاں تھیں - چپاتی کا نوالہ بنا کر شوربے میں ڈبوتے تھے اور اسے منہ میں رکھ لیتے تھے اور دیر تک چبا کر مشکل سے نگل جاتے تھے - بورے کے ادھر آدھر کچھ راکھ ، کچھ کوئلے اور کچھ کوڑا پڑا تھا - یہ وہی منظر ہے جو حضرت نے "آب حیات" میں سید انشاء اللہ خان کے آخری دور کا لکھا تھا - مجھے دیکھ کر فرمایا "تم کون ہو ؟" میں نے کہا "حضرت میرا نام ناصر نذیر فراق ہے - دہلی سے محض آپ کی زیارت کے واسطے لاہور آیا ہوں -" فرمایا "بھئی میں تمھیں نہیں پہچانتا -" میں نے پھر عرض کیا "میں آپ کا شاگرد ہوں -" کہا "ہو گے -" پھر فرمایا "اچھا اگر تم میرے شاگرد ہو تو گرما گرم جلیبیاں تو لے آؤ -" میں نے اسے بڑی سعادت سمجھا - دوڑا دوڑا گیا - گرم جلیبیاں تو نہ ملیں ، ٹھنڈی لایا اور لا کر سامنے رکھ دیں - ایک جلیبی ہاتھ میں اٹھائی اور فرمایا "بھلا میرے ہلتے ہوئے دانتوں سے ٹھنڈی جلیبیاں کب کھائی جائیں گی - اچھا اٹھا لو -" میں نے اصرار کیا تو بگڑنے لگے - آغا یوسف مرحوم نے کہا "زیادہ نہ کہیے ، نہیں برا بھلا کہنے لگیں گے -" پھر کہا "اچھا جاؤ یہاں سے -" میں اور آغا محمد یوسف مرحوم امام باڑہ میں صدر دروازے میں آ کر ایک تخت پر بیٹھ گئے - آغا محمد یوسف مرحوم خاص دان میں پان میرے لیے لائے - میں نے کہا "آغا صاحب ! مجھے مولانا کو اس زدہ حال میں دیکھ کر سخت افسوس ہو رہا ہے -" آغا محمد یوسف نے فرمایا "حضرت گور کا عذاب مردہ ہی خوب جانتا ہے - اگر دسترخوان میں روٹی لائی جاتی ہے تو دسترخوان جلا دیتے ہیں - چینی کی رکابیوں میں دال سالن دیا جاتا ہے ، انہیں توڑ کر پھینک دیتے ہیں - تانبے کی رکابیاں غوریاں دیجیے تو بازار میں جا کر بیچ آتے ہیں ، یا کسی راہ چلتے کو دے دیتے ہیں - سینکڑوں برتن غارت ہو چکے ہیں - اچھے اور ستھرے کپڑوں سے بیر ہے - ادھر پہنائے آدھر پھاڑے ، جھینجھوڑے لگائے پھینک دے -" اس عذر کو سن

کر میں نے آغا یوسف صاحب سے معافی مانگی ۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ خلال کرتے ہوئے امام باڑے میں سے چلے آتے ہیں ۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا ''ہیں بھئی ، تم کب دہلی سے آئے ۔ واللہ میں نے تمھیں اس وقت نہیں پہچانا تھا۔" یہ کہہ کر تخت کے تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ گئے اور مسکرانے لگے ۔ میں نے کہا ''آپ نے مجھے پہچان لیا ؟" فرمایا "ہاں میاں ، تمھارا نام سید ناصر نذیر ہے ۔'' اس بات کو سن کر میں نہایت خوش ہوا اور آغا یوسف بھی حیران ہو گئے ۔ میں نے حضرت کے مزاج کو راہ پر دیکھ کر کہا "میں نے ایک تازہ سلام کہا ہے ۔ وہ سنانا چاہتا ہوں'' فرمایا ''پڑھو ۔'' میں نے سلام پڑھنا شروع کیا ۔ جو شعر پسند آتا تھا ، اس پر خوش ہو کر فرماتے تھے ''یہ خوب کہا ہے" اور جو پسند نہ آتا تو فرماتے "یہ کچھ نہیں ۔" جب میں نے سلام کا مقطع پڑھ دیا تو فرمایا ''تمھارا سلام تو بہت ہی اچھا ہے ۔ مگر کہیں کہیں جو میں نے کہہ دیا کہ یہ کچھ نہیں ، یہ شعر کی بندش کے لحاظ سے کہا ہے ۔" میں نے کہا "درست ہے" دیر تک باتیں کرتے رہے ، مگر کبھی کبھی بے ڈھنگے پن کی بھی لے جاتے تھے ۔ پھر ایک دفعہ ہی اٹھ کر بازار کی طرف چلے گئے اور میں آغا یوسف سے باتیں کرتا رہا ۔ اس کے بعد پھر زندگی میں مولانا کو دیکھنا نصیب نہ ہوا ۔

اشاریہ

مجلسِ ترقیٔ ادب کی چند علمی مطبوعات

۱- تعلیم و تہذیب : از پروفیسر حمید احمد خان - - - - - ۲۰/-

۲- تاریخِ ادبِ اُردو : جلد اول (آغاز سے ۱۸۵۰ء تک)
از ڈاکٹر جمیل جالبی - - - - - - - - - - - - ۴۰/-

۳- پاکستان میں فارسی ادب : از ڈاکٹر ظہور الدین احمد - - ۳۲/-

۴- اُردوے قدیم — دکن اور پنجاب میں : از ڈاکٹر محمد باقر - ۱۵/-

۵- اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری :
از ڈاکٹر فرمان فتح پوری - - - - - - - - - - - ۲۸/-

۶- مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (جلد اول تا چہارم) - - فی جلد ۱۲/-

۷- مقالاتِ حافظ محمود شیرانی : (جلد پنجم) - - - - - - ۲۴/-

۸- مقالاتِ حافظ محمود شیرانی : (جلد ششم) - - - - - - ۱۵/-

۹- تاریخ ایران : (جلد اول و دوم)
از پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی - - - - - فی جلد ۲۵/-

۱۰- مولوی نذیر احمد دہلوی — احوال و آثار :
از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی - - - - - - - - - ۲۵/-

۱۱- ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر : از ڈاکٹر محمد اسلم قریشی ۲۰/-

۱۲- مقالاتِ مولوی محمد شفیع : (جلد اول) - - - - - - ۱۵/-

۱۳- مقالاتِ مولوی محمد شفیع : (جلد دوم) - - - - - - ۲۰/-

۱۴- مقالاتِ مولوی محمد شفیع : (جلد سوم) - - - - - - ۳۵/-

۱۵- مقالاتِ مولوی محمد شفیع : (جلد چہارم) - - - - - - ۸/-

مجلسِ ترقیٔ ادب ، کلب روڈ ، لاہور

زرین آرٹ پریس ، لاہور